The Book really reveals the worst bright information which the author possesses, but, alas! the Love of Motherland has some times swayed him off the shore of reality.

اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ
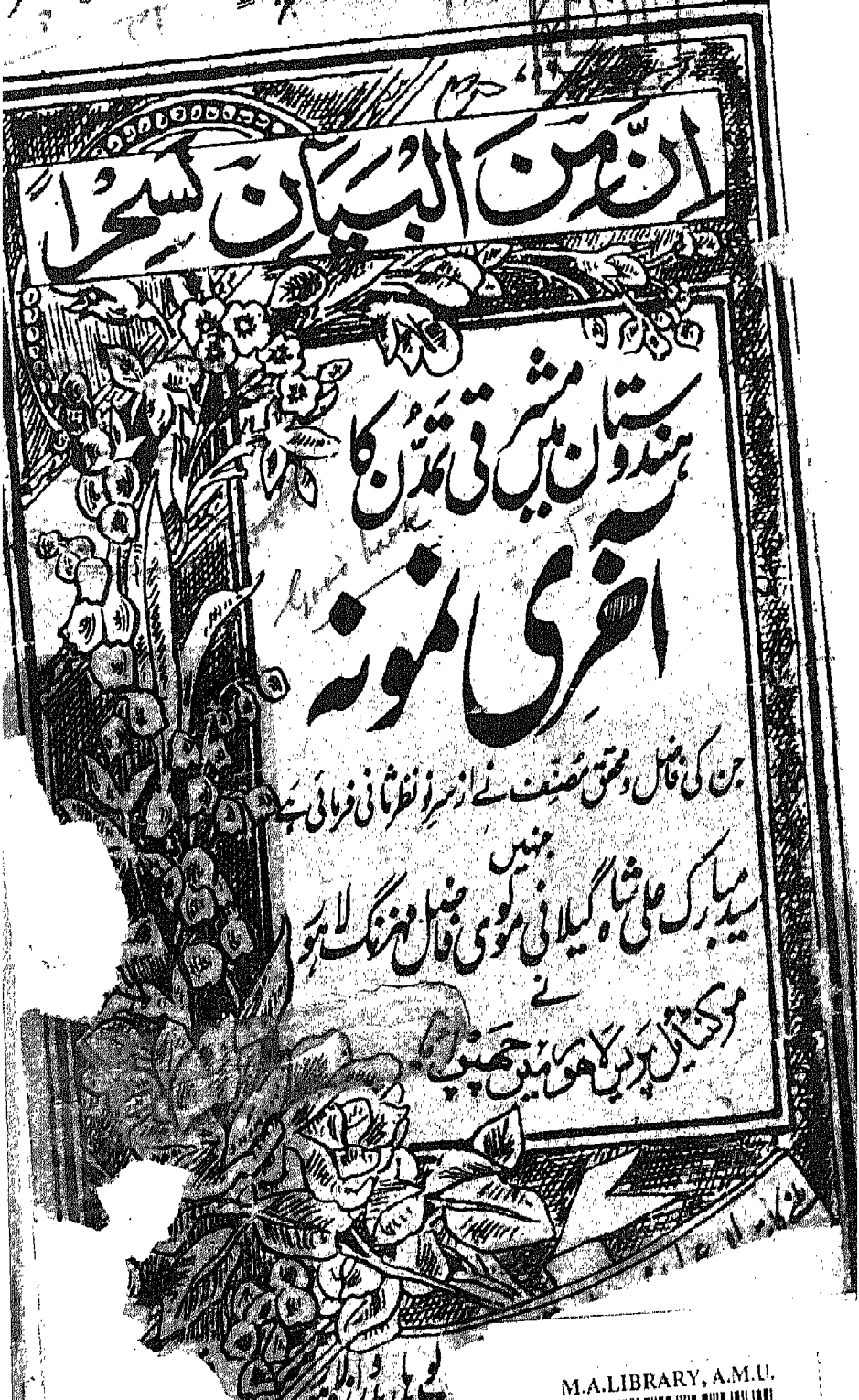
جس کی فاضل و محقق مصنف نے از سرِ نو نظرِ ثانی فرمائی ہے

جنہیں

سید مبارک علی شاہ گیلانی کو مولوی فاضل فرہنگ لاہور

نے

مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوایا

نامور مصنفین کی مقبول تصنیفات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندوستان مین مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

یعنی گذشتہ لکھنؤ

(۱)

اس کے تسلیم کرنے مین شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ ہندوستان مین مشرقی تہذیب و تمدن کا جو آخری نمونہ نظر آیا وہ گذشتہ دربار اودھ تھا۔ اگلے دور کی یادگار اور بھی کئی دربار موجود ہین مگر جس دربار پر پرانی تہذیب اور اگلی معاشرت کا خاتمہ ہوگیا وہ یہی دربار تھا۔ جو بہت ہی آخر مین قائم ہوا اور عجیب و غریب ترقیان دکھا کے بہت ہی جلد فنا ہوگیا۔ لہذا مندرجۂ بالا عنوان کے تحت مین ہم اس مرحوم دربار کے مختصر حالات اور اُس کی خصوصیتون کو بیان کرنا چاہتے ہین۔

اسکے تسلیم کرنے مین بھی شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ جس خطۂ زمین پر یہ پچھلا دربار قائم ہوا اُس کی وقعت اور اہمیت ہندوستان کے تمام صوبون سے بڑھی ہوئی ہے۔ پُرانے چندربنسی خاندان خصوصاً راجہ رامچندر جی کے اعلیٰ کارنامے اور عدیم النظیر ناموریان اس درجۂ کمال کو پہونچی ہوئی ہین کہ تاریخ کے ظرف کو تنگ اور محدود دیکھ کے اُنھون نے مذہبی تقدس کا جامہ پہن لیا ہے۔ اور آج ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب گاؤن ہوگا جہان اُنکی یاد ہر سال رام لیلا کے مذہبی ناٹک کے ذریعے سے تازہ نہ کرلی جاتی ہو۔ لیکن اودھ کے اُس قدیم ترین دیوتائی دربار کے حالات اور اجودھیا کا اُس عہد کا جاہ و جلال والمیکی نے ایسی معجزنما فصاحت کے ساتھ دکھایا کہ وہ ہر عقیدت کیش کی لوح دل پر لکھ گیا۔ لہذا ہمین اُسکے اعادے کی ضرورت نہین۔ جن لوگون نے اجودھیا کے پرشکوہ زمانے کی تصویر والمیکی کے لٹریری مرقع مین دیکھی ہے وہ اُسی مبارک خطے پر آج دلگداز مین فیض آباد کی تصویر دیکھین لہذا ہم سلسلۂ واقعات کو اُسوقت سے شروع کرتے ہین جب اس آخری دربار کی بنیاد پڑی جسے فنا ہوے کچھ اوپر پچاس سال سے زیادہ زمانہ نہین ہوا۔

جب نواب برہان الملک امین الدین خان نیشاپوری شہنشاہی دربار دہلی

کی طرف سے صوبہ دار اودھ مقرر ہو کے آئے تو شیخزادگان لکھنؤ کو مغلوب کر کے قدیم مستقر اودھ یعنی محترم و مقدس شہر اجودھیا میں پہونچے۔ اور آبادی سے فاصلے پر یعنی دریاے گھاگرا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ چونکہ انتظام صوبہ کی محویت میں اُنھیں عالیشان عمارت بنانے کی فرصت نہ تھی اور نہ اپنی سادہ مزاجی کی وجہ سے ایسے نمایشی کرّو فر کا اُنھیں شوق تھا۔ اس لیے ایک زمانے تک خیموں میں بسر کی۔ اور جب چند روز کے بعد اُنھیں برسات میں تکلیف ہوئی تو تھوڑی دُور ہٹ کے ایک مناسب مقام پر اپنے لیے ایک چھپّر بنوایا۔ پھر اسکے بعد اُس چھپّر کے گرد کچّی دیوار کا ایک بہت وسیع مربع حصار کھنچوا لیا جسکے چاروں کونوں پر قلعہ بندی کی شان سے چار کچّے بُرج بنوا دیے تاکہ گرد و پیش کی نگرانی کی جا سکے۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کے اندر متعدد رسالے پلٹنیں توپ خانے۔ اصطبل۔ اور دیگر ضروری کارخانے آسانی سے رہ سکتے تھے۔ برہان الملک کو چونکہ عمارت کا شوق نہ تھا اس لیے اُنکے زنانے اور بیگمات کے قیام کے لیے بھی کچّے ہی مکانات بنا لیے گئے۔ غرض اُس کچّے بنگلے میں اُسوقت کا والیِ اودھ جب اُسے اضلاع کے دَورے اور سفر ہاے حکمرانی سے فراغت ہوتی آرام و آسایش کے ساتھ رہتا تھا اور کسی بات کی شکایت نہ تھی۔ اور اُس کا یہ دارالامارت چند روز میں ”بنگلہ“ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

بُرہان الملک کے انتقال کے بعد جب نواب صفدر جنگ کا زمانہ شروع ہوا تو یہ بستی فیض آباد[ع] مشہور ہوئی۔ یہ ہے بنیاد شہر فیض آباد کی جس نے اپنے بننے اور بڑھنے کی سرعت میں لکھنؤ کو بھی مات کر دیا۔ اب اُن دنوں اُس کچّی چار دیواری کے گرد اکثر مغل سرداران فوج نے اپنی دلچسپی کے لیے باغ اور پُر فضا و فرحت بخش نزہت گاہیں بنائیں۔ اور شہر کی رونق ترقی کرنے لگی۔ اس کچّے احاطے کا ایک پھاٹک ”دلّی دروازہ“ کہلاتا تھا جو مغرب کی طرف تھا۔ اسکے باہر دیوان آتما رام کے بیٹوں نے ایک شاندار بازار بنوایا اور اُسی کے سلسلے میں رہنے کے لیے مکانات بھی

ع۔ فیض آباد کے یہ تمام حالات منشی محمد فیض بخش کی ”تاریخ فرح بخش“ سے لیے گئے ہیں۔ اصل کتاب ہم نے نہیں دیکھی مگر اُسکا انگریزی ترجمہ مسٹر ولیم ہوئی جو ۱۸۸۹ء میں گورنمنٹ پریس الٰہ آباد میں چھپا ہے ہمارے پاس موجود ہے۔

تعمیر کرائے۔ اسی طرح جنہیں خان رسالدار نے بھی ایک بازار بنوایا۔ اور چار دیواری کے اندر خواجہ سراؤں اور مختلف فوجی لوگوں کے بہت سے مکانات بھی تیار ہوگئے۔

نواب صفدر جنگ کی وفات کے بعد اس نئی بستی پر چند روز کے لیے تباہی برس گئی۔ جس کی وجہ سے اتنے دنوں میں جو کچھ بنا تھا زمانے نے بگاڑ کے رکھدیا اس لیے کہ ان کے فرزند نواب شجاع الدولہ نے اپنی سکونت کے لیے لکھنؤ کو پسند کیا تھا اور وہیں رہتے تھے۔ گو سال میں دو ایک راتیں اپنے باپ دادا کے اس قدیم مسکن میں ضرور بسر کرلیا کرتے۔ یہاں تک کہ ۱۷۶۴ء میں انھیں بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے شکست ہوئی۔ اُس وقت وہ کمال بے سروسامانی سے بھاگے ہوئے فیض آباد میں آئے اور وہاں کے قلعے میں جو کچھ ساز و سامان موجود پایا لے کے راتوں رات چل کھڑے ہوئے۔ اور لکھنؤ پہونچے۔ یہاں بھی ایک ہی رات قیام کرکے جو کچھ ہاتھ آیا لیا اور بریلی کی راہ لی۔ تاکہ افاغنۂ روہیلکھنڈ کے پاس جاکے پناہ لیں۔ لڑائی کے نو مہینے بعد انگریزوں سے اُن سے صلح ہوگئی۔ جس کی رُو سے شجاع الدولہ کے ذمے واجب تھا کہ محاصل ملک میں سے پنج آنہ انگریزوں کو ادا کیا کریں۔

صلح ہونے سے پہلے اسی سفر میں اتفاقاً شجاع الدولہ کا گذر شہر فرخ آباد میں بھی ہوا تھا جہاں احمد خان بنگش سے ملاقات ہوئی جو اُس زمانے کے پرانے تجربہ کار شجاعوں میں خیال کیے جاتے تھے۔ اُنھوں نے شجاع الدولہ کو مشورہ دیا کہ اب کی جو تم جا کے عنان حکومت ہاتھ میں لینا تو میری ان دو باتوں کو نہ بھولنا۔ ایک تو یہ کہ مغلوں کا کبھی اعتبار نہ کرنا بلکہ اپنے دیگر ملازموں اور خواجہ سراؤں سے کام لو۔ دوسرے یہ کہ لکھنؤ کا رہنا چھوڑو اور فیض آباد ہی کو اپنا دارالحکومت بناؤ۔ یہ باتیں شجاع الدولہ کے دل پر بیٹھ گئیں۔ اور انگریزوں سے معاہدہ ہونے کے بعد ۱۷۶۵ء میں جو اُنھوں نے اپنی قلمرو کی راہ لی تو سیدھے فیض آباد آئے اور اُسی کو اپنا دارالحکومت قرار دے دیا۔ اب یہاں اُنھوں نے نئی فوج بھرتی کرنا شروع کی۔ نئے رسالے مرتب کرنے لگے اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔ پرانے حصار کو ایک مضبوط شہر پناہ کی شان سے از سر نو تعمیر کرایا۔ جو اب قلعہ کہلاتا تھا۔

محلون کے جو مکانات اندر واقع تھے ڈھا دیے - اور اپنے اکثر خانگی ملازمون کو حکم دیا کہ شہرپناہ کے باہر مکان بنوائین - اُس حصار کے گرداگرد ہر طرف دو دو میل کا میدان چھوڑ دیا گیا جس کے گرد گہری خندق کھود کے قلعہ بندی کی وضع سے درست کی گئی - اور ملازمین سرکار اور افسران فوج کو اجازت ہوئی کہ اپنی حیثیت او حالت کے مناسب قطعات زمین لے کے اُسی میدان مین مکان بنائین - جیسے ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا مستقر قرار دیا ہے ایک دنیا کا رُخ اُدھر پھر گیا - ہزارہا خلقت آ آ کے آباد ہونا شروع ہوئی - شاہجہان آباد مین یہ حالت تھی کہ جسے دیکھیے فیض آباد جانے کے لیے تیار ہے - چنانچہ دلی کے اکثر باکمالون نے وطن کو خیرباد کہی اور پورب کا رُخ کیا - شب و روز لوگون کے آنے کا تانتا بندھا رہتا تھا - اور قافلے پر قافلے چلے آتے تھے جو آ آ کے یہان بستے اور فیض آباد کی سواد مین کھپتے جاتے تھے - چندہی روز کے اندر ہر قوم و ملت کے خوش باش - اہل قلم - اہل سیف - تاجر - صناع - اور ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ یہان جمع ہوگئے - اور جو آتا آتے ہی اس فکر مین پڑ جاتا کہ کوئی قطعۂ زمین حاصل کر کے مکان بنا لے -

چندہی سال کے اندر اس پہلے حصار کے علاوہ دو اور فصیلین تعمیر ہو گئین - ایک جو پہلے مربع کے جنوبی پہلو سے ملی ہوئی تھی اُسکے رقبے کا طول و عرض دو دو میل کا تھا - اور دوسرا حصار ایک میل کے پھیلاؤ مین تھا جو قلعہ اور بیرونی فصیل کے درمیان تھا - اسی زمانے مین ترپولیا اور چوک بازار تعمیر ہوے - جن کی سڑک قلعے کے جنوبی پھاٹک سے شروع ہو کے سڑک الہ آباد کے ناکے تک چلی گئی تھی اور اتنی کشادہ تھی کہ برابر برابر دس چھکڑے آسانی سے گذر سکتے تھے - فصیل شہر کا آثار زمین کے پاس چاہے جتنا ہو درمیان مین دس گز سے کم نہ تھا جو اُوپر پہونچ کے پانچ گز رہ گیا تھا - اس فصیل پر قاعدہ اور بے قاعدہ دونون طرح کی فوجون کے دستے رات بھر روند پھرا کرتے - اور جابجا پہرہ دیتے - باقاعدہ سپاہیون کی وردی لال تھی اور بے قاعدہ سپاہیون کی وردی سیاہ - انھین سپاہیون کی ضرورت سے برسات مین جابجا چھپر ڈال دیے جاتے - مگر برسات کے ختم ہوتے ہی آگ لگنے کے اندیشے

سے وہ لازمی طور پر اُتار ڈالے جاتے۔ چنانچہ صرف فصیل کی دیواروں کے لیے ہر سال تقریبًا ایک لاکھ چھپر چھائے اور چار مہینے بعد نوچ کے پھینکدیے جاتے۔

نواحی شہر میں دو مرغزار شکارگاہ قرار دیے گئے تھے۔ جن میں سے ایک مغرب کی جانب گرجی بیگ خان کی مسجد سے گیتا رگھاٹ تک چلا گیا تھا جو ایک معتدبہ مسافت ہے۔ اُس کے دونوں طرف کچی دیواریں تھیں اور تیسری طرف گھاگرا واقع ہوئی تھی۔ اس میں ہرن۔ چیتل۔ بارہ سنگھے۔ نیل گائیں وغیرہ شکار کے جانور کثرت سے چھوڑے گئے تھے جو نہایت آزادی سے چھوٹے چھوٹے پھرتے اور بھڑکتے ہی چوکڑیاں بھرنے لگتے۔ دوسری شکارگاہ شہر سے مشرق کی طرف موضع جبورا اور چھاؤنی گوشائیں سے دریا کنارے تک تھی جس کا پھیلاؤ چھ میل کا تھا۔ اسکے رقبے میں گیارہ موضع اور اُنکی اراضی آگئی تھی۔ مگر یہ شکارگاہ ناتمام ہی رہی اور اسکی نوبت نہ آنے پائی کہ اس میں وحشی جانور چھوڑے جائیں۔

خاص شہر کے حلقے کے اندر تین ایسے نزہت بخش باغ تھے جو اس قابل تھے کہ امرا اور شاہزادے آکے اُن میں سیر کریں اور اُنکی بہار اور شادابی سے لطف اُٹھائیں۔ ایک انگوری باغ جو قلعے کے اندر واقع تھا۔ اور اُسکے رقبے کے چوتھائی حصے پر حاوی تھا۔ دوسرا موتی باغ جو بیت چوک کے اندر واقع تھا۔ تیسرا لال باغ جو سب باغوں سے زیادہ وسیع تھا۔ اس میں نہایت ہی نفاست سے چمن بندی کی گئی تھی اور ہر طرح کے نازک و نظر فریب پھول قرینے سے لگائے گئے تھے۔ سارے صوبے میں اس کی شہرت تھی اور دُور دُور کے لوگوں کو تمنا تھی کہ کوئی خوش نصیبی کی شام اس روح افزا باغ میں بسر کریں۔ شہر کے نوجوان شرفا کے غول دوپہر کو اس میں گشت لگاتے اور دل بہلاتے نظر آتے۔ اس باغ کی جاں فزائی کی شہرت یہاں تک تھی کہ شہنشاہ دہلی شاہ عالم بادشاہ جب الہ آباد سے پلٹے تو اسی باغ کی سیر کے شوق میں فیض آباد ہوتے ہوئے دہلی گئے۔ اور کچھ زمانے تک اسی کے اندر اُن کا قیام رہا۔ اِن تین باغوں کے علاوہ آصف باغ اور بلند باغ بھی نواحِ شہر میں لکھنؤ کے راستے پر واقع تھے۔

نواب شجاع الدولہ بہادر کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ ہر صبح و شام

سوار ہو کے سڑکوں اور مکانوں کو معائنہ کرتے۔ مزدور پھاوڑے اور کدالیں لیے ہوئے ساتھ ہوتے۔ جہاں کہیں کسی مکان کو ٹیڑھا اور اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دوکاندار کو دیکھتے کہ اُس نے سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دبا لی ہے فوراً اُسے کھدوا کے برابر اور سیدھا کرا دیتے۔

فوج کی اصلاح کی طرف بھی شجاع الدولہ کو خاص توجہ تھی۔ رسالے کے اعلیٰ سردار نواب مرتضیٰ خان بریچ اور ہمت بہادر اور اُمراؤ گیر نام دو گوشائیں تھے۔ ان کے ماتحت اتنے سوار تھے کہ ان تین کے علاوہ اور جتنے چھوٹے چھوٹے جمعدار تھے سب کی فوج کی مجموعی تعداد سے ان میں سے ہر ایک کی جمعیت زیادہ تھی۔ دیگر سرداران فوج احسان کمبوہی۔ گرجی بیگ خان۔ گوپال راؤ مرہٹہ۔ میر جملہ کے داماد نواب جمال الدین خان۔ مظفر الدولہ تہور جنگ بخشی ابوالبرکات خان ساکن کاکوری۔ اور محمد معزالدین خان لکھنؤ کے ایک شہزادے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ تھا جسکے ماتحت ہزار پانسو سپاہیوں کا گروہ نہ ہو۔ ماسوا ان کے خواجہ سرا اور دو تو عمر خواجہ سرا جو اُنکے زیر نگرانی تربیت پاتے۔ چیلے۔ اور شاگرد پیشہ تھے بسنت علی خان خواجہ سرا کے ماتحت دو ڈویژن فوج یعنی چودہ ہزار باقاعدہ سپاہ تھی۔ جس کی وردی سرخ تھی۔ ایک دوسرا بسنت خواجہ سرا تھا جس کے زیر کمان ایک ہزار بے قاعدہ نیزہ باز سوار اور ایک پلٹن تھی۔ عنبر علی خان خواجہ سرا کی افسری میں پانسو سوار اور ایک پلٹن تھی۔ جن کی وردیاں سیاہ تھیں۔ محبوب علیخان خواجہ سرا کے زیر علم پانسو سوار تھے اور چار پلٹنیں تھیں۔ اتنی ہی فوج لطافت علی خان کے ماتحت تھی۔ رگھناتھ سنگھ اور پرشاد سنگھ میں سے ہر ایک کے زیر کمان تین تین سو سوار اور چار چار پلٹنیں تھیں۔ اسی طرح مقبول علی خان اول دوم یوسف علی خان کے ہمراہ پان پان سو مغل سواروں اور پیدلوں کی جمعیت تھی۔ اور توپخانہ بے حد و بے حساب تھا۔

لہذا کُل فوج جو شجاع الدولہ کے قبضے میں تھی اور فیض آباد میں موجود رہا کرتی تھی اُس کی مجموعی تعداد یہ تھی۔ سرخ وردی والے تیس ہزار۔ باقاعدہ اور سیاہ وردی والے چالیس ہزار بے قاعدہ پیادے۔ ان کے افسر اعلیٰ یعنی سپہ سالار اعظم

سید احمد تھے جو "بانسی والا" کے لقب سے مشہور تھے - جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے ان کی توڑے دار بندوقوں کے مقابلے مین انگریزی فوج کی بندوقین کوئی وقعت نہ رکھتی تھین -

اس جمعیت کے علاوہ شجاع الدولہ کے پاس بائیس ہزار ہرکارے اور مخبر تھے جو ہر ساتوین روز پونہ سے اور ہر پندرھوین دن کابل سے خبرین لاتے - دربار مین ہمیشہ بلاد دور دراز کے حکمرانون کے نائب موجود رہا کرتے - ایک نائب مرہٹون کا تھا - ایک نظام علی خان فرمانروائے دکن کا - ایک ضابطہ خان کا - اور ایک نواب ذوالفقار الدولہ نجف خان کا - جن کے ساتھ اُن کے دفتر اور سپاہی بھی تھے - ان لوگون کے علاوہ اور بھی بہت سے فوجی افسر اپنی جمعیتون کے ساتھ یہان موجود رہتے - جیسے میر نعیم خان جن کے جھنڈے کے نیچے ثابت خانی - بندیلکھنڈی - چندیلا - اور میواتی سپاہیون کا ہجوم تھا -

محمد بشیر خان قلعہ دار تھے - شہر کی فصیلون اور پھاٹکون پر انھین کے سوار اور پیادے پھیلے رہتے - اور قلعے کے اندر ہی اُنکے رہنے اور دفتر کے لیے عمدہ مکانات اور اُنکے سپاہیون کی بارکین بنی ہوئی تھین - جب بیرونی دیوارون مین بھی جگہ نہ باقی رہی تو سید جمال الدین خان اور گوپال راؤ مرہٹہ نے باہر نکل کے موضع نوراہی کے پاس سکونت اختیار کی اور اپنے مکانات اور کیمپ ہان بنائے - اور اسی جگہ کی تنگی کی وجہ سے نواب مرتضیٰ خان بریچ - میر احمد بانسی والا - میر ابو البرکات اور شیخ احسان اجودھیا اور فیض آباد کے درمیان خیمون مین رہتے تھے -

آدمیون کی کثرت اور سپاہیون کے ہجوم سے شہر کے اندر خصوصاً چوک مین اس قدر بھیڑ لگی رہتی کہ گذرنا دشوار تھا - اور غیر ممکن تھا کہ کوئی شخص بغیر اٹکے ہوے سیدھا چلا جائے - فیض آباد نہ تھا انسانون کا جنگل تھا - بازار مین دیکھیے تو ملکون ملکون کا مال ڈھیر تھا - اور یہ خبر سُن کے کہ فیض آباد مین نفیس مزاج رئیسون اور شوقین امیرون کا منتخب مجمع ہے - ہر طرف سے تاجرون کے قافلے لدے پھندے چلے آتے تھے - اور چونکہ جا ہے کیسا ہی قیمتی مال ہو ہاتھون

ہاتھ بک جاتا۔ اچھی سے اچھی چیزوں کے آنے کا سلسلہ بندھ گیا تھا۔ جب دیکھیے ایرانی۔ کابلی۔ چینی۔ اور فرنگی سوداگر نہایت گران قیمت اور بھاری مال لیے ہوے موجود رہتے۔ اور جو جو نفع اٹھاتے ہوس بڑھتی اور زیادہ جستجو و جان فشانی سے نیا مال لے آتے۔ مسیو ژان تیل۔ مسیو سون سون۔ اور مسیو پیدروز وغیرہ کے ایسے دو سو فرانسیسی جو یہاں اقامت گزین ہو گئے تھے سرکار میں ملازم تھے۔ اور شجاع الدولہ کی سلطنت سے روابط اتحاد رکھتے تھے جو سپاہیوں کو فوجی تعلیم دیتے۔ اور توپیں بندوقیں اور دیگر اسلحہ جنگ اپنے اہتمام میں تیار کراتے۔

منشی فیض بخش مصنف تاریخ فرح بخش جن کی عنایت سے ہمیں یہ واقعات معلوم ہوے ہیں خود اس زمانے میں موجود تھے اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اپنے مشاہدے سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جب پہلے پہل گھر چھوڑ کے فیض آباد میں گیا ہوں ممتاز نگر ہی تک پہونچا تھا جو شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے انواع و اقسام کی مٹھائیاں۔ گرما گرم کھانا۔ کباب۔ سالن۔ روٹیاں۔ اور پراٹھے وغیرہ بک رہے ہیں۔ سبیلیں رکھی ہوئی ہیں۔ نان خطائیاں مختلف قسم کے شربت اور فالودہ بھی بک رہا ہے۔ اور صدہا آدمی خریداری کے لیے اُن دکانوں پر گرے پڑتے ہیں۔ مجھے خیال گذرا کہ میں شہر کے اندر داخل ہو گیا اور خاص چوک میں ہوں۔ مگر متحیر تھا کہ ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہیں میں اندر کیسے پہونچ گیا؟ لوگوں سے پوچھا تو ایک راہگیر نے کہا "جناب شہر کا پھاٹک یہاں سے چار میل ہے۔ آپ کس خیال میں ہیں؟"

اس جواب پر حیرت کرتا ہوا میں شہر میں داخل ہوا تو عجب چہل پہل نظر آئی۔ رنگینیاں تھیں اور دلچسپیاں۔ جدھر دیکھتا ہوں ناچ ہو رہا ہے۔ مداری تماشا کر رہے ہیں۔ اور لوگ طرح طرح کے سیر تماشوں میں مصروف ہیں۔ میں یہ رونق اور شور و ہنگامہ دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کوئی وقت نہ ہوتا جب نوبتوں اور پلٹنوں کے نقاروں کی آواز نہ سنی جاتی ہو۔ پہروں

گھڑیون کے بتانے کے لیے بار بار نوبت بجتی اور گھڑیالون پر موگریان پڑتین جن کے شور و غل سے کان اُڑے جاتے۔ سڑکون پر دیکھیے تو ہردم گھوڑون۔ ہاتھیون اونٹون۔ خچرون۔ شکاری کتون۔ گائے بھینسون۔ بیلون۔ چھکڑون۔ اور توپون کے گذرنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ جن کا شمار حساب اور اندازے سے باہر تھا۔ راستہ چلنا دشوار تھا۔

ایک عجیب رونق و تمکنت کا شہر نظر آیا جس مین وضعداران دہلی مین سے خوش پوشاک اور وضعدار شریف زادے۔ حاذق اطبائے یونانی۔ اعلیٰ درجے کے مردانے اور زنانے طائفے۔ ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گوئیے سرکار مین ملازم تھے۔ اور بڑی بڑی تنخواہین پا کے عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنیٰ و اعلیٰ سب کی جیبین روپیون۔ اشرفیون سے بھری ہوئی تھین۔ اور ایسا نظر آتا کہ جیسے یہان کبھی کسی نے افلاس و احتیاج کو خواب مین بھی نہین دکھیا ہے۔ نواب وزیر (شجاع الدولہ بہادر) شہر کی سرسبزی و رونق اور رعایا کی مرفہ الحالی مین ہمہ تن مصروف ہین اور معلوم ہوتا تھا کہ چند ہی روز مین فیض آباد دہلی کی ہمسری کا دعوے کرے گا۔

چونکہ کسی مملکت اور کسی شہر کا رئیس اُس نفاست اور شان و شکوہ سے نہین رہتا تھا جس طرح کہ نواب شجاع الدولہ رہتے تھے۔ اور اسکے ساتھ ہی یہ نظر آتا تھا کہ کہین کے لوگ اس بے جگری سے ہر کام مین اور ہر موقع و محل پر دولت صرف کرنے کو نہین تیار ہو جاتے تھے۔ اس لیے ہر قسم کے اور ہر جگہ کے اعلیٰ دستکارون صناعون اور طالبعلمون نے وطنون کو خیرباد کہ کے فیض آباد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اور یہان ہر زمانے مین ڈھاکے۔ بنگالے۔ گجرات۔ مالوہ۔ حیدرآباد۔ شاہجہان آباد۔ لاہور۔ پشاور۔ کابل۔ کشمیر اور ملتان وغیرہ کے طالب علمون کا ایک بڑا بھاری گروہ موجود رہتا جو علما کی درس گاہون مین تعلیم پاتے۔ اور اُس چشمۂ علم سے جو فیض آباد مین جاری تھا سیراب ہو ہو کے اپنے گھرون کو واپس جاتے۔ کاش نواب وزیر اور دس بارہ برس جی جاتے تو گھاگرا کنارے ایک نیا شاہجہان آباد آباد ہو جاتا۔ اور دنیا ایک نئی زندہ دہلی کی صورت دیکھ لیتی۔

یہ نواب شجاع الدولہ کے صرف نو سال کے قیام کا نتیجہ تھا جس نے فیض آباد کو ایسا بنا دیا۔ اور ان نو سال مین بھی صرف برسات کے چار مہینے وہ شہر مین رونق افروز رہتے۔ باقی زمانہ اپنی قلمرو کے دورے اور سیر و شکار مین صرف ہوتا تھا شجاع الدولہ کا طبعی میلان مہ جبین عورتون اور رقص و سرود کی طرف تھا جس کی وجہ سے بازاری عورتون اور ناچنے والے طائفون کی شہر مین اس قدر کثرت ہوگئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ اُن سے خالی نہ تھا۔ اور نواب کے انعام و اکرام سے وہ اس قدر خوشحال اور دولتمند تھین کہ اکثر رنڈیان ڈیرہ دار تھین جن کے ساتھ دو دو تین تین عالیشان خیمے رہا کرتے۔ اور نواب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر مین ہوتے تو نوابی خیمون کے ساتھ ساتھ اُنکے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑون پر لدلدکے رواں ہوتے اور اُنکے گرد دس دس بارہ بارہ تلنگون کا پہرہ رہتا۔ اور جب حکمران کی یہ وضع تھی تو تمام امرا اور سردارون نے بھی بے تکلف یہی وضع اختیار کرلی۔ اور سفر مین سب کے ساتھ رنڈیان رہنے لگین (اگرچہ اس سے بداخلاقی اور بے شرمی کو ترقی ہوگئی لیکن اس مین شک نہین کہ ان شاہدان بازاری کی کثرت اور امرا کی شوقینی سے شہر کی رونق بدرجہا زیادہ بڑھ گئی تھی اور فیض آباد دُلھن بنگیا تھا)

۱۷۷۳ء مین شجاع الدولہ نے مغرب کا سفر کیا۔ اس سفر مین شاہی کیمپ کی رونق اور چہل پہل بیان سے باہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نوابی علم اقبال کے ساتھ ساتھ ایک بڑا بھاری شہر سفر کر رہا ہے۔ لکھنؤ ہوتے ہوے اٹاوے پہونچے جس پر مرہٹے قابض تھے۔ ایک ہی حملے مین اُسے اُن سے چھین کے اپنے قبضے مین کیا۔ اور احمد خان بنگش کی قلمرو مین داخل ہو کے کوڑیا گنج اور کاس گنج مین خیمہ زن ہوے۔ یہان سے اُنھون نے حافظ رحمت خان فرمان رواے بریلی کو لکھا "گذشتہ سال مین نے ایک کروڑ روپے مہاجی سیندھیا مرہٹے کو بھیجے تھے جس نے آپ کا وہ تمام علاقہ جو درمیان دوآب ہے آپ سے چھین لیا تھا۔ وہ رقم ادا کر کے مین نے آپ کا وہ علاقہ اُسکے قبضے سے چھڑایا اور آپ کے حوالے کر دیا۔ لہذا اب پچاس لاکھ کی رقم جو آپ کی طرف سے مین نے ادا کی تھی فوراً ادا کیجیے۔" حافظ رحمت خان نے اپنے تمام افغان سردارون اور بھائی بندون کو جمع کر کے کہا "شجاع الدولہ لڑائی کے لیے

چھانٹ ڈھونڈھ رہے ہین۔ مناسب یہ ہے کہ یہ مطلوبہ رقم ادا کردی جائے۔ بیس لاکھ مین اپنے پاس سے دیتا ہون اور باقی تیس لاکھ تم جمع کردو" نا عاقبت اندیش پٹھان سردارون نے جواب دیا" شجاع الدولہ کے آدمی دیکھے ہی کے ہین وہ بھلا ہم سے کیا مقابلہ کرین گے؟ باقی رہی انگریزی فوج جو اُن کے ساتھ ہے تو اُنکی توپون پر جس وقت ہم تلوارین سُوت سُوت کے جا پڑین گے سب کے حواس جاتے رہین گے۔ دینے لینے کی کچھ ضرورت نہین"۔ حافظ رحمت خان نے یہ سُن کے کہا "تمھین اختیار رہے۔ مگر مین ابھی سے کہے رکھتا ہون کہ اگر لڑائی کا رنگ بدلا تو مین میدان سے زندہ نہ آؤن گا۔ اور اُس کا جو کچھ انجام ہوگا وہ تمھین کو بھگتنا پڑے گا"

ہر تقدیر شجاع الدولہ کو اپنی خواہش کے موافق جواب نہ ملا۔ فوج لے کے چڑھ گئے۔ لڑائی ہوئی۔ اور لڑائی کا انجام وہی ہوا جسے تقدیر نے حافظ رحمت خان کی زبان سے پہلے ہی سُنوا دیا تھا۔ حافظ رحمت خان شہید ہوے اور اُن کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر یہ فتح شجاع الدولہ بہادر کو بھی سزاوار نہ ہوئی۔ ۱۴۔ صفر ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) کو لڑائی ہوئی تھی، ۱۱ شعبان کو شجاع الدولہ بریلی سے کوچ کرکے لکھنؤ آئے۔ ماہ مبارک رمضان لکھنؤ مین بسر کیا۔ ۸۔ شوال کو لکھنؤ سے کوچ کرکے ۱۴۔ کو فیض آباد مین داخل ہوے۔ اور فتح کو ۹ مہینے دس ہی دن ہوے تھے۔ اور گھر مین پورے ڈیڑھ مہینے بھی آرام کرنے کا موقع نہین ملا تھا کہ ۲۳۔ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۵ء) کو رہگراے عالم جاودان ہوے۔ اور افسوس اُن کی وفات ہی کے ساتھ فیض آباد کی ترقی کا دور بھی ختم ہوگیا۔

اس وقت حکومت اودھ مین سب سے بڑا اثر نواب شجاع الدولہ بہادر کی بی بی بہو بیگم صاحبہ کا تھا۔ جو نہایت ہی دولتمند بھی سمجھی جاتی تھین۔ اُنکی منظوری سے نواب آصف الدولہ مسند نشین حکومت ہوے۔ مگر اُن کی اخلاقی حالت نہایت خراب تھی۔ اور مصاحبون کو مناسب معلوم ہوا کہ ماں بیٹون کو الگ رکھین۔ چند روز تک سیر وشکار مین مصروف رہنے کے بعد نواب آصف الدولہ بہادر نے لکھنؤ مین قیام اختیار کرلیا جو یہین بیٹھے بیٹھے ماں کو ستایا کرتے۔ اور بار بار اُن سے

روپیہ طلب کرتے۔

بہو بیگم صاحبہ کے موجود رہنے سے فیض آباد کو اُن کی زندگی تک تھوڑی بہت رونق حاصل رہی۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں بھی نواب آصف الدولہ کی نالایقیوں نے بہو بیگم صاحبہ کے اطمینان میں اور اسکی وجہ سے فیض آباد کے امن و امان میں خلل ڈالا۔ مگر اُس محترم خاتون کی زندگی تک وہ جھگڑے اور ہنگامے بھی ایک گونہ باعثِ رونق ہو جایا کرتے تھے۔ اُن کی وفات پر فیض آباد کی تاریخ ختم ہوگئی۔ اور لکھنؤ کا دَور شروع ہوا جس کا حال ہم آیندہ لکھیں گے۔

(۳)

ٹھیک کسی کو نہیں معلوم کہ لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد کب پڑی؟ اس کا بانی کون تھا؟ اور وجہ تسمیہ کیا ہے؟ لیکن مختلف خاندانوں کی قومی روایتوں اور قیاسات سے کام لے کے جو کچھ بتایا جا سکتا ہے یہ ہے:۔

کہتے ہیں راجہ رامچندر جی لنکا کو فتح کرکے اور اپنے بن باس کا زمانہ پورا کرکے جب سریر جہان پناہی پر جلوہ افروز ہوئے تو یہ سرزمین اُنھوں نے جاگیر کے طور پر اپنے ہمسفر و ہمدرد بھائی لچھمن جی کو عطا کر دی۔ چنانچہ اُنھیں کے قیام یا ورود سے یہان دریا کنارے ایک اونچے ٹیکرے پر ایک بستی آباد ہو گئی جس کا نام اُسوقت سے "لچھمن پور" قرار پایا۔ اور وہ ٹیکرا "لچھمن ٹیلا" مشہور ہوا۔ اُس ٹیلے میں ایک بہت گہرا غار یا کنوان تھا جس کی کسی کو تھاہ نہ ملتی تھی۔ اور لوگون میں مشہور تھا کہ وہ سیس ناگ[۱] تک چلا گیا ہے۔ اس خیال نے جذبات عقیدت کو حرکت دی۔ اور ہندو لوگ خوش اعتقادی سے جا جاکے اُس میں پھول پانی ڈالنے لگے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ جودھشٹر کے پوتے راجہ جنم جے نے یہ علاقہ مرتاض بزرگون۔ رشیون اور منیون کو جاگیر میں دیدیا تھا۔ جنھون نے یہان چپے چپے پر اپنے آشرم بنائے اور اہر کے دھیان میں مصروف ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد اُنکو کمزور دیکھ کے دو نئی قومیں ہمالیہ کی ترائی سے آکے اس ملک پر قابض ہو گئیں جو باہم ملی جلی

[۱] ہندو دیو مالا میں سیس ناگ اُس ہزار سر والے سانپ کا نام ہے جو دھرتی (زمین) کو اپنے پھن پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ اور قدرت و عظمت الٰہی کا ایک واجب الاحترام مظہر ہے۔

اور ایک ہی نسل کی دو شاخیں معلوم ہوتی تھیں - ایک "بھر" اور دوسری "پاسی"۔
انھیں لوگوں سے سید سالار مسعود غازی سے ۴۲۵ھ ہجری (۱۰۳۳ء) میں مقابلہ ہوا - اور غالباً اُنھیں پر بختیار خلجی نے ۶۰۳ھ ہجری (۱۲۰۲ء) میں چڑھائی کی تھی - لہذا اس سرزمین پر جو مسلمان خاندان پہلے پہل آکے آباد ہوئے وہ انھیں دونوں حملہ آوروں خصوصاً سید سالار مسعود غازی کے ساتھ آنے والوں میں سے تھے -

بھر اور پاسیوں کے علاوہ برہمن اور کایستھ بھی یہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان سب لوگوں نے مل کے یہاں ایک چھوٹا سا شہر بسا لیا اور امن وامان سے رہنے لگے - لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بستی کا نام "لچھمن پور" سے بدل کے "لکھنؤ" کب ہوگیا - اس آخری مروجہ نام کا پتہ شہنشاہ اکبر سے پہلے نہیں چلتا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو مسلمانوں کی کافی آبادی پہلے سے موجود تھی جس کا ثبوت اس واقعے سے ہو سکتا ہے جو شیوخ لکھنؤ کی خاندانی روایتوں میں بہت پہلے سے موجود ہے کہ ۹۴۶ھ ہجری (۱۵۴۰ء) میں جب ہمایوں بادشاہ کو شیر شاہ کے مقابل جونپور میں شکست ہوئی تو وہ میدان چھوڑ کے سلطان پور لکھنؤ میں بھیت ہوتا ہوا بھاگا تھا - لکھنؤ میں اُس نے صرف چار گھنٹے دم لیا تھا - اور گو کہ شکست کھا کے آیا تھا اور کوئی قوت و حکومت نہ رکھتا تھا مگر لکھنؤ کے لوگوں نے محض انسانی ہمدردی اور مہمان نوازی کے خیال سے اُن چند گھنٹوں ہی میں دس ہزار روپیہ اور پچاس گھوڑے اُس کی نذر کیے تھے - اتنے تھوڑے زمانے میں اس سامان کے فراہم ہو جانے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُن دنوں یہاں معتدبہ آبادی موجود تھی - اور اُن دنوں کا لکھنؤ آج کل کے اکثر قصبات سے زیادہ بارونق اور خوشحال تھا -

اُسی قدیم زمانے کے آنے والوں میں شاہ مینا کا خاندان بھی ہے جن کا مزار پُرانوار آج تک مرجع انام ہے - اور غالباً اُسی عہد کے آنے والوں میں شاہ پیر محمد بھی تھے جنھوں نے خاص لچھمن ٹیلے پر سکونت اختیار کی - اور وہیں پیوند زمین ہوئے - اُنکے قیام کی وجہ سے وہ پُرانا ٹیکرا لچھمن ٹیلے سے "شاہ پیر محمد کا ٹیلا" ہوگیا - اور مرور

ایام سے وہ گہرا غار بھی پٹ گیا۔ اُس کے بعد کے زمانے میں شہنشاہ اورنگ زیب نے جو بہ نفس نفیس یہاں آیا تھا ایک عمدہ۔ مضبوط۔ خوبصورت۔ اور شاندار مسجد بنا کے کھڑی کر دی جو آج تک عالمگیر کی طرف سے صدائے "اللہ اکبر" بلند کر رہی ہے۔

۱۰۱۹ہجری (۱۵۹۰ء) میں شہنشاہ اکبر نے جب سارے ہندوستان کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا تو صوبۂ اودھ کے صوبہ دار یا والی کا مستقر بادی النظر میں لکھنؤ ہی قرار پایا تھا۔ اُن دنوں اتفاق سے شیخ عبدالرحیم نام ضلع بجنور کے ایک خستہ حال و پریشان روزگار بزرگ بہ تلاشِ معاش دہلی پہونچے۔ وہاں امرائے دربار میں رسوخ پیدا کر کے بارگاہِ شہنشاہی میں باریاب ہوئے۔ آخر منصبداران شاہی میں شامل ہو کے لکھنؤ میں جاگیر پائی۔ اور چند روز بعد بڑے تزک و احتشام اور کر و فر سے اپنی جاگیر میں آ کے مقیم ہوئے۔ یہاں خاص لچھمن ٹیلے یا شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر مقیم ہو کے اُنھوں نے اپنا پنج محلا بنوایا۔ شیخن دروازہ تعمیر کرایا۔ اور لکھنؤ ہی میں پیوندِ زمین ہوئے۔ اُن کا مقبرہ "نادان محل" کے نام سے آج تک مشہور ہے جس کی عمارت کو ابھی چند روز ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے پسند کر کے اپنی زیرِ حمایت لے لیا ہے۔

اسی زمانے میں یہاں شیخ عبدالرحیم نے لچھمن ٹیلے کے پاس ایک دوسری بلندی پر ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کرایا جو قرب و جوار کی گڑھیوں سے زیادہ مضبوط تھا۔ اور گرد و نواح کے لوگوں پر اُس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ یا تو اس لیے کہ شیخ عبدالرحیم کو دربارِ شاہی سے علم ماہی مراتب عطا ہوا تھا۔ یا اس لیے کہ اس قلعے کے ایک مکان میں چھبیس محرابیں تھیں اور ہر محراب پر معمار نے دو دو مچھلیاں بنا کے باون مچھلیاں بنا دی تھیں۔ اس قلعے کا نام "مچھی بھون" مشہور ہو گیا۔ "بھون" کا لفظ یا تو قلعہ کے معنوں میں ہے۔ یا "باون" سے بگڑ کے بن گیا ہے۔ جس معمار نے اس قلعہ کو تعمیر کیا وہ "لکھنا" نام ایک اہیر تھا۔ اور کہتے ہیں کہ اُسی کے نام سے شہر کا نام لکھنؤ ہو گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ لچھمن پور ہی بگڑ کے لکھنؤ بن گیا ہے۔ ان میں سے جو بات ہو مگر اس آبادی نے یہ نام شیخ عبدالرحیم کے آنے کے بعد پایا۔

چند روز بعد شیخ عبدالرحیم کے خاندان والوں یعنی شیخزادوں کے علاوہ یہاں

پٹھانوں کا ایک گروہ آ گیا - جو جنوب کی طرف بسے اور "رام نگر کے پٹھان" مشہور ہوئے - اُنھوں نے اپنی زمینداری کی حد اُس مقام تک قرار دی تھی جہاں اب گول دروازہ واقع ہے - کیونکہ وہاں سے دریا کی طرف بڑھیے تو شیخ زادوں کی زمین شروع ہوتی تھی - ان پٹھانوں کے بعد شیوخ کا ایک نیا گروہ آ کے مشرق کی طرف بس گیا جو "شیوخ نہرہ" کہلاتے ہیں - اُن لوگوں کی زمین وہاں پر تھی جہاں اب رزیڈنسی کے کھنڈر پڑے ہیں -

یہ تینوں گروہ اپنے اپنے علاقوں پر متصرف اور اپنے حلقوں کے حاکم تھے لیکن شیخزادوں کا اثر سب پر غالب تھا اور قرب و جوار پر اُن کا دباؤ پڑتا تھا جس کا قوی سبب یہ تھا کہ یہ لوگ دربار دہلی میں رسوخ رکھتے تھے - ان میں سے کئی شخص پورے ملک اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو گئے تھے - اور اُنکے قلعۂ مچھی بھون کی مضبوطی کی اس قدر شہرت تھی کہ عوام کی زبان پر تھا "جس کا مچھی بھون اُس کا لکھنؤ"۔

اکبر ہی کے زمانے میں لکھنؤ ترقی کرنے لگا تھا - اور اُسکی آبادی بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھی - یہ صحیح ہے کہ صوبہ دار اودھ اُنھیں شیخزادوں میں سے منتخب ہوتے لیکن عام معمول یہ تھا کہ اس خدمت پر معززین دہلی مقرر ہوتے - جو سالوں سال اپنے گھر بیٹھے رہتے - فقط تحصیل وصول کے زمانے میں ایک دورہ سا کرتے اور اُنکے نائب یہاں رہا کرتے - لہذا اُن سے شہر کی ترقی کی کوئی امید نہ کی جا سکتی تھی - ہاں یہاں کے دو ایک شیخزادے جو صوبہ دار مقرر ہو گئے تو اُن کے تقرر سے البتہ لکھنؤ کو فائدہ پہونچا -

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو لکھنؤ کی طرف خاص توجہ تھی - چنانچہ اُس نے یہاں کے برہمنوں کو باجپئی چڑھاوے کے لیے ایک لاکھ روپئے مرحمت فرمائے تھے - اور اُسی وقت سے لکھنؤ کے باجپئی برہمن مشہور ہوے - اسی سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم ترین ہندو محلے جو اکبر کے وقت میں موجود تھے - باجپئی ٹولہ - کٹاری ٹولہ - سوندھی ٹولہ - بنجاری ٹولہ اور اہیری ٹولہ ہیں - اور یہ سب چوک ہی کے اطراف میں ہیں -

مرزا سلیم نے جو تخت پر بیٹھ کے نورالدین جہانگیر کے لقب سے مشہور ہوے باپ

کی زندگی اور اپنے ایام ولیعہدی مین مرزا منڈی کی بنیاد ڈالی جو چھچی بھون سے
مغرب طرف واقع ہے۔ اکبر کے آخر عہد مین یہان کے صوبہ دار جواہر خان تھے۔ وہ
تو دہلی مین رہتے مگر اُن کے نائب قاضی محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب مین اُس سے
ملے ہوے داہنی طرف محمود نگر اور بائین طرف شاہ گنج آباد کیے۔ اور اُنکے اور
چوک کے درمیان مین بادشاہ کے نام سے اکبری دروازہ تعمیر کرایا۔

عہد اکبری مین جبکہ یہ عمارتین بن رہی تھین اور یہ محلے آباد ہو رہے تھے لکھنؤ
ایک اچھی تجارت گاہ بن گیا تھا۔ اور ترقی کے اس درجے کو پہونچا ہوا تھا کہ ایک
فرانسیسی تاجر نے جو گھوڑون کی تجارت کرتا تھا یہان قیام کرکے نفع حاصل کرنے
کی کوشش کی۔ اور دربار شہنشاہی سے لکھنؤ کے قیام کے لیے سند مستامنی[ع] حاصل
کرکے یہان اپنا اصطبل قائم کیا۔ اور پہلے ہی سال میں اس قدر پھلا پھولا کہ چوک کے
متصل چار عالیشان مکان تعمیر کر لیے۔ سال ختم ہونے پر جب اُس نے پروانۂ مستامنی
کی تجدید چاہی تو اُسے زیادہ قیام کی اجازت نہ ملی۔ دوراسپر بھی اُس نے زبردستی
ٹھہرنے کا ارادہ کیا تو حسب الحکم شہنشاہی حکام شہر نے اُسکے مکانات ضبط کرکے
نزول سرکار کر لیے اور اُسے یہان سے نکال دیا۔ وہ چارون مکان مدت تک
سرکار کے قبضے مین رہے یہان تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد مین
جب مُلّا نظام الدین سہالوی نے اپنے قصبے کے فسادون سے عاجز آکے لکھنؤ مین
سکونت اختیار کرنے کا قصد کیا تو عطیۂ سرکار کے طور پر وہ چارون مکان اُنھین دیے
گئے۔ اور اُنھون نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ آکے اُن مکانون مین سکونت
اختیار کی جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج تک "فرنگی محل"
کہلاتے ہین۔ مُلّا صاحب کے قدوم کی برکت سے لکھنؤ علم و فضل کا مرکز اور طلبۂ علوم
کا مرجع و ماوی بن گیا۔ اور اس علمی مرجعیت کو اس قدر ترقی ہوئی کہ مُلّا نظام الدین

ع مستامن کے معنی طالب امن ہین یورپ والون کو چونکہ مسلمانون اور ہندون مین اپنے لیے
خطرہ نظر آیا کرتا تھا اس لیے جہان قیام کرنا چاہتے وہان کے لیے دربار دہلی سے مستامنی کی سند
حاصل کر لیا کرتے۔ تاکہ عمال و حکام اور نیز رعایا اُنھین نہ ستائے۔ اس سند سے چونکہ سلطنت پر
ذمہ داریان عائد ہو جاتی تھین اس لیے ایک سال سے زیادہ کی سند کم دی جاتی تھی۔

کا مرتب کیا ہوا نصاب تعلیم جو "سلسلۂ نظامیہ" کہلاتا ہے مدت دراز سے ہندوستان ہی کا نہین سارے ایشیا کا نصاب تعلیم ہے اور علمی کمالات کے ساتھ اس مین ولایۃ نہ برکتین بھی مضمر تصور کی جاتی ہین - اور اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس قدیم زمانے مین کہان کہان اور کتنی کتنی دُور کے طلبۂ علوم لکھنؤ مین جمع رہتے ہون گے -

یورپین سیاح ٹیکٹ جو سنہ محمدی (مـ۱۶۳۱ء) یعنی شاہجہان بادشاہ کی سلطنت کے اوائل مین ہندوستان کی سیر کر رہا تھا - لکھنؤ کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ عظیم الشان منڈی ہے" عہد شاہجہانی مین یہان کے صوبہ دار سلطان علی شاہ قلی خان تھے - اُنکے دو بیٹے تھے - مرزا فاضل اور مرزا منصور - اُنھین دونون کے نام سے اُنھون نے محمود نگر سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کے دو نئے محلّے فاضل نگر اور منصور نگر آباد کیے -

اس زمانے مین یہان اشرف علی خان نام ایک رسالدار تھے اُنھون نے اسی سلسلے مین اشرف آباد بسایا - اور اُن کے بھائی مشرف علی خان نے نالے کے دوسری طرف اپنا گھر بنا کے مشرف آباد نام ایک اور محلہ قائم کیا جس کا نام مرور ایام سے اب نوبستہ ہو گیا ہے - انھین دنون پیر خان نام ایک اور فوجی افسر تھے جنھون نے ان سب محلّون سے مغرب کی طرف دُور جا کے اپنی گڑھی بنائی جو مقام آج تک "پیر خان کی گڑھی" کہلاتا ہے -

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے کسی ضرورت سے اجودھیا کا سفر کیا تھا - واپسی کے وقت لکھنؤ مین ٹھہرتا ہوا دہلی گیا - اس موقع پر اُس نے شاہ پیر محمد کے ٹیلے والی مسجد تعمیر کرائی - جو خاص لچھمن ٹیلے پر ہونے کی وجہ سے ایسی بلندی پر واقع ہے جس سے زیادہ مناسب جگہ مسجد کے لیے لکھنؤ مین نہین ہو سکتی - اور غالباً اسی موقع پہ اُس نے فرنگی محل کے مکانات علامۂ زمان مُلّا نظام الدین کی نذر کیے ہونگے -

محمد شاہ رنگیلے کے زمانے مین لکھنؤ کا صوبہ دار گردھا ناگا نام ایک بہادر ہندو رسالدار تھا - اُس کا چچا چھبیلے رام دربار دہلی کی طرف سے الہ آباد کی حکومت پر مامور تھا - چھبیلے رام کے مرنے پر گردھا ناگا نے سرکشی اختیار کی اور ارادہ کیا کہ

چچا کی جگہ زبردستی الہ آباد کا حاکم ہو جائے۔ مگر پھر خود ہی کچھ سوچ کے اُس نے اظہار اطاعت و فرمانبرداری کیا۔ اور دربار سے اُسے اودھ کی صوبہ داری کا خلعت عطا کیا گیا۔ اُس نے یہاں کی سکونت اختیار کی۔ اور اُس کی بی بی نے جو رانی کہلاتی تھی رانی کٹرہ آباد کیا۔

مگر یہاں کا حاکم اور صوبہ دار چاہے کوئی ہو شیخزادوں کا اس قدر زور تھا کہ کسی والی کو چاہے کیسا ہی زبردست ہو اور کیسی ہی سند حکمرانی لے کے آیا ہو یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ اُن کے حلقے میں قدم رکھے۔ مچھی بھون کو اگرچہ قصر امارت کی حیثیت حاصل تھی لیکن شیخزادوں نے اُسے اپنی موروثی جائداد بنا لیا تھا۔ اور دہلی سے جو والی آتا اُس کے پاس پھٹکنے نہ پاتا۔ اُنھوں نے مچھی بھون کے پاس دو اور عمارتیں تعمیر کر لی تھیں جن میں سے ایک کا نام "مبارک محلا" تھا اور دوسری کا نام "پنچ محلا" تھا پنچ محلے کی نسبت کوئی کہتا ہے کہ پنج منزلی عمارت تھی اور کوئی کہتا ہے کہ ایک دوسرے کے پاس پانچ محل بنے ہوئے تھے۔ اور اُن کے جنوب طرف ایک بڑا عمر ابدار پھاٹک تھا جو "شیخن دروازہ" کہلاتا۔ شہر سے جو لوگ شیخزادوں کی مذکورہ عمارتوں میں جانا چاہتے اسی پھاٹک میں سے ہو کے گذرتے۔

اس پھاٹک کی محراب میں بانکے شیخزادوں نے ایک ننگی تلوار لٹکا رکھی تھی اور حکم تھا کہ جو کوئی یہاں آنا چاہے کوئی ہو اور کتنا ہی بڑا شخص ہو پہلے اس تلوار کو جھک کے سلام کرے پھر آگے قدم بڑھائے۔ کس کی مجال تھی کہ اس حکم کی تعمیل میں عذر کرے؟ یہاں تک کہ دہلی سے جو والی اور حاکم مقرر ہو کے آتے تھے اور شیخوں سے ملنے جاتے تو اُنھیں بھی جبراً و قہراً اُس تلوار کے آگے ضرور سر جھکا دینا پڑتا۔

لکھنؤ کی یہ حالت تھی کہ ۱۱۴۲ھ ہجری (۱۷۳۲ء) میں نواب سعادت خان برہان الملک دربار دہلی سے اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو کے آئے۔ جن سے ہندستان کے اُس آخری مشرقی دربار کی بنیاد پڑی جس کے عروج کو ہم مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دے کے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے نمبر میں ہم نے فیض آباد کی حالت دکھائی جو اسی تمدن کا نقش اولین اور اسی مشرقی دربار لکھنؤ کا ایک ضمیمہ تھا۔ اس نمبر میں اس دربار کے قائم ہونے سے پیشتر کے لکھنؤ کی تصویر دکھا دی۔ اور اُس

بساط کو اپنے ناظرین کے پیش نظر کردیا جس پر اس دربار نے اپنی شطرنج بچھائی - آیندہ چند نمبروں میں ہم اس نیشاپوری خاندان کی تاریخ حکومت بیان کرینگے - اور اسکے بعد دکھائینگے کہ یہ تمدن کیا اور کیسا تھا -

(۳)

نواب سعادت خان برہان الملک کے خاندان کے متعلق اسی قدر بتا دینا کافی ہی کہ میر محمد نصیر نام نیشاپور کے ایک سیدزادے جن کا سلسلۂ نسب امام موسی کاظم سے ملتا ہے سنہ ۱۱۲۰ھ ہجری (۱۷۰۸ء) عہد بہادر شاہ مین وارد ہندوستان ہوے - اُن کے بڑے بیٹے میر محمد باقر ساتھ آئے تھے جنھون نے یہان شادی کرلی - اور باپ بیٹون نے ناظم بنگالہ کے زیر حمایت عظیم آباد پٹنہ مین سکونت اختیار کی - محمد باقر کو ہندوستان کی بی بی سے خدا نے ایک بیٹا دیا جو بعد کو شیر جنگ کے معزز لقب سے مشہور ہوا -

میر محمد نصیر کے آنے کے دو سال بعد اُن کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین بھی نیشاپور سے ہندوستان مین آگئے - عظیم آباد پہونچے تو سُنا کہ والد نے سفر آخرت کیا - اور اب دونون بھائی میر محمد باقر اور میر محمد امین دہلی کو روانہ ہوے - جہان پہونچ کے میر محمد امین کو شاہزادون کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا - اس مین اُنھون نے ایسی لیاقت - مستعدی - اور کارگزاری دکھائی کہ تمام لوگون مین شہرت ہوگئی - اقبال برسر یاری تھا - چند ہی روز بعد دربار شاہی کے معزز امیرون اور منصبدارون مین شامل ہوے پھر صوبہ دار اکبرآباد کی بیٹی سے نکاح ہوگیا - اور اُس اعلیٰ طبقۂ امرا مین شمار کیے جانے لگے جس پر سلطنت کی ذمہ داری کی خدمتون کے لیے انتخاب کی نظرین پڑتی تھین

اُن دنون دہلی مین ساداتِ بارہہ کا زور تھا جن سے رعیت تو رعیت خود بادشاہ سلامت ڈرتے تھے - محمد امین نے اُنکو قتل کراکے سیّدون کا زور ہمیشہ کے لیے توڑ دیا - اور لڑائی مین ایسی شجاعت دکھائی کہ دربار شاہی سے منصب ہفت ہزاری اور سات ہزار سوارون کی سرداری کے ساتھ "برہان الملک بہادر جنگ" کا خطاب عطا ہوا - اور اُسی وقت اکبرآباد کے صوبہ دار مقرر ہوے - اسکے بعد بادشاہی خواصون کی داروغگی عطا ہوئی جو بڑا معزز عہدہ تھا - اسکے تھوڑے دنون بعد وہ صوبۂ اودھ کے صوبہ دار اور اُسکے ساتھ ہی بادشاہی توپ خانے کے

دار و غہ مقرر ہوے - آدمی ہوشیار اور نہایت ہی بیدار مغز اور اسکے ساتھ بڑے بہادر اور شجاع تھے - شاہی توپخانے کو اپنے ہاتھ مین لے کے اُنھون نے ایسی زبردست قوت پیدا کر لی جیسی اُن دنون سارے ہندوستان مین کسی کو نصیب نہ تھی - اُس زمانے مین کوڑہ کے زمیندار بھگونت سنگھ نے سلطنت سے سرتابی کرکے بڑا زور باندھ رکھا تھا - اور کئی افسر جو اُس کی سرکوبی کو گئے اُسکے ہاتھ سے مارے جا چکے تھے - آخر برہان الملک اس مہم پر مامور ہوے اور یلغار کرتے ہوے پہونچے - بلونت سنگھ نے چالاکی سے اُن کو گھیر لیا اور لڑائی کا رنگ ایسا بگڑا نظر آیا کہ بڑے بڑے بہادرون کے ہاتھ پانون پھول گئے - مگر برہان الملک نے ایسی جوانمردی سے مقابلہ کیا کہ دیر تک دشمنون کے نرغے مین اُن کی لمبی سفید نورانی ڈاڑھی چمکتی اور رعب ڈالتی رہی - تھوڑی دیر مین بھگونت سنگھ اُن کے تیر کا نشانہ ہوا - اور دشمن بھاگ کھڑا ہوا -

برہان الملک کی دوسری مہم اس سے بھی زبردست تھی - اُن دنون مرہٹون کا ہندوستان مین بڑا زور تھا - اُنھون نے تاجدار دہلی سے چوتھ مقرر کرا لی تھی - اور بڑے بڑے سورما اُن کے نام سے کانپتے تھے - برہان الملک نے مرہٹون کو زبردست فوج کے ساتھ جاکے ایسی سخت شکست دی کہ اُنکے حواس جاتے رہے - نوک دُم بھاگے - اور برہان الملک نے تعاقب شروع کیا - واقعات تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس موقع پر برہان الملک زبردستی نہ روک دیے جاتے تو وہ بڑھ کے مرہٹون کا استیصال کر دیتے - اور سلطنت مغلیہ اپنے اگلے عہد شباب کی طرح سارے ہندوستان کے سیاہ و سفید کی مالک ہو جاتی - مگر اُس بدنصیب زوال پذیر سلطنت کو مٹنا ہی تھا - درباریون کی سازش اور مقربین دربار کے حسد نے برہان الملک کی رفتار کو رُکوا دیا -

اس بات نے برہان الملک کو یقین دلا دیا کہ بادشاہ مین اپنے نیک و بد کے سوچنے کی صلاحیت نہین اور اہل دربار بد دیانت و خود غرض ہین - فوراً مرہٹون سے صلح کر لی - پھر ارادہ کیا کہ اپنے صوبے مین جاکے قیام کرین اور سب سے الگ ہو کے اپنے علاقے کو مضبوط اور منتظم بنا دین - غرض برہان الملک نے دل مین

سمجھ لیا کہ اب سلطنت مغلیہ پنپنے والی نہین ہے - اپنا صوبہ لے کے الگ ہو جانا ہی مناسب ہے - اور دربار دہلی کو اُس کی قسمت پہ چھوڑ دینا چاہیے -

لکھنؤ مین جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہین شیخزادون کا زور تھا - اُنھون نے اپنی عادت کے موافق اُنھین بھی روکا - مگر برہان الملک حکمت عملی سے داخل ہوگئے اور نکسیر بھی نہ پھوٹنے پائی - برہان الملک کے لکھنؤ مین داخل ہونے کے متعلق دو روایتین مشہور ہین - ایک یہ کہ وہ برابر بڑھتے چلے آئے - یہان تک کہ اکبری دروازے پر روکے گئے - چونکہ وہ سابق کے تمام صوبہ دارون کے خلاف تجربہ کار - متین اور سنجیدہ شخص تھے - ٹھہر گئے - اور محمود نگر مین پڑاؤ ڈال دیا - دو ایک دن کے بعد شیخزادون کی دعوت کی - اُن سے بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے - لیکن جس وقت غافل شیخزادے الوان نعمت کا مزہ لوٹنے مین مصروف تھے شاہی فوج خاموشی کے ساتھ چوک مین داخل ہو رہی تھی - جو برابر بڑھتی ہی چلی گئی - یہان تک کہ مچھی بھون کے پاس جا پہونچی -

دوسری روایت یہ ہے کہ محمد خان بنگش نے برہان الملک کو بتا دیا تھا کہ لکھنؤ کے شیخزادے بڑے شورہ پشت ہین اُن سے پیش پانا آسان نہین - مگر قرب وجوار کے دوسرے شیوخ اُنکے خلاف ہین - آپ اُن لوگون سے مدد لیجیے - اور اُنھین کی مدد سے لکھنؤ والون کو زیر کیجیے - چنانچہ برہان الملک نے کاکوری مین قیام کر کے شیوخ کاکوری کو اپنے موافق بنا لیا - اُنھین کی مدد اور رہبری سے آگے بڑھے - اور یہ سُن کے کہ محمود نگر اور اکبری دروازے مین مقابلے کا سامان کیا گیا ہے اصلی راستے سے کترا کے مغرب کی طرف کٹ گئے - گئو گھاٹ کے پاس دریا کے پار اُترے اور پار کی طرف سے آہستہ آہستہ آ کے اچانک مچھی بھون پر آ پڑے - غرض جو صورت ہو - اُنھون نے بغیر اس کے کہ کوئی مزاحم ہو قلعے پہ قبضہ کر لیا -

جب مچھی بھون پہ قبضہ ہو گیا تو پھر کون دم مار سکتا تھا ؟ شیخزادون کے تمام معزز لوگون نے حاضر ہو کے عاجزی سے سر جھکا دیا - برہان الملک ہاتھی پہ سوار ہو کے شیخن دروازے مین داخل ہوے اور اُس تلوار کو جو بڑے بڑے بہادرون سے سلام لے چکی تھی اپنی تلوار سے کاٹ کے گرا دیا - پھر شیخزادون سے کہا ہمارے قیام

کے لیے مچھی بھون خالی کر دو" اس مین اُنھون نے لیت ولعل کرنا چاہی مگر نہ چلی۔ آخر ایک ہفتے کی مہلت دی گئی۔ اور اس مدت کے اندر شیوخ جو کچھ اسباب لے جا سکے اُٹھا لے گئے۔ اور جو رہ گیا اُسپر برہان الملک کے سپاہیون نے قبضہ کیا۔ قلعے مین جا کے رہنے سے پہلے اُسکے پاس ہی جہان خیمے ڈال کے وہ رہے تھے وہا ایک نوبت خانہ تعمیر کرا دیا جس مین دربار اودھ کے آخر عہد تک روزانہ چھ وقت نوبت بجتی تھی۔

اسکے بعد برہان الملک اجودھیا مین گئے اور دریا کنارے وہ بنگلہ بنوایا جسکا حال ہم بیان کر چکے ہین۔ لیکن وقتاً فوقتاً لکھنؤ مین آتے اور قیام کرتے تھے کیونکہ صوبے کا مستقر یہی شہر تھا۔ اُنکے زمانے مین یہان کئی نئے محلّے آباد ہوے۔ گریہ سب محلّے اُن کے مغل سرداران فوج کے پڑاؤ کے مقامات تھے جہان مستقل سکونت کے لیے لوگون نے مکان بنانا شروع کر دیے۔ سید حسین خان کا کٹرہ۔ ابو تراب خان کا کٹرہ۔ خدا یار خان کا کٹرہ۔ بزن بیگ خان کا کٹرہ۔ وفا بیگ خان کا کٹرہ۔ محمد علی خان کا کٹرہ۔ باغ مہا نرائن۔ سرائے معالی خان اور اسمٰعیل گنج (جو مچھی بھون کے مشرق طرف تھا اب کھد گیا) سب اسی زمانے کے محلّے یا برہان الملک کے سرداران فوج کی لشکر گاہین ہین۔

نواب برہان الملک چھ ہی برس اودھ اور لکھنؤ مین رہنے پائے تھے کہ سنہ ۱۱۵۱ھ (سنہ ۱۷۳۸ء) مین نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اور وہ نہایت ہی تاکید کے ساتھ دہلی مین بلائے گئے۔ اُس پُر فتن زمانے مین جو کچھ واقعات گذرے اُن کو لکھنؤ سے تعلق نہین۔ لکھنؤ مین اپنا نائب اور قائم مقام بنا کے وہ اپنے بھانجے اور داماد صفدر جنگ کو چھوڑ گئے تھے۔ نادر دہلی کو لوٹ چکا تھا اور قتل عام کرا چکا تھا مگر ابھی وہین تھا کہ نواب برہان الملک نے دہلی مین وفات پائی۔ اُنکے بھتیجے شیر جنگ نے نادر شاہ سے سفارش اُٹھوائی کہ نواب مرحوم کے بعد اودھ کی صوبیداری اُنھین دی جائے۔ لیکن راجہ لچھمی نرائن نے جو برہان الملک کے معتمد عہدہ دارون مین تھا نادر کی خدمت مین اس مضمون کی ایک عرضداشت پیش کر دی کہ "نواب برہان الملک شیر جنگ سے خوش نہ تھے۔ اور اسی لیے اُنھون نے اپنی بیٹی اُنکو چھوڑ کے صفدر جنگ

دی جو اُن کی نیابت کرتے تھے اور اس وقت بھی اُن کی طرف سے وہان موجود ہین برہان الملک کے مال و اسباب کی مالک سرکار ہے - جسے چاہے عطا کرے - اس لیے کہ کوئی وارث نہین ہے - یہ بھی عرض ہے کہ صفدر جنگ بُردبار - خدا ترس - لائق اور وعدے کے سچے ہین - اور سپاہ اُن سے خوش ہے - قطع نظر اسکے حضور کے لیے بُرہان الملک نے دو کرور روپے کی رقم کا وعدہ کیا تھا اُسکے ادا کرنے کا انتظام نواب صفدر جنگ نے کر لیا ہے - جس وقت حکم ہو حاضر کیے جائین - ان وجوہ سے امید ہے کہ حضور اُنھین کی سفارش فرمائین گے" یہ عرضداشت دیکھتے ہی نادر شاہ نے صفدر جنگ کے لیے محمد شاہ سے خود ہی خلعتِ صوبہ داری لے لیا - اور اپنے ایک مصاحب اور دو سو سوارون کے ساتھ اودھ مین صفدر جنگ کے پاس بھیجا - یون خلعت صوبہ داری ہین کے صفدر جنگ نے وہ دو کرور کا نذرانہ نادر کے پاس بھیجوا دیا - اور اپنے علاقے پر حکومت کرنے لگے -

صفدر جنگ کا پورا نام مرزا مقیم ابو المنصور خان صفدر جنگ تھا - گو اُن مین برہان الملک کی سی سچی بہادری - سادگی - راست بازی - اور جفاکشی نہ تھی مگر نہایت فیاض - بلند حوصلہ - رحمدل - رعایا پرور - اور منتظم تھے - شہر سے تین میل کی مسافت پر اُنھون نے قلعۂ جلال آباد تعمیر کرایا - اور مچھی بھون کے اندر پنچ محلے کی جو قدیم عمارت تھی اُسے بھی شیخزادون سے لے لیا - اور اُسکے عوض مین دوگا نوان مین ۰۰ ۷ ایکڑ زمین شیخزادون کو رہنے اور بسنے کے لیے عطا کی - جس سے اگرچہ شیخزادون پر ظلم ہوا مگر لکھنؤ کی آبادی کو وسعت اور ترقی حاصل ہوئی - مچھی بھون کو صفدر جنگ نے از سر نو تعمیر کرایا اور اُسے بہت درست کیا -

لیکن صفدر جنگ پانچ ہی برس اپنے صوبے مین رہنے پائے تھے کہ دہلی مین اُنکی طلبی ہوئی - اور راجہ نول رائے کو اپنی نیابت پر لکھنؤ مین چھوڑ کے وہ دہلی چلے گئے - نول رائے علم دوست - وقت کا پابند - جفاکش - بہادر اور بہت بڑا منتظم تھا - اور اسکے ساتھ اُسے خدا نے اپنے آقا کی سی اُلوالعزمی اور فیاضی بھی دی تھی - اُس نے ارادہ کیا کہ مچھی بھون کے سامنے دریا پر ایک پُل تعمیر کرے - پایون کی بنیاد ڈالنے کے لیے گہرے کنوئین کھُدوائے - لیکن پائے بننا شروع نہین ہوئے تھے کہ اپنے

آقا کی طلب پر اُسے احمد خان بنگش کے مقابلے کے لیے جانا پڑا۔ اس مہم پر وہ بڑی زبردست فوج لے کے گیا۔ مگر مارا گیا۔ اور پُل کا کام جو چھوڑا تھا ناتمام پڑا رہ گیا۔
احمد خان بنگش اُس زمانے کا بہادر ترین شخص تھا۔ اُسکے مقابلے کے لیے بُرہان الملک کی ضرورت تھی۔ صفدر جنگ اُسکے حریف مقابل نہ ہو سکتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ احمد خان کی اور اُنکے ساتھ افاغنہ کی قوت ترقی کر تی گئی۔ صفدر جنگ نے لاکھ ہاتھ پاؤن مارے۔ خود شہنشاہِ دہلی تک کو اُسکے مقابلے پر لا کے کھڑا کر دیا۔ مگر اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اور اُسکے اشارے سے حافظ رحمت خان نے اودھ کے شہرون اور قصبون مین لوٹ مار شروع کر دی۔ خیر آباد پر قبضہ کر لیا۔ اور خود احمد خان بنگش کا بیٹا محمود خان فوج لے کے چلا کر لکھنؤ پر قبضہ کر لے۔ سنہ ۱۱۶۳ ہجری (سنہ ۱۷۵۰ء) مین پٹھانون نے ملیح آباد مین اپنا تھانہ قائم کیا۔ اور سنہ ۱۱۶۴ (سنہ ۱۷۵۱ء) مین محمود خان کا کوئی عزیز بیس ہزار فوج لے کے لکھنؤ کی طرف چلا۔ شہر کے باہر پڑاؤ ڈالا۔ اور اپنا ایک کوتوال مقرر کر کے شہر مین بھیجا۔ صفدر جنگ کے آدمیون سے شہر خالی تھا جو چند تھے بھی پٹھانون کے آنے کی خبر سُن کے بھاگ کھڑے ہوے۔ اور پٹھانون کے کوتوال نے شہر مین آ کے بے اعتدالیان شروع کر دین۔
ان دنون شیخزادگان لکھنؤ مین سب سے زیادہ سربرآوردہ شیخ معزالدین تھے۔ وہ افاغنہ کے سردار سے شہر کے باہر جا کے ملے۔ اُسی وقت کسی نے اُس سے جا کے شکایت کی کہ شہر والے آپ کے کوتوال کی تحقیر و توہین کرتے ہین۔ اور کوئی اُس کا حکم نہین مانتا۔ شیخ معزالدین بولے "کیا مجال ہے کہ کوئی ایسی گستاخی کرے۔ مین جاتا ہون مفسدون کو سزا دون گا"۔ یہ کہہ کے واپس آئے اور بھائی بندون کو بُلا کے کہا "پٹھانون کے قول و فعل کا اعتبار نہین۔ بہتر یہ کہ ہم نواب صفدر جنگ کا ساتھ دین۔ اور مقابلہ کر کے پٹھانون کو یہان سے نکال دین"۔ اسکے بعد شیخ معزالدین نے گھر کا زیور بیچ کے فوج جمع کی اور سارے شیخزادون کو لے کے کوتوال پر حملہ کیا۔ وہ اپنی جان لے کے بھاگا۔ اور شیخ صاحب نے کسی مغل کو درباری لباس پہنا کے اپنے مکان مین بٹھا دیا۔ اور منادی کرا دی کہ صفدر جنگ نے اپنی طرف سے اس مغل کو کوتوال بنا کے بھیجا ہے۔ اسکے سا

علی کے نام کا ایک سبز جھنڈا کھڑا کیا اور لوگ اُس کے نیچے آ آ کے جمع ہونے لگے۔
یہ حالات سُن کے پٹھانوں نے حملہ کر دیا۔ شیخزادوں نے جان توڑ کے مقابلہ کیا۔
اور اپنی پرانی شجاعت دکھا دی۔ پٹھان مقابلے کی تاب نہ لا سکے۔ پندرہ ہزار فوج
کے ساتھ بھاگ گئے۔ اور موقع پا کے شیخزادوں نے پٹھانوں کو سارے ملک اودھ سے
نکال باہر کیا۔

دو سال بعد جب احمد خان بنگش سے صلح ہو گئی تو ۱۱۶۵ھ ہجری (۱۷۵۲ء) میں
نواب صفدر جنگ پھر لکھنؤ میں آئے اور مہندی گھاٹ پر آ کے ٹھہرے۔ ایک خاص
مکان اپنے رہنے کے لیے بنوایا اور بنجا۔ اور سپاہ کی درستی میں مصروف ہوئے لیکن
اسکی مہلت نہ ملی۔ اسی سال سلطان پور کے قریب پاپڑ گھاٹ میں پڑاؤ تھا کہ انتقال
کیا۔ لاش پہلے فیض آباد کی گلاب باڑی میں لے جا کے زمین کے سپرد کی گئی۔ پھر تھوڑے
دنوں کے بعد ہڈیاں دہلی میں بھیجکے دفن کی گئیں جن پر نہایت ہی عالیشان مقبرہ
موجود ہے۔ اور سیاحان ارض اُسے آج تک عبرت و عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

(۴)

صفدر جنگ منصور علی خان کے انتقال کے بعد ۱۱۶۶ھ ہجری (۱۷۵۳ء) میں اُنکے بیٹے
نواب شجاع الدولہ مسند نشین ہوئے۔ جن کے کچھ حالات اس مضمون کے پہلے حصے میں
بیان ہو چکے ہیں۔ وہ ایک مضطرب اور بیقرار طبیعت کے اولوالعزم فرمانروا تھے۔
لیکن بدقسمتی سے اُن کا عہد بڑے بڑے فتنوں اور یادگار زمانہ انقلابوں سے بھرا
ہوا تھا۔ دنیا کی دو زبردست تاریخی قوموں اور قوتوں کی قسمت کا فیصلہ اُنھیں
کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ پہلے پانی پت کی محشر انگیز لڑائی ہوئی۔ جس میں احمد شاہ
درانی۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے ساتھ خوانین روہیلکھنڈ کی تمام زبردست
فوجیں ایک طرف تھیں اور مرہٹوں کا ٹیری دل دوسری طرف۔ اس لڑائی نے
۱۱۷۴ھ ہجری (۱۷۶۱ء) میں ایک ہی دن کے اندر فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان چاہے
مسلمانوں کا رہے یا نہ رہے مگر مرہٹوں کا نہیں ہو سکتا۔ اسکے بعد بکسر کا قیامت خیز
میدان گرم ہوا جس میں انگریزوں کی باقاعدہ فوج ایک طرف تھی اور شجاع الدولہ
کا لشکر کثیر ایک طرف۔ اس لڑائی نے جنگ پانی پت کے چار سال بعد ۱۱۷۸ھ ہجری

(سنہ ۱۷۶۴ء) مین چوبیس گھنٹے کے اندر اس بات کا تصفیہ کر دیا کہ ہندوستان اب مسلمانون کا نہین انگریزون کا ہے -

ان لڑائیون سے پہلے شجاع الدولہ اگرچہ لکھنؤ ہی مین رہے مگر بڑی بڑی پولیٹکل مشغولیتون - اور فوجی اصلاحون سے اُنھین اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ شہر کی ترقی و آرایش کی طرف توجہ کرین - اُنھون نے قلعے بنوائے - گڑھیان قائم کین - فوجی سامان اور آلات جنگ کو فراہم کیا - اسکی فرصت نہ ملی کہ اپنے گھر کو درست اور اپنے شہر کو آراستہ کرین - بکسر کی لڑائی کے بعد جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہین وہ فیض آباد مین جا کے اقامت گزین ہو گئے - اس لیے لکھنؤ اُنکی برکتون سے محروم رہ گیا - سنہ ۱۲۰۴ ہجری (سنہ ۱۷۷۵ء) مین اُنھون نے سفر آخرت کیا اور نواب آصف الدولہ اُنکے جانشین ہوے -

آصف الدولہ نے مسند حکومت پر قدم رکھتے ہی ان سے ناراض ہو کے لکھنؤ کی راہ لی - اور یہی وہ زمانہ ہے جب سے دربار اودھ کی قوت فرمان روائی گھٹنے اور لکھنؤ کی ظاہری رونق بڑھنے لگی - بکسر کا میدان جیتنے کے بعد انگریزون نے دربار اودھ مین دخل دہی کے بہت سے حقوق حاصل کر لیے تھے - جن کی بنا پر یہان فوجی ترقیون کی روک ٹوک کی جاتی اور ہمیشہ غائر نظر سے اس بات کی نگرانی کی جاتی کہ حکومت اودھ کو پھر ایسی قوت نہ حاصل ہونے پائے کہ اُسکی فوجین دوبارہ انگریزی لشکر کے سامنے صف آرا ہو سکین - تاہم شجاع الدولہ جب تک فیض آباد مین زندہ رہے فوجی اصلاح ہی مین مصروف رہے - اور رات دن اسی بات کی دُھن تھی کہ جس طرح بنے اپنی قوت کو بڑھائین - چنانچہ منشی فیض بخش اپنی تاریخ فرح بخش مین اسی زمانے کا چشم دید حال بیان کرتے ہین کہ "جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے شجاع الدولہ کی فوج کی بندوقون کے مقابلے مین انگریزی فوج کی بندوقین کوئی وقعت نہ رکھتی تھین" -

لیکن آصف الدولہ کا عہد شروع ہوتے ہی یہ سب باتین تشریف لے گئین - انگریزون نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے دخل دہی کے حقوق کو بڑھانا شروع کیا - اور نہایت ہی دانائی سے آصف الدولہ کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ فوجی اصلاح

کی طرف سے بے پروا ہوکے دوسرے مشاغل میں جی بہلائیں۔ آصف الدولہ کو خود بھی فوج کا زیادہ شوق نہ تھا۔ انھیں لٹانے، اور مزے اُڑانے کے لیے روپے کی ضرورت تھی، جو بغیر فوج کے موقوف کیے پوری نہ ہوسکتی تھی۔ اس لیے اُنھوں نے تھوڑی سی فوج رکھ لی۔ باقی سب کو معزول کردیا۔ اور عیش و عشرت میں مصروف ہوگئے۔ وہ اپنے مغربی دوستوں کے اطاعت کیش دوست تھے۔ جو اُنکے اشاروں پر چلتے اور اُنکے مشوروں کے آگے کسی کی نہ سنتے۔

اس خلوص عقیدت کے صلے میں انگریزوں نے روہیلکھنڈ پر اُن کا قبضہ کرادیا اپنی ماں بہو بیگم صاحبہ کے ستانے اور لوٹنے کے لیے جب اُنھوں نے انگریزوں سے مدد مانگی تو نہایت فیاضی کے ساتھ انھیں اخلاقی مدد دی گئی۔ اور اُنکی طرفداری کی گئی۔ لیکن اسپر بھی اُنکے زمانے تک اُنھیں یا لکھنؤ کی رعایا کو بہت ہی کم محسوس ہو سکا کہ ہمارے نظم و نسق میں کسی بیرونی قوت کو دخل ہے۔ جس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست و عشرت طلب بنادیا تھا۔ اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے آگے انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی۔

اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہری صورت میں اُن دنوں لکھنؤ کے دربار میں ایسی شان و شوکت پیدا ہوگئی جو کہیں اور کسی دربار میں نہ تھی۔ اور ایسا سامان عیش جمع ہوگیا تھا جو کسی جگہ نہ نظر آتا۔ اُن دنوں شہر لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کرسکتا ہوگا شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں میں صرف کرتے تھے اُسے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرائش و خوشحالی میں صرف کرنا شروع کردیا اور چند ہی روز کے اندر ساری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں جمع کرلی۔ اُن کا حوصلہ بس یہی تھا کہ نظام حیدرآباد ہوں یا ٹیپو سلطان کسی دربار کا کروفر اور کسی کی شوکت و حشمت میرے دربار سے زیادہ نہ ہوسکے۔

اپنے بیٹے وزیر علی خاں کی شادی میں اُنھوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک و احتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس میں

بارہ سو ہاتھی تھے۔ دولھا جو شاہی خلعت پہنے تھا اُس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ محفل طرب کے لیے دو عظیم الشان اور پُر تکلف خیمے بنوائے گئے جن میں ہر ایک ۶۰ فٹ چوڑا ۱۲۰۰ فٹ لمبا اور ۶۰ فٹ بلند تھا۔ اور ایسا عمدہ نفیس و قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ اُن دونوں کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپے صرف ہو گئے۔

اُنھوں نے دریا کنارے مچھی بھون کے مغرب طرف دولت خانہ۔ رومی دروازہ۔ اور اپنا کیا ئے روزگار امام باڑہ تعمیر کرایا۔ سنہ ۱۲۱۲ محمدی (سنہ ۱۷۸۴ع) میں اودھ میں قحط پڑ گیا تھا۔ اور شرفائے شہر تک فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔ اس نازک موقع پر رعایا کی دستگیری کے لیے امام باڑے کی عمارت چھیڑ دی گئی۔ چونکہ شریف لوگ دن کو مزدوری کرنے میں اپنی بیعزتی خیال کرتے تھے اس لیے تعمیر کا کام دن کی طرح رات کو بھی جاری رہتا۔ اور غریب وفاقہ کش شرفائے شہر رات کے اندھیرے میں آکے مزدوروں میں شریک ہو جاتے اور مشعلوں کی روشنی میں کام کرتے۔ اس عمارت کو نواب نے جیسے خلوص عقیدت اور جوش دینداری سے بنوایا تھا ویسے ہی خالص اور سچے ولی جوش سے لوگوں نے تعمیر بھی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی نفیس اور شاندار عمارت بن کے تیار ہو گئی جو اپنی نوعیت میں بے مثل اور نادر روزگار ہے۔ اُس کا نقشہ بنانے کے لیے بڑے بڑے مشہور مہندس اور معمار بلائے گئے۔ اور سب نے کوشش کی کہ ہمارا نقشہ دوسروں کے مجوزہ نقشے سے بڑھ جائے۔ مگر کفایت اللہ نام ایک بے مثل زمانہ معمار کا نقشہ پسند کیا گیا۔ اور اُسی کے مطابق عمارت بننا شروع ہو گئی۔ جو ۱۶۲ فٹ لمبی ۵۳ فٹ چوڑی ہے۔ اینٹ اور نہایت اعلیٰ درجے کے چونے سے یہ عمارت بنائی گئی۔ جس میں فرش سے چھت تک لکڑی کا نام نہیں ہے۔ اس عمارت کو شاہان مغلیہ کی سنگین عمارتوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ لکھنؤ میں اُس کثرت سے سنگ مرمر دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن امام باڑے اور آصف الدولہ کی دوسری عمارتوں کو دیکھیے تو ایک نئی خوشنمائی اور نرالی عظمت وشان رکھتی ہیں۔ امام باڑے کے لداؤ کی چھت جو کڑ ڈاوے کے بنائی گئی ہے اتنی بڑی ہے کہ اتنی بڑی لداؤ کی چھت ساری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی دنیا کی اعجوبہ روزگار کاریگریں

مین شمار کی جاتی ہے۔

آصف الدولہ کی عمارتون پر یورپ کی عمارتون کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ وہ اپنی نوعیت مین خالص ایشیائی ہین جن مین نمایشی نہین اصلی وحقیقی شان وشوکت پائی جاتی ہے۔ نواب آصف الدولہ کے بعد یہ عمارتین کس مپرسی مین پڑی رہین۔ غدر کے بعد انگریزون نے اُن پر قبضہ کرکے گرد و پیش کے مکانون کو منہدم کر دیا۔ اور سوا اُس جانب کے جدھر دریا ہے باقی تینون طرف میدان کرکے امام باڑے کو قلعہ اور رومی دروازے کو اُس کا پھاٹک بنا لیا۔ اُس زمانے مین اس امام باڑے مین گورے رہتے تھے۔ اسکے بڑے ہال مین سلح خانہ تھا۔ اور اُسکے فرش پر بڑی بڑی توپین دوڑتی پھرتی تھین۔ مگر نہ کبھی زمین کھدی نہ در و دیوار کی کوئی چیپ اُکھڑی۔ اب سرکار انگریزی نے امام باڑے کو چھوڑ کے پھر مسلمانون کے حوالے کر دیا ہے۔ اسکی مسجد مین ایک مجتہد صاحب نماز پڑھاتے ہین اور امام باڑے مین تعزیہ داری ہوتی ہے۔

نواب آصف الدولہ کی عمارتون کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُنھین تعمیر ہوے اگرچہ سوا سو برس سے زیادہ کی مدت گذر گئی مگر آج تک اُسی عظمت و شکوہ اور اُسی مضبوطی و پائداری سے اپنی جگہ پر قائم ہین۔ نہ کوئی اینٹ اپنے مقام سے ہٹتی ہے اور نہ کسی جگہ چونے نے اینٹون کو چھوڑا ہے۔ بہ خلاف اُن کے دیگر شاہانِ اودھ نے کرورون روپیہ صرف کرکے جو عمارتین بعد کو بنوائین وہ قومی و ملکی وضعداری کے مفقود ہو جانے کے علاوہ نہایت کمزور ہین۔ اور اگر وقتاً فوقتاً مرمت نہ ہوتی رہتی تو آج تک کب کی منہدم ہو چکی ہوتین۔

آصف الدولہ امام باڑے اور مچھی بھون کے متصل اپنے محل "دولت خانے" مین رہتے تھے۔ شہر کے باہر اور دریا پار ہجوم خلائق سے دُور اور دنیوی جھگڑون سے الگ رہ کے مصروف عیش ہونے کے لیے بیبیاپور کا محل بنوایا۔ اکثر جب وہ سیر شکار کے لیے جاتے تو اسی مکان مین قیام کرتے۔ اسی طرح چنہٹ مین ایک پُر فضا و نزہت بخش مکان۔ اور چارباغ اور عیش باغ مین کوٹھیان بنوائین۔ اور اسی زمانے مین سیتی گنج بنی اور اُسکے متصل اصطبل بنے۔ پھر محلہ وزیر گنج قائم ہوا جو آصف الدولہ کے بیٹے وزیر علی خان کی قیام گاہ ہونے کے باعث اُنھین کی طرف منسوب اور

اُنھین کی یادگار رہے۔

اب لکھنؤ مین حاکم اور فرمان روا کے مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جانے کی وجہ سے عام خلقت کا رُخ لکھنؤ کی طرف پھر گیا۔ جو لوگ شجاع الدولہ کے زمانے مین فیض آباد مین بس گئے تھے اُنھون نے فیض آباد کو چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ مین آ آ کے بسنا شروع کیا۔ دوسری طرف دہلی کے لوگ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کہہ کے سیدھے لکھنؤ مین آتے تھے اور پھر واپس جانا نہ نصیب ہوتا تھا۔ خلقت کے اس ہجوم نے نئے محلّے آباد کرنا شروع کر دیے۔ اس لیے کہ باہر کے آنے والون مین سے جسے جہان جگہ مل جاتی آباد ہو جاتا۔ اور سیکڑون نئے محلّے آباد ہوتے چلے جاتے۔

چنانچہ آغا میر کی ڈیوڑھی ... چنانچہ آمانی گنج۔ فتح گنج۔ رکاب گنج۔ نخاس۔ دولت گنج۔ بیگم گنج۔ نواب گنج۔ خانساماں کا احاطہ (جسے نواب آصف الدولہ کے ایک خانگی داروغہ نے آباد کیا۔ اور افتتاح کی تقریب مین خود اُنھین بُلایا) ٹکیت گنج۔ ٹکیت رائے کا بازار (جو وزیر اعظم مہاراجہ ٹکیت رائے کی جانب منسوب ہین) ترمنی گنج۔ ٹکری یا ٹکلی حسین الدین خان کی چھاؤنی۔ حسن گنج۔ آڈلی۔ بھوانی گنج۔ بالکس گنج۔ کشمیری محلہ۔ صبورت سنگھ کا احاطہ۔ نواز گنج۔ تحسین گنج۔ خدا گنج۔ نگریا (جس کی نواب آصف الدولہ کی ماں جو بیگم صاحبہ نے اُسی دن بنیاد ڈالی جس دن دریا پار خود اُنھون نے علی گنج کی بنیاد رکھی تھی) عنبر گنج۔ محبوب گنج۔ توپ دروازہ۔ خیالی گنج۔ جھاؤ لال کا پُل (ان دونون محلون کے بانی راجہ جھاؤ لال سلطنت اودھ کے وزیر خزانہ تھے) یہ سب وہ محلّے ہین جو عہد آصفی مین بسے اور تعمیر ہوے۔ اور انھین دنون دریا کے پار حسن رضا خان نے حسن گنج بسایا۔

نواب آصف الدولہ کی فیاضیون کی خاص و عام مین شہرت تھی۔ دور دور کے شہرون مین اُن کی داد و دہش کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ لوگ اُٹھتے بیٹھتے عزت و محبت کے ساتھ اُن کا نام لیتے۔ اور اُنکے تمام ذاتی عیوب فیاضی کے دامن مین چھپ کے نظرون سے غائب ہو گئے تھے۔ اور عوام کو نواب کی صورت مین ایک عیش پرست فرمان روا نہین بلکہ ایک بے نفس اور درویش صفت ولی نظر آتا۔ ہندو دکاندار آج تک صبح کو آنکھ کھُلتے ہی جوش عقیدت سے کہتے ہین "یا آصف الدولہ ولی!"

اُسی زمانے مین جنرل کلاڈ مارٹن نام ایک بہت بڑا دولتمند فرانسیسی تاجر لکھنؤ مین آکے رہ پڑا تھا - اُس نے ایک نہایت ہی عالیشان کوٹھی کا نقشہ بنا کے نواب آصف الدولہ کے ملاحظے مین پیش کیا - نواب نے اُسے اس قدر پسند کیا کہ اسکی قیمت مین دس لاکھ اشرفیان دینے کو تیار ہوگئے - بیع کا معاہدہ تکمیل کو نہین پہونچنے پایا تھا کہ نواب آصف الدولہ نے سفر آخرت کیا - اور عمارت ہنوز تکمیل کو نہین پہونچی تھی کہ خود مسیو مارٹن دنیا سے رخصت ہوگئے - اُنھون نے چونکہ دولت بے پایان چھوڑی تھی اور وارث کوئی نہ تھا اس لیے مرتے وقت وصیت کردی کہ میری لاش اسی کوٹھی کے اندر دفن کی جائے تاکہ میرے بعد اُسے حکمرانان اودھ ضبط نہ کرسکین - اس عمارت کا نام اُنھون نے کانسٹین شیا (قسطنطنیہ) قرار دیا تھا - مگر عوام مین وہ آج کل "مارٹین صاحب کی کوٹھی" مشہور ہے - اور دیکھنے کے قابل ہے - مرنے کے بعد وہ اسی کوٹھی مین دفن ہوے - وہ مدرسہ آج تک جاری ہے جس سے بہت سے طلبہ کو کھانا اور کپڑا ملتا ہے - مگر سنتے ہین کہ مارٹن صاحب نے اس اسکول اور اسکے وظائف کو کسی مذہب اور قوم کے ساتھ مخصوص نہین کیا تھا - بلکہ وصیت کی تھی کہ عیسائی - ہندو مسلمان سب ہی یکسان طور پر اس سے فیض یاب ہو سکتے ہین لیکن اب یہ مدرسہ صرف یوروپین بچون کے لیے مخصوص ہے - کسی ہندوستانی کو وظیفہ ملنا درکنار اُس کی تعلیم مین بھی شریک نہین کیا جاتا - شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ غدر کے زمانے مین جاہل و پرجوش بلوائیون نے قبر کھود کے مسٹر مارٹن کی ہڈیان نکال لین اور اُنھین ادھر اُدھر پھینک دیا - انگریزون کو بعد تسلط اتفاقاً ایک ہڈی مل گئی جو پھر اُسی خاک مین دبا دی گئی - لیکن اُن بلوائیون کے فعل کے ذمہ دار عام ہندوستانی نہین ہو سکتے -

۱۲۱۲ھ ہجری (۱۷۹۷ء) مین نواب آصف الدولہ نے سفر آخرت کیا - اور اُنکی جگہ نواب وزیر علی خان مسند نشین ہوے - جن کی شادی کی دھوم دھام کا حال ہم بتا چکے ہین - مگر چار ہی مہینے مین اُن سے ایسے بیہودہ اور قابل نفرت حرکات ظاہر ہوے کہ اکثر لوگ اُن سے ناراض تھے - خود بہو بیگم صاحبہ اُنکے مقابل اپنے سوتیلے بیٹے یمین الدولہ نواب سعادت علی خان کو زیادہ پسند کرتی تھین - ادھر اس خبر

کی شہرت ہوئی کہ وزیر علی خان آصف الدولہ کے بیٹے ہی نہیں ہیں - کیونکہ آصف الدولہ کی نسبت بہتون کا خیال تھا کہ پیدائشی عنّین تھے -

نواب سعادت علی خان آصف الدولہ کی مخالفت کے باعث اُنکے زمانے مین مدتون قلمرو سے باہر اور دور رہتے تھے - مدتون کلکتے مین رہے اور ایک زمانۂ دراز تک بنارس مین قیام رہا - وزیر علی خان کی نسبت یہ خیال قائم ہونے کے بعد قرعۂ انتخاب نواب سعادت علی خان پر پڑا - وہ بنارس سے لائے گئے اور بیبیاپور کی کوٹھی مین خود گورنر جنرل بہادر نے دربار فرما کے وزیر علی خان کی معزولی اور نواب سعادت علی خان کی مسند نشینی کا فیصلہ کیا - وزیر علی خان فوراً گرفتار کر کے بنارس بھیج دیے گئے - جہان اُنھون نے طیش مین آ کے مسٹر چیری کو مار ڈالا - اور اسکی سزا مین گرفتار کر کے چنار گڑھ بھیجے گئے اور وہین مرے - اُن کی مصیبتون اور سرگردانیون کا ایک بڑا بھاری قصہ مشہور ہے - جس کا یہ مختصر مضمون متحمل نہین ہو سکتا -

(۵)

نواب سعادت علی خان نے سنہ ۱۲۱۲ھ محمدی (سنہ ۱۷۹۸ء) مین تخت پر بیٹھتے ہی آدھا ملک انگریزون کی نذر کر دیا - مشہور ہے کہ وہ سلطنت سے مایوس و نا امید بنارس مین پڑے ہوے تھے کہ خبر پہونچی نواب آصف الدولہ بہادر نے سفر آخرت کیا اور مسند حکومت پر وزیر علی خان بیٹھ گئے - یہ سنتے ہی سلطنت کی رہی سہی اُمیدین بھی خاک مین مل گئین اس قطعی یاس کے عالم مین تھے کہ بنارس کے کسی یوروپین حاکم نے آ کے پوچھا - "نواب صاحب! اگر آپ کو اودھ کی حکومت مل جائے تو انگریزی حکومت کو کیا دیجیے گا؟" جو چیز ہاتھ سے جا چکی ہو انسان کے دل مین اُسکی قدر ہی کیا ہو سکتی ہے بے اختیار زبان سے نکلا "آدھا ملک انگریزون کی نذر کر دون گا" یہ وعدہ سُن کے اُس انگریز حاکم نے کہا "تو آپ خوش ہون - اور مین آپ کو خوشخبری سناتا ہون کہ آپ ہی فرمانروائے لکھنؤ منتخب ہوے ہین" سعادت علی خان یہ مژدۂ غیر مترقبہ سُن کے خوش تو ضرور ہوے مگر اپنے وعدے کا خیال آیا تو ایک سناٹے مین آ گئے - اور آخر تخت نشینی کے بعد اس وعدے کے ایفا مین اُنھین اپنی آدھی قلمرو بانٹ دینا پڑی جس کا کانٹا زندگی بھر اُن کے دل مین کھٹکتا رہا -

انگریزی تاریخون مین اُن سے وعدہ لیے جانے کا تو ذکر نہین ہے مگر اس کو سب تسلیم کرتے ہین کہ نواب سعادت علی خان کو چونکہ انگریزون نے تخت پر بٹھایا تھا اس لیے اُنھون نے اپنا آدھا ملک شکریے کے طور پر انگریزون کی نذر کر دیا۔ ہر تقدیر جو کچھ ہو سعادت علی خان کی تخت نشینی کے وقت اودھ کی حکومت آدھی رہ گئی۔ لکھنؤ کے پرانے لوگون مین مشہور ہے کہ اسی کو فت مین سعادت علی خان نے نہایت ہی کفایت شعاری سے کام لے کے اور تحصیل وصول مین بے انتہا مستعدی و بیدار مغزی ظاہر کر کے بائیس تیئیس کروڑ روپیہ جمع کیا۔ اور انگلستان مین برٹش گورنمنٹ سے مراسلت کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت کا ٹھیکہ بعوض ایسٹ انڈیا کمپنی کے اُنکو دے دیا جائے۔ اور معاہدے کی تکمیل ہونے ہی کو تھی کہ اُنکے سالے نے کسی سازش مین شریک ہو کے زہر دے دیا۔ اور وہی مثل پوری ہوئی کہ ع

آن قدح بشکست و آن ساقی نماند۔

یہ اور اسی قسم کے بیسیون واقعات مشہور ہین جن کا ثبوت سوا افواہی روایتون کے اور کچھ نہین مل سکتا۔ لیکن اس مین شک نہین کہ سعادت علی خان اس قدر جُزرس اور منتظم واقع ہوے تھے کہ اُن کے سے حاکم نے قلمرو کا کوئی جُز آسانی سے نہ دیا ہوگا۔ دوسرے اُنکے طرز عمل اور اُنکی پالیسی مین ایک ایسی مضطربانہ ہوشیاری اور پُر اسرار بیقراری نظر آتی ہے کہ چاہے پتہ نہ چلے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والے تھے۔ اور اُنکے تیور بہت ہی پُر معنی تھے۔

ملک کو بانٹ دینے کی وجہ سے اُنھین سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ سلطنت کی نصف آمدنی گھٹ گئی۔ اور آصف الدولہ مرحوم نے مصارف حد سے زیادہ بڑھا رکھے تھے۔ چنانچہ اُنھین دربار کے مصارف گھٹانا پڑے جو نہایت ہی مشکل چیز تھی اس کوشش مین اُنھون نے حسابات کی جانچ کی۔ ادنیٰ ادنیٰ رقمون پر نظر ڈالی۔ معافیون اور جاگیرون کی نہایت سختی کے ساتھ چھان بان کی۔ دربار کے مصارف مین جہان تک بنا کمی کی۔ غرض جس طرح ہو سکا بدنامیان اُٹھا کے اور لوگون پر سخت بے رحمیان کر کے اُنھون نے سلطنت کی آمدنی بڑھائی اور خرچ گھٹایا۔

یہ کارروائیان دیکھ کے ذی ہوش اور منصف مزاج لوگ تو سعادت علی خان

کی لیاقت اور خوش تدبیری کے قائل ہو گئے۔ مگر عوام مین بے انتہا ناراضی پھیلی۔ ایک طرف اُن معافی دارون اور جاگیر دارون کا گروہ شاکی تھا جن کی جائدادین منضبط ہوئی تھین۔ دوسری طرف وہ فضول اور از کار رفتہ ملازمین روتے پھرتے تھے جن کی جگہین تخفیف مین آگئی تھین۔ اسی قدر نہین۔ ملک مین ایک بڑا بھاری گروہ اُن لوگون کا بھی تھا جو وزیر علی خان کے طرفدار تھے۔ اُن کو جائز اور سچا حقدار سلطنت خیال کر کے سعادت علی خان کو غاصب بتاتے تھے۔ غرض ملک مین ہزارون دشمن تھے جن سے خطرہ تھا کہ نواب کی جان پر حملہ نہ کر بیٹھین۔ رعایا کے علاوہ فوج بھی نئے نواب سے نہایت ہی ناراض تھی۔ بیشمار فوج کا ٹیری دَل جو نواب شجاع الدولہ کے عہد مین جمع تھا اُس مین آصف الدولہ ہی کے زمانے سے سرکار انگریز بہادر کے مشورے سے تخفیف شروع ہو گئی تھی۔ مگر آصف الدولہ کی فیاضیون اور فضول خرچیون نے بہلائے رکھا۔ اور شکایت کی آواز زیادہ نہین بلند ہونے پائی۔ سعادت علی خان نے جب زیادہ تخفیف کی اور اُسکے ساتھ جزرسی بھی اختیار کی تو ہر طرف ہائے ہائے پڑ گئی۔ اور جو تھا اُن کی جان کو رو رہا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی جان کی حفاظت کے لیے سرکار انگریزی کو ضرورت معلوم ہوئی کہ انگریزی باضابطہ فوجی گارڈ خاص شہر کے اندر رکھا جائے۔ کیونکہ شہر کے مفسدون اور سرکشون کی سرکوبی کے لیے اور نیز امن و امان قائم رکھنے کی غرض سے ایک بڑا زبردست قوت کا ہر وقت شہر مین موجود رہنا بہت ہی ضروری تھا۔ جسکی نسبت سُنا جاتا ہے کہ نواب سعادت علی خان نے اُسکو نہایت ہی ناگواری کے ساتھ منظور کیا۔

فرمان روایان اودھ نے اس سے پیشتر اپنے رہنے سہنے کے متعلق نہایت ہی سادگی ظاہر کی تھی۔ پہلے تین حکمرانون یعنی نواب برہان الملک نواب صفدر جنگ اور نواب شجاع الدولہ نے جن سادے مکانون مین زندگی بسر کی وہ بھی اُنکی ذاتی ملکیت نہین بلکہ کرایے پر تھے۔ اُنھون نے اپنا اصلی مکان یا تو میدان جنگ کو خیال کیا یا ساری مملکت کو جس مین دورہ کرتے رہتے اور ساری مملوکہ زمین کے ہر حصے کو اپنا مسکن و مکان تصور کرتے۔ نواب آصف الدولہ اگرچہ نہایت ہی مسرف تھے عیاشی و فضول خرچی مین بدنام تھے مگر اُنکے لیے بھی صرف ایک سادہ پرانی قطع کا

یعنی پنج محلا کافی تھا - حالانکہ اُنھین عمارت کا بڑا شوق تھا - اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ بیس لاکھ روپے ایک امام باڑے اور مسجد کی تعمیر مین صرف کر دیے - اور اس سے زیادہ ہی رقم چوک - مختلف بازارون - منڈیون - پلون - اور سراؤن وغیرہ کی تعمیر مین خرچ کی - غرض پہلے تین فرمان رواؤن کا شوق تعمیر اگر قلعون گڑھیون کی تعمیر اور فوجی سامان کے فراہم کرنے مین پورا ہوتا تھا تو آصف الدولہ کا شوق دینداری کی عمارتون یا نفع رسانی خلق اللہ کے کامون مین - اسکے ساتھ عمارت کا قدیم مذاق بھی اب تک نبھتا چلا جاتا تھا - آصف الدولہ کے امام باڑے تک کی قدیم مذاق تعمیر کا مکمل ترین نمونہ ہین - دہلی و آگرے مین شاہجہان بادشاہ کو اعلی درجے کا سنگ رخام اور سنگ سرخ قریب کی کانون مین مل گیا تھا جس نے وہان کی عمارتون مین خاص قسم کی نفاست اور اعلی درجے کی شان پیدا کرا دی لکھنؤ مین پتھر کا ملنا غیر ممکن تھا - اور آگرے اور جے پور سے لانا اس قدر دشوار تھا کہ کسی کو منگواتے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی - آصف الدولہ نے اینٹ اور چونے سے کام لیا اور ویسی ہی شاندار ی دکھا دی -

نواب سعادت علی خان کو باوجود کفایت شعاری - جزرسی - اور روپیہ جمع کرنے کی ہوس کے مکانون اور عمارتون کا شوق تھا - مگر افسوس اُن کا یہ شوق کلکتے وغیرہ مین رہنے اور مختلف مقامات کی عمارتون کے دیکھنے کی وجہ سے ایسا غارت ہو گیا تھا کہ اُن کے عہد کی عمارتون سے وہ پرانی خصوصیتین جدا ہو گئین - اور اُس وقت سے گویا عمارت کا مذاق ہی بدل گیا -

لکھنؤ مین اس انقلاب تعمیر کا اصلی باعث کچھ تو تخت نشینی سے پہلے نواب سعادت علی خان کی غریب الوطنی - خانہ بدوشی اور اقوام یورپ سے ملنا جلنا تھا اور زیادہ تر یہ تھی کہ جنرل مارٹن نے اپنے مذاق کی دو ایک کوٹھیان یہان بنوا کے ایک نئی وضع عمارت فرمان رواؤن کے سامنے پیش کر دی جو بلحاظ مصنوعی کے ناقص اور باعتبار ضروریات زندگی کے نہایت ہی دلفریب تھی - جن عمارتون کی حالت بالکل ان کھلونون کی سی تھی جو بچون کے ہاتھ مین دے دیے جاتے ہین - اور روز ٹوٹتے رہتے خریدے جاتے ہین - تاقدین یورپ [illegible] کرتے وقت بڑے زور شور سے

اعتراض کرتے ہین کہ آصف الدولہ کے بعد والے فرمان روایان لکھنؤ کا مذاق عمارت بالکل بگڑ گیا تھا۔ اور انکی تمام عمارتین لڑکون کے کھلونے یا لڑکیون کے گھروندے ہین مگر ادھر توجہ نہین کرتے کہ یہ مذاق بگاڑا کس نے؟ کہا جاتا ہے کہ یہان کا قومی مذاق اس لیے بگڑ گیا کہ یہان دراصل کوئی قوم ہی نہین تھی۔ اور اس کا خیال نہین کیا جاتا کہ یہان کی قومیت کو کس نے بگاڑا۔ اور کس کی کرشمہ سازیون نے لوگون سے اُن کی پُرانی وضع چھڑا دی۔ سچ یہ ہے کہ ع اے بادِ صبا این ہمہ آوردۂ تست۔

سعادت علی خان نے پہلے کوٹھی فرحت بخش پچاس ہزار روپے پر جنرل مارٹن سے مول لی۔ اُسی مین رہنا شروع کیا اور اُسکے متصل اور کئی مکان بنوائے۔ پھر وہان سے قریب ہی صاحب رزیڈنٹ کی سکونت کے لیے ٹیڑھی کوٹھی تعمیر کی جس کے کھنڈر رزیڈنسی کے اندر پڑے ہوے ہین۔ اسکے بعد اپنے دربار کے لیے اُنھون نے لال بارہ دری تعمیر کرائی جس مین اب کتب خانہ ہے۔ اور اُن دنون قصر السلطان کے نام سے مشہور تھی۔ اسکے علاوہ دیاپار اُنھون نے دل آرام نام ایک نئی کوٹھی تعمیر کی۔ اور اسی سلسلے مین ایک بلند ٹیکرے پر جو اب صدر یعنی لشکرگاہ لکھنؤ کے علاقے مین واقع ہوا ہے اور جہان سارے شہر۔ گرد کے میدانون۔ اور دریا کا دلکش منظر نظر کے سامنے ہو جاتا ہے ایک خوبصورت کوٹھی تعمیر کی۔ اور دلکشا اُس کا نام رکھا۔ اسی طرح ایک اور کوٹھی تعمیر کی جس کا نام حیات بخش قرار دیا۔ مگر وہ کوٹھی نواب سعادت علی خان کے بعد کے فرمان روایان اودھ کے استعمال مین نہین رہی۔ اُس مین غدر سے پہلے میجر بیک رہتے تھے۔ اور غدر کے بعد یہ معمول تھا کہ انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے جو صاحب اودھ کے چیف کمشنر مقرر ہو کے آتے اُسی کوٹھی مین قیام کرتے۔

مذکورۂ بالا کوٹھیون کے علاوہ نواب ممدوح نے مشہور عمارتین منور بخش اور خورشید منزل بھی تعمیر کرائین۔ اور چوپڑ کا اصطبل بھی اُنھین کی یادگار ہے۔ مگر ان سب عمارتون کی تعمیر مین پُرانی وطنی عمارت کی وضع ترک کر دی گئی۔ اور یورپ سے آئی ہوئی نئی جدتین اختیار کی گئین۔ اور ظاہر ہے کہ اس بارۂ خاص مین لکھنؤ کا کوئی قدیم مکان اُن نئی عالیشان عمارتون کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا جو خود دولت برطانیہ کے اثر اور اہتمام سے ہندوستان کے مختلف شہرون مین تعمیر ہو چکی ہین یا رو

بروز تعمیر ہوتی جاتی ہین - غرض یہی زمانہ ہے جب سے لکھنؤ مین اُن قدیم مذاق کی عمارتون کا خاتمہ ہو گیا جو تاریخی وقعت رکھتی ہون اور کسی خاص خوبی کے لحاظ سے سیاحون کو اپنی طرف بُلاتی ہون -

نواب سعادت علی خان نے لکھنؤ کے مغربی حصے مین ایک بڑا گنج بنوایا - اور اُس کی آبادی و رونق کے لیے اس قدر اہتمام کیا کہ اُسکے واسطے خاص قوانین وضع کیے گئے - اور تاجرون اور دوکاندارون کو خاص قسم کے حقوق عطا کیے گئے - اُس نے بڑی رونق پائی - اور آج تک باوجودیکہ شہر کی آبادی سے فاصلے پر اور بالکل الگ واقع ہوا ہے مختلف چیزون کی سب سے بڑی منڈی ہے - اور عالم نگر کا اسٹیشن صرف اُسی کی وجہ سے روز بروز ترقی پاتا جاتا ہے -

سعادت گنج کے علاوہ دوسرے بڑے بازار جو نواب ممدوح کے عہد مین قایم اور آباد ہوے حسب ذیل ہے - رکاب گنج (جو آج لوہے کی سب سے بڑی اور غلّے وغیرہ کی ایک ممتاز منڈی ہے) جنگلی گنج - مقبول گنج - مولوی گنج - گولا گنج - اور رستوگی محلہ - موتی محل مین جو اصلی اور پُرانی عمارت ہے وہ بھی نواب سعادت علی خان ہی کی بنوائی ہوئی ہے - یہ عمارت موجودہ احاطۂ موتی محل مین شمال کی طرف واقع ہے - اُس مین نہایت ہی نفیس سفید گنبد تھا جس مین کاریگر نے موتی کی سی آب و تاب پیدا کر دی تھی -

سعادت علی خان اودھ کے تمام فرمان رواؤن سے زیادہ بیدار مغز و مدبر اور اُسکے ساتھ نہایت ہی کفایت شعار - جُزرس - بلکہ بخیل خیال کیے جاتے ہین - ملک کا انتظام اُنھون نے غیر معمولی ہوشیاری اور خوبی و شایستگی سے کیا - اور اس مین ذرا شک نہین کہ اگر اُن کو آخر عہد تک پورا اطمینان نصیب ہو جاتا تو تمام گذشتہ بدنظمیان اور خرابیان دُور ہو جاتین - اور وہ ملک کی پوری پوری اصلاح کر لے جاتے - لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ اُنکے تعلقات اچھے نہین رہے - یہان تک کہ بعض اوقات اُن کا دل تاج و تخت اور فرمانروائی و جہانبانی سے کھٹا ہو گیا تھا - انھین باتون سے عاجز آ کے اُنھون نے آدھے سے زیادہ ملک سرکار عظمت مدار برطانیہ کے سپرد کر دیا - اور سمجھے کہ اب مین اپنے مقبوضہ

علاقے تین بے خرخشہ دیے تردد حکومت کر سکون گا مگر افسوس کہ اب بھی اُنکو اطمینان اور چین نہ نصیب ہوا - جو ملک اُنکے قبضے مین چھوڑا گیا تھا اُس مین بھی جا بجا انگریزی فوج کے کیمپ قائم کیے گئے - اور بڑی مقدار خاص لکھنؤ اور اُسکے حوالی مین تقسیم ہوئی - جس کی سنبھال دشوار تھی - اور اُسکی تعداد کے زیادہ ہونے سے سلطنت پر سخت بار پڑ گیا تھا - اسکے مقابل انھین اپنی بہت سی فوج گھٹا دینی پڑی

مگر باوجود ان افکار و ترددات کے اُنھون نے جو جو اصلاحین کین بہت کچھ قابل تعریف ہین - مگر سب سے عجیب یہ بات ہے کہ بازارون کی ترقی اور تجارت کے فروغ کے ساتھ اُنکے دربار مین باکمالون اور قابل قدر لوگون کا اتنا بڑا مجمع ہو گیا تھا کہ اُسوقت ہندوستان کے اور کسی دربار مین ایسے صاحبان کمال نہ نظر آ سکتے تھے - ایسے لوگ اکثر اُسی جگہ جمع ہوا کرتے ہین جہان کے رئیس معدل سے زیادہ فیاضی ظاہر کرتے ہون سعادت علی خان جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہین جزرس اور بخیل تھے - مگر اس بخل وکفایت شعاری کے ساتھ یہ صفت تھی کہ اُن کی ذاتی قابلیت دوسرے باکمالون کی لیاقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی - اور اسی بات نے اُن کے ہاتھون سے لائق لوگون کی بڑی بڑی قدرین کرائین - اور لکھنؤ پہلے سے زیادہ اہل کمال کا مرجع بن گیا - جو قابل آدمی جہان ہوتا سعادت علی خان کی قدردانی کی شہرت سُنتے ہی اپنے وطن کو خیرآباد کہ کے لکھنؤ کا رُخ کرتا اور یہان آکے ایسا آرام پاتا کہ پھر کبھی وطن کا نام نہ لیتا -

سنہ ۱۲۲۹ ہجری (سنہ ۱۸۱۴ء) مین نواب سعادت علی خان نے سفر آخرت کیا - اور اُنکے بیٹے غازی الدین حیدر مسند حکومت پر رونق افروز ہوے - قیصر باغ کی مربع عمارت کے اندر نواب سعادت علی خان اور اُن کی بی بی مرشد زادی کے مقبرے ہین - ان دونون مقبرون کی جگہ ایک مکان تھا جس مین نواب غازی الدین حیدر ایام ولیعہدی مین رہا کرتے تھے - باپ کی آنکھین بند ہوتے ہی جب وہ ایوان شہریاری مین گئے تو کہا "مین نے والد کا گھر لیا ہے تو ضرور ہے کہ اپنا مکان اُنھین رہنے کو دے دون" اس خیال کے مطابق مرحوم کو اپنے گھر مین دفن کرا دیا - اور پُرانا مکان منہدم کرا کے یہ مقبرے تعمیر کرا دیے -

اب غازی الدین حیدر کے عہد میں نہ باپ کی سی بیدارمغزی اور دولت کی قدر تھی۔ اور نہ اگلے فرمان رواؤں کی سی فوجی سرگرمی۔ ہاں آصف الدولہ کے عہد کی سی آرام طلبی اور عیش پرستی ضرور تھی مگر اُس میں بھی یہ فرق آگیا تھا کہ آصف الدولہ کا اسراف کبھی ملک و ملت کی نفع رسانی کے لیے ہوتا تھا اور اب خالص نفس پروری تھی۔

غازی الدین حیدر کو باپ کا جمع کیا ہوا کروڑوں روپیہ کا نقد خزانہ مل گیا تھا جو شاہی شوق کے پورا ہونے میں نہایت ہی دریا دلی سے اُڑنے لگا۔ موتی محل میں ہم کہہ آئے ہیں کہ شمالی جانب سعادت علی خان نے ایک کوٹھی تعمیر کرائی تھی۔ غازی الدین حیدر نے اُس احاطے میں دو اور کوٹھیاں تعمیر کرائیں۔ جن کے نام مبارک منزل اور شاہ منزل قرار دیے گئے۔ شاہ منزل کے پاس ہی کشتیوں کا ایک پُل تھا۔ اور مبارک منزل اس سے مشرق کی طرف ہٹی ہوئی تھی۔ شاہ منزل کے محاذی دریا پار رمنہ تھا جو ہزاری باغ کے نام سے موسوم تھا اور اُس میں میلوں تک نزہت بخش سبزہ زار چلا گیا تھا۔ اُس میں اکثر مست ہاتھی۔ گینڈے۔ اور وحشی درندے لڑائے جاتے اور بادشاہ اس پار شاہ منزل کے کوٹھے پر جلوہ فرما ہو کے اُن کی لڑائی کا تماشا ملاحظہ فرماتے۔ شیروں کی لڑائی بھی وہیں ہوتی۔ جس کے لیے مضبوط کٹہرے اور ایک عمدہ سرکس بنا ہوا تھا۔ مگر جو چھوٹے غیر آزار رساں جانور لڑائے جاتے اُن کی لڑائی خاص شاہ منزل کے احاطے میں اسی پار ہوتی۔

یہ درندوں اور وحشی جانوروں کے لڑانے کا شوق ہندوستان میں یہاں سے پہلے اور کہیں نہیں سُنا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رزیڈنٹوں اور درباریں اہل یورپ سے رومیوں کے ایمفی تھیٹر کے حالات سُن کے جہاں پناہ کے دل میں شوق پیدا ہوا۔ مگر مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کے توجہ دلانے سے ہمیں معلوم ہوا کہ درندوں کی لڑائی کا رواج دولت مغلیہ کے عہد سے ہے

غازی الدین حیدر نے اپنی ایک یوروپین بی بی کے لیے ولایتی محل بنوایا۔ اور اُس کا نام ولایتی باغ قرار دیا۔ وہاں سے قریب ہی قدم رسول کی عمارت تیار کرائی غازی الدین حیدر کی آرزو کے موافق دربار انگریزی سے اُنھیں ”بادشاہی“ کا لقب عطا کیا گیا۔ اس سے پیشتر فرمان روایانِ اودھ وزیر کے رتبے کے سمجھے جاتے

اور سوا نواب کے اور کسی اعزازی لقب سے نہین یاد کیے جاتے تھے ۔ اس زمانے تک ہندوستان مین شہنشاہی مغلیہ کی اتنی آن باقی تھی کہ اگرچہ ملک خود مختار و خود سر حکمرانون مین بٹ گیا تھا اور شہنشاہ دہلی کے قبضے مین صرف دہلی کے گرد و پیش کی زمین باقی رہ گئی تھی ۔ لیکن اس بے بضاعتی پر بھی شہنشاہ و جہان پناہ وہی تھے ۔ نہ سربرآوردہ ایان دہلی کے سوا ہندوستان مین کسی کو "بادشاہ" کہلانے کا حق تھا اور نہ خطاب و عزت دینے کا ۔ اُنکے اس غرور کے توڑنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے غازی الدین حیدر کو جنھون نے باپ کے اندوختہ مین سے بہت سا روپیہ انگریزون کو قرض دے دیا تھا ۔ شاہی کا خطاب دیا ۔ اور دربار اودھ نے اس عزت و سرفرازی کو نہایت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا ۔ چنانچہ اُسوقت سے حکمرانان اودھ جو رزیڈنٹون کے ہاتھون کے کھلونے تھے بادشاہ بن گئے ۔ اور آخری فرمان روا واجد علی شاہ کے مرنے تک اُنکا سرمایۂ ناز رہے ۔

غازی الدین حیدر نے اسی خطاب شاہی کی یادگار مین دریا پار چھتر بھون کے سامنے ایک نیا بازار بسایا اور اُس کا نام بادشاہ گنج رکھا ۔ اسی زمانے مین حکیم مہدی نے مہدی گنج آباد کیا ۔ اور نائب السلطنت آغا میر کی شاہانہ عمارت کے دور تک پھیل جانے کی وجہ سے عین وسط شہر مین محلۂ آغا میر کی ڈیوڑھی قائم ہوا ۔ اور اسی عہد مین آغا میر کی سرائے تعمیر ہوئی ۔

بادشاہ کو اور اُن سے زیادہ بادشاہ بیگم کو مذہبی معاملات مین بہت زیادہ انہماک تھا ۔ صفویہ خاندان کے زمانے سے ایران کا مذہب شیعہ اثنا عشری تھا ۔ مگر ہندوستان کے عام مسلمان سُنّی تھے ۔ نواب برہان الملک چونکہ ولایت سے آئے تھے اس لیے اُن کا اور اُنکے سارے خاندان کا مذہب شیعہ تھا ۔ باوجود اسکے زمانے تک لکھنؤ مین حکومت کا وہی قدیم طریقہ چلا آتا تھا جو آغاز سلطنت اسلام سے دیگر بلاد ہند اور سارے ملک کا تھا ۔ مگر اسوقت سے بادشاہ اور اُنکے خاص محل کے انہماک مذہبی کی وجہ سے شیعیت حکومت لکھنؤ کا ایک نمایان عنصر بن گئی ۔ فرنگی محل کے علما کی طرف سے حکمرانون کی توجہ ہٹ گئی اور خاندان اجتہاد عروج پا کے سلطنت کا اصلی نقش قرار پایا ۔

لیکن شیعہ مذہب اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہ بیگم کی جاہلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں۔ جن کی وجہ سے اسی قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا ہوئیں بلکہ لکھنؤ کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے نئی۔ نرالی۔ اور عجیب ہو گئی۔

سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی جس میں اگر یہ ہوتا کہ کسی محفل میں امام ممدوح کے حالات بیان کر کے ثواب حاصل کر لیا جائے تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر نہیں۔ یہاں ہندوؤں کے جنم اشٹمی کے رسوم کے موافق پورا زچا خانہ مرتب کیا جاتا۔ اسکے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خوبصورت لڑکیاں لے کے ائمۂ اثنا عشر کی بیبیاں قرار دی گئیں جن کا نام "اچھوتیاں" رکھا گیا۔ اور جب وہ اماموں کی بیبیاں تھیں تو پھر اُن کے وہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی۔ اور بارہوں اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کروفر کے ساتھ منائی جانے لگیں۔

غازی الدین حیدر نہایت ہی غضبناک اور آشفتہ مزاج بادشاہ تھے۔ اور رعب وداب اس بلا کا تھا کہ اُن کے زمانے میں انگریزوں سے تعلقات تو اچھے رہے مگر آغا میر جو وزیر السلطنت تھا دربار پر اس قدر حاوی تھا کہ خود بادشاہ بیگم اور ولیعہد سلطنت تک اُسکے آزار سے محفوظ نہ رہ سکے۔ غازی الدین حیدر اُسے گھونسوں اور لاتوں سے مارتے۔ جس مار کو وہ خوشی سے کھا لیتا۔ مگر اس کا بدلہ دیگر معززین دربار اور اعزائے شاہی تک سے لے لیا کرتا۔

اس پہلے بادشاہِ اودھ نے مذہبی ارادت وعقیدت سے دریا کنارے اور موتی محل کے متصل نجف اشرف یعنی روضۂ مطہرۂ حضرت علیؑ کی نقل لکھنؤ میں بنوائی اور اُس کی روشنی وخدمت کے لیے بہت سا روپیہ سرکار انگریزی کے حوالے کیا۔ جس کی بدولت آج تک وہ بارونق اور خوب آباد ہے۔ اور ۱۲۵۶ھ؁ ہجری ۱۸۲۷ء میں جب اُن کا انتقال ہوا تو اُسی میں دفن ہوئے۔

—— (۶) ——

۱۲۵۶ھ محمدی (۲۷-۱۸۲۶ء) مین غازی الدین حیدر کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے جیسا کہ ہم بتا چکے ہین فرمان روایانِ اودھ نواب نہین بادشاہ تھے۔ اس دولت کا آغاز وزارت دہلی کے درجے سے ہوا تھا۔ اور اگلے زبردست و ذی وقعت فرمان روا سب نواب وزیر کہلاتے تھے۔ لیکن اب جبکہ اصلی حکومت و سطوت رخصت ہو چکی تھی اور ہندوستان کے پالٹکس مین ان لوگون کا بالکل اثر نہین باقی رہا تھا یہ بادشاہ بن گئے۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ انگریزون نے حکمرانانِ اودھ کو بادشاہی عزت دی تو اپنی پشت پناہی سے اُنکی سطوت بھی بڑھا دی ہوگی۔ اور انھین نام ہی کا بادشاہ نہین بلکہ حقیقتاً بادشاہ بنا کے دکھا دیا ہوگا۔ لیکن نہین۔ ہمین یہ نظر آتا ہے کہ اس عہد مین اودھ کے باہر ان لوگون کا اثر تو بالکل تھا ہی نہین۔ خود اپنی قلمرو مین بھی یہ اتنے آزاد نہ تھے جتنے کہ اسکے ماسبق بزرگ ہوتے آئے تھے۔ اب کسی کی تخت نشینی بغیر انگریزون کی منظوری کے ہو ہی نہ سکتی تھی۔ انگریزی فوج ساری قلمرو مین جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی اہم معاملہ بغیر صاحب رزیڈنٹ کی دخل دہی کے طے ہی نہ ہو سکتا تھا۔ سریر شہریاری ایک اسٹیج تھا۔ جس پر جو کچھ ہوتا بظاہر نظر آتا کہ ایکٹر کر رہے ہین مگر اصل مین وہ افعال کسی اور شخص کے قبضۂ قدرت مین تھے جو پردے کی آڑ مین تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا۔

مگر خدا کی اتنی مہربانی تھی کہ ان پچھلے حکمرانانِ اودھ کی اور اسکے ساتھ قریب قریب سارے وابستگانِ دامنِ دولت کی حس مفقود ہو گئی تھی جسکی بدولت وہ اپنی کمزوری و بے دست و پائی کو بالکل محسوس نہ کر سکتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ بنتے ہی عیش و عشرت مین مشغول ہو گئے۔ اور نصیر الدین حیدر کو تو تخت شاہی ورثے مین ملا تھا۔ نواب سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا روپیہ عیش پرستی مین دونون کا ممد و معاون ہوا۔ کچھ انگریزون کو قرض دیا گیا۔ کچھ اُن مبتدعہ مذہبی رسمون کی بجا آوری مین صرف ہوا جنھین بادشاہ اور اُن کی ملکاؤن نے اپنے مذاق کے موافق ذوق و شوق سے ایجاد کیا۔ اور باقی فضول خرچیون اور عیاشیون کی نذر ہونے لگا۔ غازی الدین حیدر نے تو اتنا بھی کیا تھا کہ نجف اشرف کی نقل بنوا کے اپنی قبر کا ٹھکانا کر لیا۔ اور بغیر اسکے کہ

اپنے ورثے پر بھروسا کریں کچھ روپیہ انگریزوں کے حوالے کیا کہ اُسکے سود سے پورے دینی آداب کے ساتھ نجف کی داشت کیا کریں۔ چنانچہ آج تک اُنکی قبر پر چراغ روشن ہوتا ہے۔ مجلسیں ہوتی ہیں۔ قرآن خوانی ہوتی ہے۔ اور محرم میں خوب روشنی ہوتی ہے۔ جسکے طفیل تھوڑے سے غریبوں کی پرورش ہو جایا کرتی ہے۔ مگر نصیر الدین حیدر کو ہجوم عیش میں اتنی بھی توفیق نہ ہوئی۔ دریا پار محلہ ارادت نگر میں اُنھوں نے ایک کربلا بنوائی جو خود اُن کا مرقد قرار پانے والی تھی مگر اس کی خدمت و داشت کی ذرا بھی فکر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ ڈالی گنج کے اسٹیشن کے پاس اُجاڑ اور خاموش پڑی ہے اور شاید کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں۔ اُنکے زمانے میں نئے محلے گنیش گنج اور چاند گنج وہیں دریا پار آباد ہوئے۔

نصیر الدین حیدر کو نجوم سے عقیدت تھی جس نے علم ہیأت کی طرف توجہ دلائی۔ اور ارادہ کیا کہ اپنے شہر میں ایک اعلیٰ درجے کی رصدگاہ قائم کریں۔ چنانچہ اس غرض کے لیے ایک کوٹھی نواب سعادت علی خاں کے مقبرے اور موتی محل کے درمیان میں تعمیر کرائی جو رصدگاہ ہونے کے باعث لکھنؤ میں "تارے والی کوٹھی" کے نام سے مشہور رہوئی۔ اُس میں بڑی بڑی دوربینیں اور اعلیٰ درجے کے آلات رصد جمع کیے گئے۔ اُنکے مناسب طور پر قائم کرنے کا کام اور اُن کا انتظام و اہتمام کرنل ولکاکس کے سپرد ہوا جو ایک اچھے ہیأت دان تھے۔ مگر لکھنؤ کی یہ رصد گویا کرنل صاحب موصوف ہی کی زندگی کا ایک مجہول الحال واقعہ تھی۔ کیونکہ ۱۲۴۳ھ مجری سے نصیر الدین حیدر کی سلطنت کا آغاز ہوا۔ جسکے چار پانچ سال بعد غالباً یہ رصدگاہ قائم ہوئی ہوگی۔ اور اُسوقت سے ۱۲۶۳ھ مجری (۱۸۴۷ء) تک جبکہ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کا زمانہ تھا یہ رصدگاہ اُنھیں کے اہتمام میں رہی۔ سنہ مذکور میں کرنل صاحب کا انتقال ہوا اور اُنکی جگہ کوئی ہیأت دان اس خدمت پر مقرر نہیں کیا گیا۔ واجد علی شاہ نے اُس کی طرف سے بے پروائی کی۔ لکھنؤ کے بعض مستند اشخاص کی زبانی سُنا گیا کہ اس کی سب سے بڑی دوربین کو واجد علی شاہ نے ایک کھلونا خیال کر کے حیدری طوائف کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن گزیٹیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رصدگاہ انتزاع سلطنت کے زمانے تک قائم تھی۔ غدر میں غالباً بلوائیوں نے اسے تباہ کر دیا کیونکہ

احمد اللہ شاہ نے (جو ڈنکا شاہ بھی کہلاتے تھے اور انگریزی فوج سے بڑی مستعدی و گرمجوشی کے ساتھ لڑے تھے) تارے والی کوٹھی ہی میں سکونت اختیار کی تھی۔ اسی میں اپنا دربار قائم کیا تھا۔ اور باغی فوجوں کے افسر یہیں جمع ہو کے مشورے کیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں روشن الدولہ نے جو وزیر سلطنت تھے اپنی خوبصورت اور شاندار کوٹھی تعمیر کرائی جس میں فی الحال ڈپٹی کمشنر بہادر اجلاس کرتے ہیں۔ اسلیے کہ واجد علی شاہ نے اس کوٹھی کو قیصر باغ بنواتے وقت ضبط کر لیا تھا۔ اور جب ملک انگریزوں کے قبضے میں آیا ہے یہ کوٹھی ایک سرکاری جائداد تھی۔

نصیر الدین حیدر کا زمانہ سچ یہ ہے کہ نہایت ہی خطرناک زمانہ تھا۔ ایک طرف تو انتظام مملکت کی خرابی تھی بادشاہ کو عیش و عشرت اور اپنی ایجاد کردہ دینداری کی رسموں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ سارا انتظام سلطنت وزیر پہ چھوڑا جاتا تھا۔ اور وزیروں کی یہ حالت تھی کہ کوئی ایسا شخص ملتا ہی نہ تھا جو نیک نیتی اور خوش تدبیری سے کام چلا سکے۔ حکیم مہدی بلائے گئے۔ وہ منتظم تو اعلیٰ درجے کے تھے مگر چاہتے تھے کہ سلطنت کو اپنی ہی میراث بنا لیں۔ روشن الدولہ وزیر ہوے۔ اُن میں نہ مادہ تھا نہ طبیعت داری۔ اُن سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی۔ بادشاہ کی فضول خرچیوں کی یہ حالت تھی کہ سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا سارا روپیہ پانی کی طرح اُڑ گیا۔ اور ملک کی آمدنی محل کے مصارف کے لیے کفایت ہی نہ کرتی تھی۔ اسپر طرہ یہ کہ بادشاہ اور اُن کی مان غازی الدین حیدر کی خاص محل میں جھگڑے پیدا ہوے۔ وہ منا جان کو بادشاہ کا بیٹا بتاتی تھیں اور بادشاہ اُسکو اپنا بیٹا تسلیم نہ کرتے تھے۔ ان باتون نے ملک کی ایسی حالت کر دی تھی کہ معلوم ہوتا حکمرانوں میں حکومت کرنے اور ملک کے سنبھالنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔

صاحب رزیڈنٹ اور گورنر جنرل ہند نے بار بار سمجھایا۔ ڈرایا۔ دھمکایا۔ انجام سے مطلع کیا۔ اور برابر کان کھولتے رہے مگر یہاں کسی کے کان پہ جون نہ رینگی۔ نصیر الدین حیدر یں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے۔ اور عورتوں ہی کا سا لباس پہنتے۔ زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہ

عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ ائمۂ اثنا عشر کی فرضی بیبیاں (چھوتیاں) اور اُنکی ولادت کی تقریبیں جو اُن کی ماں نے قائم کی تھیں اُن کو اور زیادہ ترقی دی۔ یہاں تک کہ ولادتِ ائمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کے زچہ خانے میں بیٹھتے اور حرکات سے وضعِ حمل کی تکلیف ظاہر کرتے۔ اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے۔ جس کے لیے ولادت۔ چھٹی۔ اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے۔ یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انھیں سے فرصت نہ ملتی سلطنت کی طرف کون توجہ کرتا۔

دربار اودھ اور سرکار انگریزی کے تعلقات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گورنر جنرل اور رزیڈنٹوں کی نظر عنایت نہ ہوتی اور انگلستان کا جو بورڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نگران تھا کمپنی کو روکے تھامے نہ رہتا تو انتزاعِ سلطنت کی کارروائی اسی زمانے میں ہوگئی ہوتی۔ مگر اس طفلانہ مزاجی کے دربار کی زندگی ابھی باقی تھی۔ انگریز ملک کے لینے کا ارادہ کرکر کے رہ گئے۔

نصیر الدین حیدر کی نسبت لکھنؤ کے معتبر پُرانے لوگوں کا بیان ہے کہ اس زنانہ مزاجی اور ان طفلانہ حرکتوں کے ساتھ نہایت ہی ظالم بھی تھے۔ لیکن چونکہ ساری زندگی عورتوں میں بسر ہوتی تھی اس لیے اُن کے مظالم کا شکار بھی زیادہ تر عورتیں ہی ہوتیں۔ بیسیوں عورتوں کو ادنیٰ قصور اور معمولی بدگمانی پر دیواروں میں چنوا دیا۔ کہتے ہیں کہ راہ چلتے کسی مرد کو کسی عورت کے سینے پر ہاتھ رکھے دیکھ لیا تھا۔ فوراً عورت کی چھاتیاں اور مرد کے ہاتھ کٹوا ڈالے۔

آخر دس برس کی بے اعتدالیوں کے بعد جبکہ اندر باہر کے تمام اہل دربار زندگی سے عاجز آ گئے تھے بادشاہ خود اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ہاتھ کا شکار بنے۔ اور کسی نے زہر دے کے سنہ ۱۲۵۳ ہجری (۱۸۳۷ء) میں قصہ تمام کر دیا۔ نصیر الدین حیدر لاولد مرے تھے۔ مُنا جان کو غازی الدین حیدر کی بیگم نے ہمیشہ اپنا پوتا اور سچا وارث سلطنت بنا کے پیش کیا مگر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر دونوں نے اُنکے نسل شاہی ہونے سے انکار کیا تھا۔ اسی بنا پر گورنمنٹ انگریزی نے نواب سعادت علی خان مرحوم کے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی خان کی تخت نشینی

کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا۔ مگر بیگم صاحبہ نے نہ مانا۔ منا جان کو لے کے لال بارہ دری یعنی تخت گاہ میں آ گئیں۔ رزیڈنٹ نے ہزار روکا اور سمجھایا مگر ایک نہ سنی اور زبردستی منا جان کو تخت پر بٹھا دیا۔ جنھوں نے تخت پر قدم رکھتے ہی نذریں لیں اور اپنے دشمنوں سے فوراً بدلہ لینا بھی شروع کر دیا۔ بہتوں کے گھر لٹوا دئے۔ بعض کو گرفتار کر لیا۔ بعض قتل ہوئے۔ اور شہر میں ایک ہڑبونگ مچ گیا۔

صاحب رزیڈنٹ اور اُنکے اسسٹنٹ فوراً دربار میں پہونچے۔ بادشاہ بیگم کو سمجھایا کہ منا جان وارث سلطنت نہیں ہو سکتے۔ اور اس میں آپ کو بہتری [illegible] نہ ہو گی۔ پھر لاٹ صاحب کا تحریری فرمان دکھایا اور کہا بہتری ہے کہ منا جان تخت کو خالی کر دیں اور نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل میں آ جائے۔ مگر کسی نے سماعت نہ کی۔ بلکہ کسی نے اسسٹنٹ رزیڈنٹ پر حملہ کیا جس سے اُن کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ رزیڈنٹ نے منڈیاؤں سے انگریزی فوج پہلے ہی سے بلوالی تھی اور اس نے تختگاہ کے سامنے توپیں لگا دی تھیں اور سپاہی صفیں باندھے کھڑے تھے۔ مجبوراً صاحب عالیشان نے گھڑی ہاتھ میں لی اور کہا دس منٹ کی مہلت دی جاتی ہے اس زمانے کے اندر اگر منا جان تخت سے نہ اُتر گئے تو جبریہ کارروائی کی جائے گی۔ اس کا بھی کسی نے خیال نہ کیا۔ حالانکہ رزیڈنٹ بار بار کہتے جاتے تھے کہ اب پانچ منٹ باقی ہیں۔ اب دو ہی منٹ رہ گئے۔ اور اب دیکھیے پورا ایک منٹ بھی نہیں۔

ان تنبیہوں کا کسی نے خیال نہ کیا۔ اور یکایک توپوں نے گرابیں مارنا شروع کیں۔ آناً فاناً میں تیس چالیس آدمی گر گئے۔ درباری بدحواسی کے ساتھ گرتے پڑتے بھاگے۔ جو طائفہ مجرا کر رہا تھا اُس میں سے بھی کئی آدمی زخمی ہوئے۔ شیشہ آلات جھنا جھن ٹوٹ ٹوٹ کے گرنے لگے۔ جب کئی وفادار بہادر جو سینہ سپر تھے مارے جا چکے تو منا جان نے بھی تخت سے گر کے بھاگنے کا قصد کیا مگر پکڑ لیے گئے غرض بیگم صاحب اور انھیں دونوں کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا۔ ساتھ ہی نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل میں آئی جو محمد علی شاہ کے لقب سے بادشاہ اودھ قرار پائے۔ اور منا جان اور اُنکی دادی سخت حراست میں لکھنؤ سے کانپور اور کانپور سے قلعہ چنار گڑھ

مین بھیج دیے گئے۔ اور دو ہزار چار سو روپیہ ماہوار اُن کی تنخواہ لکھنؤ کے خزانے سے مقرر کردی گئی۔

محمد علی شاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت تریسٹھ برس کی تھی۔ بوڑھے تجربہ کار تھے زمانے کے سرد و گرم اور دربار کی طفلانہ مزاجیان دیکھتے رہے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نواب سعادت علی خان کے بیٹے تھے اور اُن کی آنکھین دیکھے ہوے تھے۔ انھون نے بہت سنبھل کے کام کیا۔ کفایت شعاری کے اصول جاری کیے اور جہان تک بنا [illegible] کے سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر عمر زیادہ آچکی تھی اور قُوے جواب دیتے جاتے تھے۔ تخت پر بیٹھتے ہی اُنھون نے حکیم مہدی کو فرخ آباد سے بُلوا کے خلعت وزارت دیا۔ مگر چند ہی روز بعد وہ مرگئے۔ تب ظہیرالدولہ کو خلعت وزارت ہوا۔ دو تین مہینے بعد وہ بھی دنیا سے رخصت ہوے۔ اور منورالدولہ وزیر قرار پائے۔ جنھون نے دو چار مہینے کے بعد ہی استعفا دے دیا اور کربلاے معلّٰی چلے گئے۔ پھر اشرف الدولہ محمد ابراہیم خان وزیر قرار پائے جو اَورون کے دیکھتے ذی ہوش اور متین تھے۔

محمد علی شاہ کی تخت نشینی پر گورنمنٹ انگریزی اور سلطنت اودھ مین ایک نیا معاہدہ ہوا۔ جس کی رُو سے سرکار انگریزی نے جو فوج اودھ کی نگرانی کے لیے رکھی تھی اُس مین معتدبہ اضافہ ہوا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہوا کہ ساری قلمرو اودھ یا اُسکے جس علاقے مین بدنظمی دیکھے اُسے جب تک چاہے اپنے زیر انتظام رکھے۔ بادشاہ نے ناگواری کے ساتھ اس عہدنامے پر دستخط کیے اور جہان تک بنا ملک کی اصلاح کرنے لگے۔

تخت نشینی کے دوسرے ہی برس اُنھون نے اپنا مشہور امام باڑہ حسین آباد اور اور اُسکے قریب ایک عالیشان مسجد تعمیر کرانا شروع کی۔ جس کی بابت اہتمام کیا گیا کہ دہلی کی جامع مسجد سے رونق اور وسعت مین بڑھ جائے۔

اُن دنون لکھنؤ کی آبادی و رونق اس قدر ترقی کر گئی تھی اور اس کثرت سے آدمی اُس کی سواد مین آباد تھے کہ اُسے ہندوستان کا بابل کہنا بیجا نہ تھا۔ واقعی یہ شہر ہر حیثیت سے اُس عہد کا زندہ بابل تھا۔

اس شباہت کو شاید انگریزوں یا کسی درباری سے سن کے محمد علی شاہ نے ارادہ کیا کہ لکھنؤ کو پورا پورا بابل بنا دیں۔ اور اپنی ایک ایسی یادگار قائم کر دیں جو انکے نام کو تمام شاہان اودھ سے زیادہ بلندی پر دکھائے۔ انھوں نے بابل کے مینار یا وہاں کے ہوائی باغ کی طرح کی ایک عمارت حسین آباد سے قریب اور موجودہ گھنٹہ گھر کے پاس تعمیر کرانا شروع کی۔ جس میں محرابوں کے مدور حلقے پر دوسرا حلقہ اور دوسرے حلقے پر تیسرا حلقہ۔ غرض یوں ہی تلے اوپر قائم ہوتے چلے جاتے تھے۔ ارادہ تھا کہ یونہیں سات منزلوں تک اُسے بلند کرکے ایک اتنا بڑا اور اونچا برج بنا دیا جائے جو دنیا بھر میں لاجواب ہو۔ اور اُسکے اوپر سے سارے لکھنؤ اور اسکے گرد کی فضا نظر آئے۔ یہ عمارت اگر پوری بن جاتی تو یقیناً لاجواب اور عجیب و غریب ہوتی۔ اس کا نام "ست کھنڈا" قرار دیا گیا تھا۔ اور بڑے اہتمام سے بن رہی تھی۔ مگر پانچ ہی منزلیں بننے پائی تھیں کہ محمد علی شاہ نے ۱۲۵۸ھ محمدی (۱۸۴۲ء) میں سفر آخرت کیا۔

محمد علی شاہ نے اپنے مختصر زمانے میں بغیر اس کے کہ اندرونی جھگڑے پیدا ہوں یا ملک میں بدنظمی کی فریاد بلند ہو لکھنؤ کو نہایت ہی خوبصورت شہر بنا دیا۔ حسین آباد کے پھاٹک سے رومی دروازے تک دریا کنارے کنارے ایک سڑک نکالی جو چوک کہلاتی تھی۔ اس سڑک پر باوجود دو طرفہ عالیشان مکانوں کے ایک طرف رومی دروازہ آصف الدولہ کا امام باڑہ اور اس کی مسجد تھی۔ دوسری طرف شکستہ اور حسین آباد کا پھاٹک تھا۔ اس نئے امام باڑے کی مختلف سرنفلک عمارتیں تھیں اور اسکے پہلو میں جامع مسجد واقع تھی۔ ان سب عمارتوں نے مل کے دونوں جانب ایک ایسا خوشنما اور نظر فریب منظر پیدا کر دیا تھا جو دنیا کے تمام مشہور و خوش سواد مناظر پر چشمک زنی کرتا تھا۔ اور اب بھی گو کہ درمیان میں باشندگان شہر کے جتنے مکانات واقع تھے سب کھُد گئے مگر دنیا کا ایک بہترین منظر تصور کیا جاتا ہے۔

(۷)

محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ اورنگ آرائے سریر شہریاری ہوئے۔ محمد علی شاہ نے کوشش کی تھی کہ ولیعہد سلطنت کی تعلیم اعلیٰ درجے کی ہو۔ چنانچہ انھیں علما و فضلا کی صحبت میں رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امجد علی شاہ بجائے اسکے کہ تعلیم میں کوئی نمایاں

کرین اخلاق و عادات کے لحاظ سے ایک ثقہ مولوی بن گئے۔ تھان حکومت ہاتھ مین آنے کے بعد اُن کا جو کچھ حوصلہ تھا یہ تھا کہ وہ اور اُنکے ساتھ ساری رعایا جناب قبلہ و کعبہ کی حلقہ بگوش ارادت بن جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ علماے دین و مقتدایان ملت کو پالٹکس سے کسی قسم کا واسطہ نہین ہو سکتا۔ وہ نہ مدبر سلطنت ہو سکتے ہین نہ اسٹیٹسمین۔ اُن سے جو کچھ ہدایت مل سکتی یہ تھی کہ سیدون کی خدمتگزاری کی جائے اور سلطنت کا روپیہ مومنین کی اعانت و دستگیری مین صرف ہو۔ اور یہ کام بھی ارادت کیش اور محتاط پرہیزگار فرمان روائے اودھ امجد علی شاہ کی نظر مین اُسی وقت قابل اطمینان ہو سکتا تھا جب خود مجتہد العصر کے مبارک ہاتھون سے انجام پائے۔ چنانچہ ملک کی آمدنی مین سے لاکھون روپیہ زکوٰۃ کے نام سے اُنکی نذر کیا جاتا۔ اور اسکے علاوہ اور بھی بہت سی خیرات کی رقمین اُنھین کے ہاتھ مین جاتین۔

امجد علی شاہ کے لیے تقوے طہارت کا خیال مرض بن گیا تھا۔ انھین اپنے خیال کی پابندی شرع سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ نظم و نسق مملکت کی طرف توجہ کرین۔ جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اپنی تجربہ کاری و بیدار مغزی سے جو کچھ انتظامات کیے تھے سب درہم و برہم ہو گئے۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ (قاضی محمد صادق خان اختر کے بیان کے مطابق) تمام عمال بدکار و بدباطن اور خود غرض تھے۔ رعایا تباہ تھی۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر تھا۔ ظالم و مجرم کو سزا نہ ملتی۔ خزانہ خالی تھا۔ رشوت ستانی کی گرم بازاری تھی۔ اور جو فتنے پیدا ہوتے کسی کے مٹائے نہ مٹ سکتے۔

لیکن اس اتقا کی خاموشی اور تماری غفلت و بے پروائی پر بھی اُنھون نے محلۂ حضرت گنج آباد کیا جو آج لکھنؤ مین تمام محلون سے زیادہ صاف ستھرا خوب آباد۔ نہایت خوبصورت۔ دولتمند تاجرون کا اعلیٰ ترین بازار ہے اور سول لائن کا سب سے زیادہ بارونق حصہ ہے۔ اُنھون نے لکھنؤ سے کانپور تک براہ راست ایک پختہ سڑک بنوائی۔ اُنکے عہد مین سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ لوہے کے پل کی عمارت بن کے تیار ہو گئی۔ اس پل کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ اسکے اجزا اوپر سے غازی الدین

حیدر نے انگلستان سے منگوائے تھے۔ مگر وہ پرزے جب تک لکھنؤ مین پہونچین
بادشاہ رہگرائے عالم جاودان ہو چکے تھے۔ نصیرالدین حیدر کے عہد مین جب
وہ پرزے ولایت سے آئے تو اُنھون نے اپنے دربار کے انجنیر مسٹر سنکلیر کو ان
پرزون کے جوڑنے اور پل کو بناکے کھڑا کردینے کا ٹھیکہ دیا۔ اور حکم دیا کہ وہ پرزے
رزیڈنسی کے سامنے پار دریا کے کنارے ڈال دیے جائین۔ جس مقام پر پل
کے یہ آہنی پرزے ڈالے گئے تھے اُس جگہ کا پتہ دینے کے لیے آج وہین ایک
گھاٹ اور شوالہ قائم ہے۔ مسٹر سنکلیر نے دریا کے اندر ستون قائم کرنے کے لیے
گہرے کنوئین کھدوائے۔ اور ستونون کی جوڑائی بھی کرلائے۔ مگر اس کے بعد ان
سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی اور پل کی تکمیل مین ناکامی ہوئی۔ محمد علی شاہ کے
زمانے مین یہ پل ناتمام پڑا رہا۔ مگر امجد علی شاہ نے اپنے عہد مین اس کی جانب
توجہ کی اور پل بن کے تیار ہوگیا۔ لیکن جو لوہے کا پل آج کل قائم ہے وہ
امجد علی شاہ کے زمانے کا پل نہین ہے۔ وہ ایک ہینگنگ برج یعنی لٹکنے والا
والا پل تھا۔ جس کا سارا بار چار بلند اور زبردست آہنی کھمبون پر لٹک رہا تھا۔
انگریزی زمانے مین جب اُس کے پرزے زنگ آلود ہو کے کمزور ہوے اور
اُس پر عام آمد و رفت مین خطرہ نظر آیا تو اُسے منہدم کرا کے اُس کی جگہ دوسرا
آہنی پل قائم کیا گیا۔ اور وہی پل اس وقت موجود ہے۔

امجد علی شاہ ہی کے زمانے مین اُن کے وزیر امین الدولہ نے امین آباد آباد
کیا۔ جس کی آبادی و رونق آج کل روز افزون ترقی کر رہی ہے۔ امجد علی شاہ
نے اپنے زمانے مین اگرچہ کچھ نہین کیا اور نہ اپنے شوق سے کوئی ایسی عمارت
بنوائی جو آج کل اُن کی یادگار ہو۔ مگر شاید اپنے اتقا و پرہیزگاری کے صلے
مین اُنھین یہ قدرتی ناموری حاصل ہوگئی کہ لکھنؤ کے آج کل کے دو سب سے
زیادہ مشہور۔ سب سے زیادہ آباد۔ سب سے زیادہ بارونق۔ اور سب سے زیادہ
دولتمند محلے امین آباد اور حضرت گنج اُنھین کے عہد کی یادگار ہین۔

آخر زمانے نے اُن کے دور کا ورق بھی اُلٹا۔ اور سنہ ۱۲۶۳ محمدی (سنہ ۱۸۴۷ء)
مین جبکہ عمر اڑتالیس برس سے کچھ ہی دن زیادہ تھی مرض سرطان مین مبتلا ہو کے

دنیا سے رخصت ہو گئے - اور اپنے آباد کیے ہوے محلّے حضرت گنج مین مینڈو خان رسالدار کی چھاؤنی کے اندر دفن ہوے - اُن کا امام باڑہ جس مین وہ مدفون ہین حضرت گنج کے مغربی حصے مین لب سڑک موجود ہے جس کی عمارت اُن کی وفات کے بعد واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپیہ صرف کر کے بنوائی تھی - یہ امام باڑہ حسین آباد کی ایک ناقص نقل ہے - اور اگر حسین آباد کی طرح اس مین بھی روشنی ہوتی تو محرم مین لکھنؤ کا مشرقی حصہ بھی عالم نور بنجایا کرتا - اگرچہ اُس کے لیے کوئی وثیقہ نہین معین ہے لیکن اس کی آمدنی بھی کم نہین - احاطے کی عمارت کے بیرونی رُخ کی دوکانون مین بہت سے اچھے اچھے تاجرون کی دُکانین ہین - اور اندرونی عمارتون مین بہت سے پوزشین وغیرہ رہتے ہین - جن سے کرائے کی معقول رقم وصول ہوتی ہے - مگر کرایہ وصول کرنے والون کا یہ بھی احسان ہے جو محرم مین خاص قبر اور امام باڑے مین چند چراغ روشن کر دیا کرتے ہین -

(اب امجد علی شاہ کے بڑے بیٹے واجد علی شاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوے - اُن کا زمانہ اس مشرقی دربار کی تاریخ کا آخری ورق اور اسی مرثیۂ باستان کا آخری بند ہے - چونکہ انتزاع سلطنت اُنھین کے عہد مین ہوا اسلیے تمام اہل الراے کے ہدف سہام اور نشانۂ ملامت وہی بنگئے - اور قریب قریب تسلیم کر لیا گیا کہ زوال سلطنت کا باعث وہ تھے - لیکن جس زمانے مین انکی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہے اُن دنون ہندوستان کی تمام وطنی قوتین ٹوٹ رہی تھین - اور بُری بھلی سب طرح کی قدیم حکومتین دنیا سے مٹتی جاتی تھین پنجاب مین سکھون کا اور دکن مین مرہٹون کا دفتر کیون اُلٹا؟ جو بہادر اور زبردست اور ہوشیار مانے جاتے ہین - دہلی مین مغل شہنشاہی کا اور بنگالہ مین نواب ناظم بنگالہ کا استیصال کیون ہوا؟ حالانکہ اُن مین اتنی طفلانہ مزاجی نہ تھی جتنی کہ لکھنؤ کے اریکہ آراے سلطنت مین بتائی جاتی ہے - مذکورہ چارون دربارون مین کوئی واجد علی شاہ نہ تھا - حالانکہ اُنکی تباہی لکھنؤ کی تباہی سے کم نہ تھی -

اصل یہ ہے کہ اس عہد مین اودھ اہل ہند کی غفلت وجہالت کا پیمانہ چھلکنے

کے قریب پہونچ گیا تھا اور اُدھر دولت برطانیہ کی قوت اور برٹش قوم کی عاقبت اندیشی۔ قابلیت۔ جفاکشی اپنی کوششون اور اپنی اعلی تہذیب وشایستگی کا ثمرہ پانے کی روز بروز مستحق ثابت ہوتی جاتی تھی۔ غیرممکن تھا کہ دانایان فرنگ کی ذہانت وطباعی۔ خوش تدبیری وبا منابطگی ہندوستان کی جہالت وخود فراموشی پر فتح نہ پاتی۔ زمانے نے ساری دنیا مین تمدن کا نیا رنگ اختیار کیا تھا اور پکار پکار کے ہر ایک قوم سے کہہ رہا تھا کہ جو اِس مذاق مین میرا ساتھ نہ دے گا مٹا دیگا۔ زمانے کے اُس ڈھنڈورے کی آواز ہندوستان مین کسی نے نہ سُنی۔ اور سب مٹ گئے۔ انھین مٹنے والون مین اودھ کی سلطنت بھی تھی۔ جسکے زوال کا بار غریب واجد علی شاہ پر ڈال دینا محققانہ مذاق کے خلاف ہے۔

ابند شروع باپ نے واجد علی شاہ کو بھی علما کی صحبت مین رکھکے اپنا سا بنانا چاہا تھا۔ اور یہ رنگ ایک حد تک واجد علی شاہ پر چڑھا بھی جو اقتضا سے عمر کے ساتھ زیادہ کھلتا گیا۔ مگر امجد علی شاہ کا اس مین کچھ زور نہ چلا کہ وارث سلطنت فرزند کا فطری رُجحان عیاشی اور فنون طرب ونشاط کی طرف تھا۔ اگرچہ باپ کی تاکید سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم بھی اچھی تھی۔ لیکن موسیقی کا شوق غالب تھا۔ ولیعہدی ہی مین اپنے ذاتی شوق سے اُنھون نے باپ کے منشا کے خلاف گویون اور ڈھاڑیون کو اپنی صحبت مین رکھا۔ گانا بجانا سیکھا۔ آوارہ عورتون اور ڈوم ڈھاڑیون سے ربط وضبط بڑھایا۔ اور انجام یہ ہوا کہ جو لطف اُنھین حسین عورتون اور گویون کی صحبت مین آتا علمی مذاق کی مہذب صحبتون مین نہ آتا۔

باپ کے خلاف انھین عمارت کا بھی شوق تھا۔ اور ولیعہدی ہی مین انھون نے خاص اپنی محفل طرب اور عیش کے لیے ایک پُرفضا باغ اور اُس مین دو ایک مختصر۔ خوبصورت اور پُرتکلف مکان بنوائے۔ علی نقی خان جنھین تخت پر بیٹھتے ہی خلعت وزارت عطا کیا اُن سے زمانۂ ولیعہدی مین ایک رنڈی کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ اُنکی جوانانہ شوخ مزاجی نے مزاج مین رسوخ پیدا کیا اور جب مذکورۂ بالا باغ اور عمارت اُنکے اہتمام مین تعمیر ہو کے پسند آئی تو سمجھ لیا گیا کہ وزارت اور انتظام مملکت کے لیے اُن سے زیادہ موزون کوئی شخص نہین ہے۔

واجد علی شاہ کی سلطنت کا آغاز تو اس عنوان سے ہوا کہ نوجوان بانکے بادشاہ کو عدالت گستری اور اصلاحِ فوج کی طرف غیر معمولی توجہ تھی۔ سواری میں آگے آگے دو نقرئی صندوقچے چلتے۔ جس کسی کو کچھ شکایت ہوتی عرضی لکھ کے اُن میں ڈال دیتا۔ کنجی خود بادشاہ کے پاس رہتی۔ محل میں پہونچ کے حضور اُن عرضیوں کو نکالتے اور اپنے ہاتھ سے احکام تحریر فرماتے۔ اس طرح کئی سنتے رسالے اور کئی پلٹنیں بھرتی ہوئیں۔ رسالوں کے نام بادشاہ نے اپنی نشایانہ طباعی سے بانکا۔ ترچھا۔ گھنگھور رکھے۔ اور پلٹنوں کے نام اختری۔ نادری رکھے گئے۔ خود بدولت بنفس نفیس گھوڑے پر سوار ہو کے جاتے اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑے ہو کے اُنکی قواعد اور فنون جنگ میں اُنکی مشاقی دیکھتے۔ اور خوش ہو ہو کے باکمال سپاہیوں کو انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے۔ فوجی قواعد کے لیے خود ہی فارسی اصطلاحات اور کلمات مقرر کیے۔ "راست رو" "پس بیا" "دست چپ بگرد"۔ چند روز بعد جوان حسین عورتوں کی ایک چھوٹی زنانی فوج مرتب کی گئی اور اُن کو بھی انھیں اصطلاحوں میں قواعد سکھائی گئی۔

مگر جدید عہد کا یہ نقش اوّلین چند روزہ تھا۔ پورا ایک سال بھی نہ گذرا ہوگا کہ طبیعت ان چیزوں سے اُکتا گئی۔ زمانۂ ولیعہدی کا وہی پرانا مذاق پھر عود کر آیا۔ حسین اور آوارہ عورتوں سے صحبت بڑھی۔ ارباب نشاط کا بازار گرم ہوا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ڈوم ڈھاڑی ہی ارکان دولت اور معززین سلطنت تھے۔ بادشاہ کے دل میں اب اگر کوئی علمی اور شریفانہ مذاق باقی تھا تو وہ شاعری تھی۔ کیونکہ خود شعر کہتے اور شعرا کی قدر کرتے تھے۔

لکھنؤ میں اُن دنوں شاعری کا چرچا حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اکیلے لکھنؤ میں اتنے شاعر موجود تھے کہ اگر سارے ہندوستان کے شعرا جمع کیے جاتے تو اُنکی تعداد لکھنؤ کے شاعروں سے نہ بڑھ سکتی۔ میر اور سودا کی پرانی شاعری تقویم پارینہ ہو چکی تھی۔ اب ناسخ کی زبان اور آتش کے خیالات دماغوں میں بسے ہوے تھے جن میں رند و صبا کے رندانہ کلام اور نواب مرزا شوق کی مثنویوں نے شہوت پرستیوں کی روح پھونک دی تھی۔ اور اسی مذاق کو بادشاہ کی طبیعت کا اصلی

رنگ چاہتا اور پسند کرتا تھا۔

اسلامی شاعری کا رنگ خلافت اسلامیہ کی پہلی صدی تک تو یہ تھا کہ شاعر ایک خاص عورت پر عاشق ہوتے۔ اُس کا نام لے لے کے اُسکے حسن کی خوبیوں اور اُس کی اداؤں کی دلفریبیوں کو بیان کرتے۔ اور اُسکی طرف خطاب کر کر کے اپنی تمناؤں اور بیقراریوں کو ظاہر کرتے۔ اکثر چھپ چھپ کے اُس سے ملتے مگر تہذیب و عفت کے دائرے سے کبھی قدم باہر نہ نکالتے۔ چند روز بعد عرب ہی میں معشوق گمنام ہو گیا۔ اور عموماً شعرا کا معشوق اُنکے خیال کا ایک پُتلا بن گیا جسے رند مشرب تو کوئی حسین عورت یا کوئی خوبرو لڑکا بتاتے۔ مگر صوفی تھوڑی سی معنوی تاویل کر کے اُسے اپنا حسین مطلق یعنی خلاق عالم بتا دیتے۔ یہی سمویا ہُوا چھپا ڈھکا مذاق رندی فارسی شاعری میں رہا۔ اور یہی مذاق اس وقت تک اُردو شاعری کا بھی تھا۔ مگر نواب مرزا شوق نے اپنی شاعری کو حسین پردہ دار عورتوں پر عاشق ہو کے اُنکے خراب کرنے کا آلہ بنایا۔ اور قیامت یہ تھی کہ اُنکی مثنویوں کی زبان ایسی خوبصورت۔ بے تکلف۔ اور شستہ و رُفتہ تھی اور اُن میں عاشقانہ جذبات اس کثرت سے بھر دیے گئے تھے کہ مہذب و شائستہ لوگوں سے بھی بے دیکھے اور مزہ لیے نہ رہا جاتا۔

واجد علی شاہ نے بھی اِن مثنویوں کو دیکھا اور چونکہ ماشاءاللہ خود شاعر تھے اس رنگ کو اختیار کر کے اپنے بہت سے عشقوں اور اپنی عنفوان شباب کی صدہا رندانہ بے اعتدالیوں کو خود ہی موزوں کر کے ملک میں پھیلا دیا۔ اور اخلاقی دنیا میں اقراری مجرم بن گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بادشاہ تو بادشاہ وزرا و اُمرا میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے گذرے ہونگے جنھوں نے عنفوان شباب میں اپنی شہوت پرستی کی ہوسوں کو جی بھر کے نہ نکال لیا ہو۔ مگر واجد علی شاہ کی طرح کسی نے اپنے ان بے شرمی کے جرائم کو خود ہی پبلک کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ واجد علی شاہ نثر میں آئے تو چاہے شاعری میں نہ بڑھ سکیں مگر اپنے جذبات و خیالات اور اپنے کارناموں کے عالم آشکارا کرنے میں نواب مرزا سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ اور یہاں تک ترقی کی کہ بعض موقعوں پر انھیں مبتذل بازاری مذاق اور فحش

الفاظ کے استعمال مین بھی تامل نہین ہوتا۔
وہ کہاریون۔ رنڈیون۔ خواصون۔ محل مین آنے جانے والی عورتون۔ غرض صدہا عورتون پر عاشق ہوے۔ اور چونکہ ولیعہدِ سلطنت تھے اپنے عشق مین خوب کامیاب ہوے۔ جن کی شرمناک داستانین اُن کی نظمون۔ تحریرون۔ اور تصنیفون مین خود اُن کی زبان سے سُن لی جا سکتی ہین۔ اور یہی سبب ہے کہ تاریخ مین اُن کا کیرکٹر سب سے زیادہ ناپاک و تاریک نظر آتا ہے۔

چونکہ عمارت کا بیحد شوق تھا۔ اس لیے تخت نشین ہوتے ہی قیصر باغ کی عمارت بنوانا شروع کر دی۔ جو چاہے آصف الدولہ کی عمارتون کی طرح مضبوط نہ ہو مگر خوبصورتی اور شانداری مین لاجواب ہے۔ اس مین بہت سی خوشنما اور باشان و شوکت دو منزلی عمارتون کا ایک مربع مستطیل رقبہ دور تک چلا گیا تھا۔ جس کا ایک رُخ جو دریا کی جانب تھا غدر کے بعد کھود ڈالا گیا۔ اور تین ضلعے اب تک قائم ہین۔ جن کو مختلف قطعات پر بانٹ کے گورنمنٹ نے تعلقداران اودھ کے حوالے کر دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ اُن مین رہین اور اُنکو اُسی وضع مین قائم و برقرار رکھین۔

قیصر باغ کا اندرونی صحن جس مین چمن بندی تھی جلوخانہ کہلاتا تھا۔ درمیان مین پتھر والی بارہ دری تھی جو آج کل لکھنؤ کا ٹاؤن ہال ہے۔ اس مین اور کئی عمارتین بھی تھین جو اب نہین باقی ہین۔ اس کے باہر میدان سے متصل ہی بہت سی شاہی عمارتین تھین جنھون نے اس قطعۂ زمین کو اعجوبۂ روزگار بنا دیا تھا۔ یہ عمارتین قیصر باغ کے مشرقی پھاٹک کے باہر تھین۔ لوگون کو اس پھاٹک سے نکلتے ہی دونون جانب چوبی اسکرینین ملتی تھین جن مین سے گذر کے وہ چینی باغ مین پہونچتے۔ وہان سے بائین ہاتھ کی طرف مڑ کر آپ جل پریون کے ایک عالیشان پھاٹک پر پہونچتے۔ جس پر مدار المہام سلطنت نواب علی نقی خان کا قیام رہتا تھا۔ تاکہ ہر وقت جہان پناہ سے قریب رہین اور بوقت ضرورت فوراً بلا لیے جا سکین۔ اس پھاٹک کے اُس طرف حضرت باغ تھا۔ اور اندر ہی داہنی طرف چاندی والی بارہ دری تھی۔ یہ ایک معمولی اینٹ چونے کی عمارت تھی مگر چھت مین چاندی کے پتر جڑے ہونے کی وجہ سے

چاندی والی بارہ دری کہلاتی - اسی سے ملحق کوٹھی خاص مقام تھی جس مین خود جہان پناہ سلامت رہتے - اور وہین نواب سعادت علی خان کی بنائی ہوئی پُرانی کوٹھی بادشاہ منزل تھی -

پھر ان چوبی اسکرینون کے گلیارے سے نکل کے دوسری طرف مُڑیئے تو پیچیدہ عمارتون کا ایک سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا جو چوتکھی کے نام سے مشہور تھین - ان عمارتون کا بانی حضوری نائی عظیم اللہ تھا جنھین بادشاہ نے چار لاکھ روپیہ دے کے مول لیا تھا - نواب خاص محل اور معزز محلات عالیات اس مین رہتی تھین اسی کے اندر غدر کے زمانے مین حضرت محل کا قیام رہا اور یہین اُن کا دربار ہوا کرتا تھا -

جہان ہے ایک سڑک قیصر باغ کی طرف آتی تھی جس کے کنارے ایک بڑا بھاری سایہ دار درخت تھا اُسکے نیچے گرداگرد سنگ مرمر کا ایک نفیس گول چبوترہ بنایا گیا تھا - جس پر قیصر باغ کے میلون کے زمانے مین جہان پناہ جوگی بن کے اور گیروے کپڑے پہن کے آتے اور دھونی رما کے بیٹھتے - اس چبوترے سے آگے بڑھ کے ایک عالیشان پھاٹک تھا جو لکھی پھاٹک کہلاتا - اس لیے کہ اس کی تعمیر مین ایک لاکھ روپے صرف ہوے تھے - اور اس سے بڑھ کے آپ پھر قیصر باغ مین آجاتے - قیصر باغ کی عمارت مین سلطنت کے آتی لاکھ روپے صرف ہوے تھے - اور اُسکے چارون طرف کی عمارتون مین جہان پناہ کی بیگمین اور پریجمال و ماہ طلعت خاتونین رہتین جن کی جگہ اب عجیب و غریب صورتون کو دیکھ کے بعض پُرانے زمانے والے کہہ اُٹھا کرتے ہین

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز   بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی ست

قیصر باغ کے مغربی پھاٹک کے باہر روشن الدولہ کی کوٹھی تھی - جسے واجد علی شاہ نے ضبط کر کے اس کا نام قیصر پسند رکھ دیا تھا - اور اُنکی ایک محبوبہ نواب معشوق محل اُس مین رہتی تھین - اب اُس مین صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی عدالت ہے - اُسکے سامنے ورقیصر باغ کے س مغربی پہلو پر بھی ایک دوسرا جلوخانہ تھا -

سال مین ایک مرتبہ قیصر باغ مین ایک عظیم الشان میلا ہوتا جس مین پبلک کو بھی قیصر باغ مین آنے اور جہان پناہ کی عشرت پرستیون کا رنگ دیکھنے کا موقع ملجاتا - بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس جو ہندوؤن مین مروج ہے دیکھا تھا - اور دوسرے

کرشن جی کی معشوقانہ وش عاشقی اس قدر پسند آ گئی تھی کہ اُس رہس سے ڈراما کے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا تھا جس مین خود کنھیا بنتے۔ مخدرات عصمت آیات گوپیان بنتین۔ اور ناچ رنگ کی محفلین گرم ہوتین۔ کبھی جوش جوانی کے جذبات سے جوگی بن جاتے۔ موتیون کو جلا کے بھبوت بنائی جاتی۔ جس کی بدولت فقیری مین بھی شاہی کے کرشمے نظر آتے۔ میلے کے زمانے مین ان صحبتون مین شریک ہونے کی عام اہل شہر کو اجازت ہو جاتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ گیروے کپڑے پہن کے آئین جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسّی اسّی برس کے بُڈھے بھی شنگرفی کپڑے پہن کے چھیلا بن جاتے اور بادشاہ کی جوانی کے بادۂ طرب سے اپنے بڑھاپے کا جام بھر لیتے۔

یہی رنگ چلا جاتا تھا اور لکھنؤ مین کمال بے فکری کے ساتھ رنگ رلیان منائی جا رہی تھین کہ گورنمنٹ برطانیہ کو رزیڈنٹون نے یہان کے حالات سے آگاہ کیا اور وہان کے بورڈ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ملک اودھ قلمرو برطانیہ مین شامل کر لیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کے لیے انگریزی فوج لکھنؤ مین آئی۔ اور یکایک خلاف توقع بادشاہ کو حکم سُنایا گیا کہ "آپ کا ملک انگریزی ممالک محروسہ مین شامل کر لیا گیا۔ آپ کے لیے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور آپ کے جلوسی لشکر کے لیے تین لاکھ روپیہ ماہوار جو آپ کی اور وابستگان دامن کی ضروریات کے لیے بخوبی کافی ہے مقرر کی گئی۔ اور آپ کو اجازت ہے کہ شہر کے اندر آرام سے بےفکرے بن کے بیٹھے اور رعایا کی فکرون سے آزاد ہو کے بےغل وغش رنگ رلیان منائیے۔" یہ احکام سنتے ہی شہر مین سناٹا ہو گیا۔ خود بادشاہ نے رو دھو کے بہت کچھ عذرخواہی کی۔ بادشاہ کی مان اور خاص محل نے حق وکالت ادا کیا مگر گورنر جنرل بہادر کے حکم مین ردوبدل کرنا صاحب رزیڈنٹ کے اقتدار سے باہر تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ نے بغیر کسی زحمت و مزاحمت کے ملک اودھ پر قبضہ کر لیا۔ اور بادشاہ مع اپنی والدہ۔ بعض خاص خاص محلات اور جان نثار رفقا کے کلکتے روانہ ہوے کہ انگلستان جا کے اپیل کرین اور اپنی بےگناہی ثابت کر کے انتزاع سلطنت کے حکم کو منسوخ کرائین۔

(۸)

واجد علی شاہ کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ تاج و تخت سے جدا ہوتے ہی آخر

۱۲۷۲ہ محمدی (۱۸۵۶ء) میں لکھنؤ چھوڑ کے کلکتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ تاکہ اپنے معاملے میں باضابطہ پیروی کریں۔ اور گورنر جنرل ہند کے دربار سے کامیابی نہ ہو تو لندن پہونچ کے مقدمے کو پارلیمنٹ اور ملکۂ انگلستان کے سامنے پیش کر دیں۔ چنانچہ جب کلکتے میں کام نہ نکلا تو انگلستان کا قصد کیا۔ مگر اطبا نے بحری سفر کو بادشاہ کے لیے مضر تصور کیا۔ اور مشیروں نے روکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بادشاہ تو کلکتے ہی میں ٹھہر گئے مگر اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ ولی عہد کو انگلستان روانہ کیا۔ اس سفر میں میرے نانا منشی قمر الدین صاحب مرحوم بھی اس خانمان برباد شاہی قافلے کے ہمراہ تھے بادشاہ کو سرکار انگریزی کی مجوزہ تنخواہ لینے سے انکار تھا اور اڑے ہوئے تھے کہ ہم تو اپنا تاج و تخت ہی لیں گے جو بے قصور چھینا گیا ہے۔

بادشاہ کلکتے میں تھے۔ اُن کا خاندان لندن میں تھا۔ اور معاملہ زیر غور تھا کہ یکایک کارتوسوں کے جھگڑوں اور گورنمنٹ کی ضد نے ۱۲۷۳ہجری (۱۸۵۷ء) میں غدر پیدا کرا دیا۔ اور میرٹھ سے بنگالے تک ایسی آگ لگی کہ اپنے پرائے سب کے گھر جل اُٹھے۔ اور ایسا فتنۂ عظیم پیدا ہوا کہ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کی بنیاد ہی متزلزل نظر آتی تھی۔ جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی ہر طرف سے سمٹ کے دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ظفر شاہ کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا ویسے ہی الہ آباد و فیض آباد کے باغی سنہ ۱۸۵۷ء میں جوش و خروش کے ساتھ لکھنؤ پہونچے۔ اُنکے آتے ہی یہاں کے بھی بہت سے بیفکرے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور شاہی خاندانِ اودھ کا اور کوئی رکن نہ ملا تو واجد علی شاہ کے ایک دس برس کے نابالغ بچے مرزا برجیس قدر کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور اُن کی ماں نواب حضرت محل سلطنت کی مختار کل بنیں۔ تھوڑی سی انگریزی فوج جو یہاں موجود تھی اور اُسکے ساتھ یہاں کے تمام یوروپین عہدہ داران مملکت جو باغیوں کے ہاتھ سے جان بر ہوسکے بیلی گارد میں قلعہ بند ہو گئے۔ جس کے گرد باغیوں کے پہونچنے سے پہلے ہی دھس بنا لیے گئے تھے۔ اور حفاظت دلیسر کا کافی بندوبست کر لیا گیا تھا۔ غنیمت ہوا یا یہ کہیے کہ قسمت اچھی تھی کہ واجد علی شاہ لکھنؤ سے جا چکے تھے۔ ورنہ وہی خواہ مخواہ بادشاہ بنائے جاتے۔ اُن کا حشر ظفر شاہ سے بھی بدتر ہوتا۔ اور اودھ کے پریشان بختوں کو ذرا

بیٹھنے کے لیے مٹیا برج کے دربار کا جو ایک عارضی سہارا مل گیا تھا یہ بھی نہ نصیب ہوتا۔ اب لکھنؤ میں انگریزوں کی باغی فوج کے علاوہ اودھ کے اکثر زمیندار و تعلقدار اور عہد شاہی کے برطرف شدہ سپاہی کثرت سے جمع تھے۔ اور اُن میں شہر کے بہت سے اوباشوں اور ہر طبقے کے لوگوں کا طوفان بے تمیزی بھی شریک ہو گیا تھا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑے سے انگریزوں پر ایک خدائی کا زغہ ہے۔ مگر فرق یہ تھا کہ محاصرہ کرنے والوں میں سوا اوباش اہل شہر اور بے اصول و خودسر مدعیان شجاعت کے ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو اصول جنگ سے واقف ہو۔ اور تمام منتشر قوتوں کو یکجا کر کے ایک باضابطہ فوج بنا سکے۔ بخلاف اسکے انگریز اپنی جان پر کھیل کے اپنی حفاظت کرتے سر ہتھیلی پر لے کے حملہ آوروں کو روکتے تھے۔ اور جدید اصول جنگ سے بخوبی واقف تھے۔

اب لکھنؤ میں برجیس قدر کا زمانہ اور حضرت محل کی حکومت تھی۔ برجیس قدر کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ عہدہ داران سلطنت مقرر ہوے۔ ملک سے تحصیل وصول ہونے لگی۔ اور صرف تفنن طبع کے طور پر محاصرے کی کارروائی بھی جاری تھی۔ لوگ حضرت محل کی مستعدی و نیک نفسی کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتی اور اُن کے کام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی تھیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کے فوج کی سپہ سالاری کرتیں۔ مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا۔ اور کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا۔ انگریزی فوج کے باغی اس غرور میں تھے کہ یہ فقط ہمارے دم کا ظہور ہے۔ اصلی حاکم ہم ہی ہیں۔ اور جسکے سر پر جوتا رکھ دیں وہی بادشاہ ہو جائے۔ احمد اللہ نام ایک شاہ صاحب جو فیض آباد کے باغیوں کے ساتھ آئے تھے اور کئی معرکوں میں لڑ چکے تھے وہ الگ اپنا رعب جما رہے تھے بلکہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ برجیس قدر کے مقابل لکھنؤ ہی میں اُن کا دربار الگ قائم تھا اور دونوں درباروں میں پولیٹیکل اختلاف کے ساتھ شیعہ سنی کا جھگڑا اور تعصب بھی نمایاں ہونے لگا۔ غرض بادشاہ اور شاہ صاحب میں رقابت بڑھتی جاتی تھی۔ آخر اسی سال نومبر کے مہینے میں برجیس قدر کی تخت نشینی کو چھ ہی سات مہینے ہوے تھے کہ انگریزی

فوج لکھنؤ پر تسلط حاصل کرنے کے لیے آ گئی۔ جسکے ساتھ پنجاب کے سکھ اور پٹھان کے پہاڑی بھی تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ انھین لوگون نے زیادہ مظالم کیے۔ دو ہی تین دن کی گولہ باری مین نئی سلطنت کا جو نقش قائم ہوا تھا مکڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ کے رہ گیا۔ ہزارہا مفرورین کے ساتھ حضرت محل اور برجیس قدر نیپال کی طرف بھاگ گئے۔ شاہ صاحب نے دو تین دن لڑ لڑ کے اگرچہ برجیس قدر کے لیے آزادی سے بھاگنے کا موقع پیدا کر دیا مگر خود اپنی جان نہ بچا سکے۔ شکست کھا کے بھاگے باڑی اور محمدی ہوتے ہوے پوائین مین پہونچے۔ وہان کسی نے گولی مار دی۔ پوائین کے راجہ نے سر کاٹ کے انگریزون کے پاس بھیجا اور صلے مین انعام و جاگیر پائی۔

آبادی کو باغیون سے صاف کرنے کے لیے انگریزون نے شہر مین سخت گولہ باری کی۔ ساری رعایا گھبرا اٹھی۔ زن و مرد گھر چھوڑ چھوڑ کے بھاگے۔ اور ایک ایسی قیامت بپا ہو گئی کہ جن لوگون نے دیکھا ہے آج تک یاد کر کے کانپ جاتے ہین۔ محلون کی بیٹھنے والیان جن کی صورت کبھی آفتاب تک نے نہ دیکھی تھی برہنہ پا جنگلون کی خاک چھانتی پھرتی تھین۔ بیکسی مین ایک ایک کا دامن پکڑتی تھین۔ اور جو ملتا تھا دشمن ہی ملتا تھا۔ اور سعدی کا یہ مصرعہ پوری طرح صادق آ رہا تھا کہ "یاران فراموش کردند عشق"۔ اسی حالت مین فتحیاب فوج نے شہر کو لوٹا۔ اور بعد خرابی بصرہ خدا خدا کر کے لوگون کو پھر اپنے گھرون مین آنے کی اجازت ملی۔ اب ایک تہلکہ کے بعد جو امن قائم ہوا تھا وہ بفضلہ تعالیٰ آج تک قائم اور روز بروز ترقی کر جاتا ہے۔ لیکن پرانی دولت کے وابستگان دامن اور امرائے شاہی جو انقلاب سلطنت کے بعد بالکل بیکار ہو گئے اور نئی سلطنت سے فائدہ اٹھانے کی لیاقت نہ رکھتے تھے مٹتے ہی چلے گئے۔ چنانچہ بڑے بڑے دولتمند اور معزز گھرانون کے پامال و تباہ ہونے کا سلسلہ مدت تک برابر جاری رہا۔ محلے کے محلے اجڑتے چلے جاتے تھے۔ اور خاندان کے بعد خاندان مٹ رہا تھا۔ اور اکثر لوگون کو یقین ہو گیا تھا کہ چند روز کے بعد لکھنؤ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن انجام مین سرکار انگریزی کی وہ تدبیرین جنھون نے ساری دنیا مین انگریزون کی نو آبادیان قائم کر دی ہین غالب

آئین اور لکھنؤ حوادث زمانہ کی دست بُردسے بچ کے پنپ گئے۔ جن کو مٹنا تھا مٹ گئے اور جو باقی رہے سنبھلنے کے قابل ہو گئے۔ اور اگر مسٹر بٹلر کے ایسے چند اور حاکم لکھنؤ کو مل گئے تو اُمید ہے کہ آیندہ بہت ترقی کرے گا۔

ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اسی سلسلۂ واقعات میں ہم واجد علی شاہ کی باقیماندہ زندگی اور اُنکے قیام کلکتہ کے حالات بھی اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر دین۔ کیونکہ بغیر اس کے اس تاریخ کا تکملہ نہیں ہو سکتا۔ کلکتے مین خود ہمارا بچپن بادشاہ کے ظلِ حمایت مین بسر ہوا ہے۔ اور گذشتہ واقعات کے حالات اگرہم نے لوگون سے سُن کے اور اوراق تاریخ مین پڑھ کے بیان کیے ہین تو آیندہ اکثر چشم دید حالات بیان کرین گے۔

کلکتے سے تین چار میل کی مسافت پر جنوب کی طرف دریاے بھاگا رتی (ہوگلی) کے کنارے "گارڈن ریچ" نام ایک خاموش محلہ ہے۔ اور چونکہ وہان ایک مٹی کا تودہ سا تھا اس لیے عام لوگ اُسے مٹیا برج کہتے تھے۔ یہان کئی عالیشان کوٹھیان تھین جن کی زمین دریا کے کنارے کنارے تقریباً دو ڈھائی میل تک چلی گئی ہے جب واجد علی شاہ کلکتے مین پہونچے تو گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ کوٹھیان اُنھین دیدین دو خاص بادشاہ کے لیے۔ ایک نواب خاص محل کے واسطے اور ایک علی نقی خان کی سکونت کے لیے جو بادشاہ کے ساتھ تھے۔ اور ان کے گرد زمین کا ایک بڑا قطعہ جو عرض مین دریا کنارے سے تقریباً میل ڈیڑھ میل تک چلا گیا تھا اور اُس کا حلقہ چھ سات میل سے کم نہ ہوگا بادشاہ کو اپنے اور اپنے ملازمین کے قیام کے لیے دیا گیا۔ میونسپلٹی کی سڑک اس رقبے کو طولاً قطع کرتی تھی۔ وہ دو کوٹھیان جو بادشاہ کو دی گئی تھین اُنکے نام بادشاہ نے سلطان خانہ اور اسد منزل قرار دیے۔ اور نواب خاص محل کی کوٹھی پر بھی جب بادشاہ نے قبضہ کر لیا تو اُس کا نام مرصع منزل رکھا۔ اور علی نقی خان کی کوٹھی آخر تک اُنھین کے قبضے مین اور اُن کے بعد اُن کی اولاد خصوصاً نواب اختر محل کے قبضے مین رہی جو علی نقی خان کی بیٹی اور بادشاہ کی ممتاز بی بی بلکہ اُن کے دوسرے ولی عہد مرزا خوش بخت بہادر کی ماں تھین۔

غدر کے زمانے مین انگریزی فوج کے باغی افسرون نے ارادہ کیا کہ اگر بادشاہ
اُنکے حکمران بنین تو وہ کلکتے مین بھی غدر کر دین - مگر بادشاہ نے گورنمنٹ آف انڈیا
کے معاملے مین یہ روش نہ تخت وتاج سے جدا ہوتے وقت اختیار کی تھی اور نہ اب
پسند کی - بلکہ لاٹ صاحب کو اُن لوگون کے ارادے کی اطلاع کر دی جسپر اُن کا
شکریہ ادا کیا گیا - مگر دو ہی چار روز بعد مناسب سمجھا گیا کہ بادشاہ کو قلعہ فورٹ ولیم
مین رکھا جائے تاکہ پھر کبھی باغیون کی اُن تک رسائی نہ ہو سکے - لندن مین اُنکی
جانب سے جو مقدمہ پیش تھا وہ اس بنا پر ملتوی کر دیا گیا کہ جس ملک کے لیے یہ دعوی
ہے وہ اب ہمارے قبضے ہی مین نہین جب آسپر پھر دولت برطانیہ کا قبضہ ہولے گا
تب دیکھا جائے گا -

بادشاہ اس حراست ہی مین تھے کہ لکھنؤ کا غدر فرو ہو گیا - اور مسیح الدین خان
نے جو لندن مین بادشاہ کے مختار رعام تھے پھر اپنا دعوی پیش کیا - اُنھین بادی النظر
مین کامیابی اور استرداد سلطنت کی پوری امید تھی - مگر بدقسمتی سے اُن لوگون
مین جو قلعے مین بادشاہ کے مشیر اور مصاحب تھے خواہ کسی بیرونی تحریک سے یا
خود اپنے نفع کے خیال سے ایک سازش ہوئی - ان لوگون نے خیال کیا کہ اگر
مسیح الدین خان مقدمہ جیت گئے تو ہمارا بازار سرد پڑ جائے گا اور وہی وہ رہ جائینگے
لہذا سب نے بادشاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ "جہان پناہ بھلا کبھی کسی نے ملک لے
کے دیا ہے؟ مسیح الدین خان نے حضور کو دھوکے مین ڈال رکھا ہے - ہونا ہوانا
کچھ نہین ہے - اور جہان پناہ مفت مین تکلیف اُٹھا رہے ہین - ڈیڑھ دو سال
سے تنخواہ نہین لی ہے - ہر بات کی تنگی ہے - اور ہم ملازمان دولت بھی پیسے پیسے
کو محتاج ہین - مناسب یہ ہے کہ حضور گورنمنٹ انگریزی کی تجویزون کو قبول کر لین
اور تنخواہ وصول کر کے اطمینان و فارغ البالی سے اپنے محلات عالیات اور آسان
وسامان دولت کے ساتھ بسر فرمائین" بادشاہ کو خرچ کی تنگی تھی - اور بادشاہ سے
زیادہ اُن کے رفقا پریشان تھے - مصاحبون نے جب بار بار یہ تجویز پیش کی تو
بلا تکلف حضور ویسرائے کی خدمت مین لکھ بھیجا "مجھے سرکار انگریزی کی تجویزہ ماہوار
لینا منظور ہے - لہذا میری اس وقت تک کی تنخواہ دی جائے - اور مقدمہ جو لندن

مین دائر ہے خارج کیا جائے۔" جواب ملا" اب آپ کو اول تو گذشتہ ایام کی ماہوارنہ دی جائے گی۔ صرف اسی وقت سے ماہوار جاری ہو گی۔ دوسرے فقط بارہ لاکھ روپیہ سالانہ دیے جائین گے۔ اور جو تین لاکھ روپیہ سالانہ آپ کے ملازمین کے لیے تجویز کیے گئے تھے اب اُن کے دینے کی ضرورت نہین سمجھی جاتی"

بظن غالب بادشاہ اس نقصان کو گوارا نہ کرتے۔ مگر مصاحبون نے اس پر بھی راضی کر دیا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا نے انگلستان مین اطلاع دی کہ واجد علی شاہ نے گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کر لیا۔ لہذا اُن کا مقدمہ خارج کیا جائے۔ یہ واقعات مین نے خود اپنے نانا منشی قمرالدین صاحب کی زبان سے سنے ہین۔ جو جناب عالیہ کے ہمراہی دفتر کے میر منشی اور مولوی مسیح الدین خان کے نائب خاص تھے۔ اور کُل کارروائیان اُنھین کے ہاتھ سے عمل مین آتی تھین بادشاہ کے ماہوار پر راضی ہو جانے کی خبر جیسے ہی لندن مین پہونچی مسیح الدین خان کے حواس جاتے رہے۔ بادشاہ کی ماں۔ اُنکے بھائی۔ اور ولیعہد نے سر پیٹ لیا۔ اور حیران تھے کہ یہ کیا غضب ہو گیا۔ افسوس اس وقت تک کا سب کیا دھرا خاک مین ملا جاتا ہے۔ آخر مسیح الدین خان نے سوچتے سوچتے ایک بات پیدا کی۔ اور پارلیمنٹ مین یہ قانونی عذر پیش کیا کہ" بادشاہ فی الحال گورنمنٹ آف انڈیا کی حراست مین ہین اور ایسی حالت مین اُنکی کوئی تحریر پایۂ اعتبار کو نہین پہونچ سکتی" عذر معقول تھا۔ تسلیم کیا گیا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بادشاہ کے مختار کی عذرداری سے مطلع کیا گیا۔ ساتھ مین مسیح الدین خان اور تمام ارکان خاندان شاہی نے بادشاہ کو لکھا کہ" یہ آپ کیا غضب کر رہے ہین ہمین ملک اودھ کے واپس ملنے کی پوری اُمید ہے" اب عذر فرو ہو چکا تھا۔ گورنمنٹ نے بادشاہ کو چھوڑ دیا۔ اور وہ خوشی خوشی قلعے سے نکل کے مٹیا برج مین آئے۔ اور آزادی حاصل ہوئی ہی تھی کہ مصاحبون نے عرض کیا" حضور! مسیح الدین خان لندن مین یہ کہ رہے ہین کہ جہان پناہ نے تنخواہ لینے کو صرف قید ہونے کی وجہ سے منظور کر لیا ہے" یہ سنتے ہی بادشاہ نے برافروختہ ہو کے اُسی وقت لکھ بھیجا کہ" ہم نے آزادی سے برضا و رغبت گورنمنٹ کی تجویز کو منظور

لیا ہے۔ اور مسیح الدین خان کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے قید مین ہوتے یا کسی جبر و اکراہ کی وجہ سے منظوری دی ہے۔ لہذا ہم آیندہ کے لیے اُس مختارنامے ہی کو منسوخ کیے دیتے ہین جس کی رُو سے وہ ہمارے مختارِ عام بنائے گئے ہین "

اب کیا تھا؟ ساری کارروائی ختم ہو گئی۔ بادشاہ مٹیا برج مین رنگ رلیان منانے لگے۔ مصاحبون کے گھرون مین ہُن برسنے لگا۔ اور شاہی خاندان کا شکستہ حال قافلہ جو انگلستان مین پڑا ہوا تھا۔ قریب قریب وہین تباہ ہو گیا۔ اکثر ہمراہیون نے ساتھ چھوڑ دیا۔ بادشاہ کی ماں جناب عالیہ اس صدمے سے بیمار ہو گئین۔ اور اُسی بیماری مین چلین کہ ملک فرانس سے ہوتی ہوئی مقامات متبرکہ مین جائین۔ اور اُنکی زیارت سے شرفیاب ہو کے کلکتے پہونچین۔ مگر موت نے پیرس سے آگے قدم نہ بڑھانے دیا۔ وہین انتقال کیا۔ اور عثمانی سفارت خانۂ فرانس کی مسجد کے متصل مسلمانون کا ایک قبرستان ہے اُسی مین دفن ہوئین۔ مرزا سکندر حشمت کو مان کے مرنے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ مان کے مرتے ہی خود بھی بیمار پڑ گئے۔ اور مان کے چودہ پندرہ روز بعد وہ بھی مان کے برابر یوم جزا کا انتظار کرنے کے لیے لٹا دیے گئے۔ اکیلے مرزا ولی عہد بہادر کلکتہ واپس آکے ماں باپ سے ملے۔

کہتے ہین کہ ابتداءً مٹیا برج مین بھی بادشاہ کی زندگی نہایت ہی بیدار مغزی اور ہوشیاری کی تھی۔ یہ حالت دیکھ کے گرد و پیش کے لوگون نے چند آلاتِ موسیقی فراہم کر دیے۔ فوراً سرود دبستان یاد دہانیدن کا پورا پورا مضمون صادق آگیا۔ اور اربابِ نشاط کا گروہ وہان بھی جمع ہونے لگا۔ ہندوستان کے اچھے اچھے گوَیّے آکے ملازم ہوے اور مٹیا برج مین موسیقی دانون کا ایسا مجمع ہو گیا تھا کہ اور کسی جگہ نہ تھا۔

خوبصورت عورتون کے جمع کرنے اور حسن و عشق کے کرشمون مین پھنسے رہنے کا وہان بھی ویسا ہی شوق تھا جیسا کہ لکھنؤ مین سنا جاتا ہے۔ مگر مٹیا برج مین اس شوق مین مذہبی احتیاط کا پورا لحاظ رہتا۔ بادشاہ شیعہ تھے۔ اور شیعون کی شرع مین متعہ بغیر کسی تحدید اور روک کے جائز ہے۔ اس مذہبی آزادی سے فائدہ اٹھا کے بادشاہ جی بھر کے اپنا شوق پورا کر لیتے۔ اور قاعدہ تھا کہ غیر ممتوعہ عورت کی صورت

تک دیکھنا گوارا نہ کرتے۔ یہ احتیاط اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک جوان بہشتن جو بادشاہ کے سامنے زنانے مین پانی لاتی اُس سے بھی متعہ کر کے اُسے نواب آب رسان بیگم کا خطاب دے دیا۔ ایک جوان خاک روبن جس کی حضوری مین آمد و رفت رہتی وہ بھی ممتوعات مین داخل ہو کے نواب مصفّا بیگم کے خطاب سے سرفراز ہوئی۔ اسی طرح موسیقی کا شوق بھی ممتوعات ہی تک محدود رہتا۔ شاید شاذ و نادر ہی اس کا اتفاق ہوا ہو گا کہ بادشاہ نے کبھی کسی بازاری طوائف کا مُجرا دیکھا ہو۔ خود ممتوعات کی مختلف پارٹیان بنا دی گئی تھین جن کو مختلف طرز پر رقص و سرود کی تعلیمین دی جاتی تھین۔ ایک رادھا منزل والیان۔ ایک جھومر والیان۔ ایک لٹکن والیان۔ ایک سارَدھا منزل والیان۔ ایک نتھ والیان۔ ایک گھونگھٹ والیان۔ ایک رہس والیان۔ ایک نقل والیان۔ اور اسی طرح کے بیسیون گروہ تھے جن کو رقص و سرود کی اعلیٰ تعلیم دی گئی تھی۔ اور انھین کے ناچ گانے مین اُن کا دل بہلتا۔ ان سب سے متعہ ہو گیا تھا۔ بیگمین کہلاتی تھین۔ اور دو ایک گروہون مین اگرچہ چند کمسن و نابالغ لڑکیان غیر ممتوعہ تھین تو اس لیے تھین کہ بعد بلوغ داخل ممتوعات کر لی جائین گی۔ ان مین سے اکثر خود بادشاہ کے قریب خاص سلطان خانے مین رہتین۔ اور بعض کو دوسری کوٹھیون مین جدا محلسرائین ملی تھین۔ ان ممتوعات مین سے جو صاحب اولاد ہو جاتین اُن کو محل کا خطاب دیا جاتا۔ رہنے کو جداگانہ محلسرا ملتی۔ اور اُن کی تنخواہ اور عزت بڑھ جاتی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ موسیقی کے سوا اور تمام حیثیتون سے بادشاہ بڑے متقی و پرہیزگار اور پابند شرع تھے۔ نماز کبھی قضا نہ ہوتی تھی۔ تیسون روزے رکھتے تھے۔ افیون۔ شراب۔ فلک سیر۔ یا اور کسی قسم کے نشے سے زندگی بھر احتراز رہا۔ اور محرم کی عزاداری نہایت ہی خلوص عقیدت سے بجا لاتے تھے۔

تیسرا شوق اُنھین عمارت کا تھا۔ سلطان خانہ کے گرد بیسیون محلسرائین تعمیر ہو گئین۔ اور بہت سی نئی کوٹھیان اور اُن مین محلسرائین بنین۔ گورنمنٹ سے صرف سلطان خانہ۔ اسد منزل۔ اور مرصع منزل ملی تھین۔ مگر بادشاہ کے شوق

نے چند ہی روز میں بیسیون کوٹھیان تعمیر کرا دین جن کے گرد نہایت ہی پر فضا باغ اور فرحت بخش چمن تھے - جس وقت مین نے دیکھا ہے بادشاہ کے قبضے مین مندرجۂ ذیل عالیشان کوٹھیان تھین جو جنوب سے شمال تک ترتیب وار چلی گئی تھین - سلطان خانہ - قصر البیضا - گوشۂ سلطانی - شہنشاہ منزل - مربع منزل - اسد منزل - شاہ منزل - نور منزل - تفریح بخش - بادامی - آستانی - تہنیت منزل - عدسلطانی - سد سلطانی - عدالت منزل - ان کے علاوہ اور بھی کئی کوٹھیان تھین جن کے نام مجھے یاد نہین رہے -

ان کے ماہوا باغون کے اندر تالابون کے کنارے بہت سے کمرے بنگلے اور چھوٹی چھوٹی کوشکین تھین - ان تمام کوٹھیون - متفرق کمرون - بنگلون اور کوشکون مین صاف ستھرا - پرتکلف فرش بچھا رہتا - چاندی کے پلنگ بچھونون اور تکیون سے مکمل لگے رہتے - تصویرین اور طرح طرح کا فرنیچر آراستہ ہوتا اور محض پرورش کے خیال سے ضرورت سے زیادہ ملازم مقرر تھے جو روز جھاڑتے اور ہر چیز کو صفائی اور قرینے سے آراستہ رکھتے - غرض ہر کوٹھی بجائے خود اس قدر آراستہ و پیراستہ نظر آتی کہ انسان عش عش کر جاتا - کوٹھیون کے گرد کے باغ اور چمن ایسی ہندسی ترتیبون اور اقلیدس کی شکلون کے مطابق بنائے گئے تھے کہ دیکھنے والون کو بادشاہ کی مناسبت طبعی پر تعجب ہوتا -

لکھنؤ مین تو بادشاہ نے صرف قیصر باغ اور اُس کے پاس کی چند عمارتین یا اپنے والد مرحوم کا امام باڑہ اور مقبرہ ہی تعمیر کیا تھا مگر مٹیا برج مین نفیس اور اعلیٰ عمارتون کا ایک خوبصورت شہر بسا دیا تھا - دریا کے اُس پار مٹیا برج کے عین مقابل کلکتے کا مشہور بوٹینکل گارڈن ہے - مگر وہ مٹیا برج کی دنیوی جنت اور اُس کے دلکش عجائبات کے سامنے مٹ گیا تھا - ان تمام عمارتون - چمنون - کنجون - اور وسیع و نزہت بخش مرغزارون کے گرد بلند دیوارون کا احاطہ تھا مگر میونسپلٹی کی شاہراہ عام کے کنارے کنارے تقریبًا ایک میل تک شاندار دکانین تھین اور اُن مین وہی ادنیٰ درجے کے ملازمین رہنے پاتے تھے جن کو اپنے فرائض کے لحاظ سے وہان رہنے کی ضرورت تھی - مگر اندر جانے کا راستہ

سوا پھاٹکوں کے جن پر پہرہ رہتا کسی دکان میں سے نہیں رکھا گیا تھا۔ خاص سلطان خانے کے پھاٹک پر نہایت عالیشان نوبت خانہ تھا۔ نقارچی نوبت بجاتے۔ اور پرانے پہروں اور گھڑیوں ہی کے حساب سے شب و روز گھڑیال بجا کرتا۔

دنیا میں عمارت کے شوقین ہزاروں بادشاہ گذرے ہیں۔ مگر غالباً اپنی ذات سے کسی تاجدار نے اتنی عمارتیں اور اتنے باغ نہ بنوائے ہونگے جتنے کہ واجد علی شاہ نے اپنی ناکام زندگی اور برائے نام شاہی کے مختصر زمانے میں بنائے۔ شاہجہان کے بعد اس بارۂ خاص میں اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ اسی ستم زدہ شاہ اودھ کا نام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی خاص عمارت سیکڑوں ہزاروں سال تک باقی رہی اور کسی کی صدہا عمارتیں زمانے نے چند ہی روز میں مٹا کے رکھ دیں۔

عمارت کے علاوہ بادشاہ کو جانوروں کا شوق تھا۔ اور اس شوق کو بھی اُنھوں نے اس درجے تک پہونچا دیا کہ دنیا اُس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور شاید کوئی شخصی کوشش آج تک اُس کے نصف درجے کو بھی نہ پہونچ سکی ہوگی۔

نور منزل کے سامنے خوشنما آہنی کٹہرے سے گھیر کے ایک وسیع رمنہ بنایا گیا تھا۔ جس میں صدہا چیتل۔ ہرن۔ اور وحشی چوپائے چھوٹے پھرتے تھے۔ اسی کے درمیان سنگ مرمر کا ایک پختہ تالاب تھا جو ہر وقت لبریز رہتا۔ اور اُس میں شتر مرغ۔ کشوری۔ فیل مرغ۔ سارس۔ قازیں۔ بگلے۔ قرقرے۔ ہنس۔ مور۔ چکور اور صدہا قسم کے طیور اور کچھوے چھوڑ دیے گئے تھے۔ صفائی کا اس قدر اہتمام تھا کہ مجال کیا جو کہیں بیٹ یا کسی جانور کا پر بھی نظر آ جائے۔ ایک طرف تالاب کے کنارے کٹہروں میں شیر تھے۔ اور اس رمنے کے پاس ہی سے لکڑی کے سلاخوں دار بڑے بڑے خانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس میں بیسیوں طرح کے اور خدا جانے کہاں کہاں کے بندر لا کے جمع کیے گئے تھے جو عجیب عجیب حرکتیں کرتے۔ اور انسان کو بغیر اپنا تماشا دکھائے آگے نہ بڑھنے دیتے۔

مختلف جگہ حوضوں میں مچھلیاں پالی گئی تھیں جو اشارے پر جمع ہو جاتیں۔ اور کوئی کھانے کی چیز ڈالیے تو اپنی اُچھل کود سے خوب بہار دکھاتیں۔ سب پر طرہ یہ کہ شہنشاہ منزل کے سامنے ایک بڑا سا لمبا اور گہرا حوض قائم کر کے اور اُس

کے کناروں کو چاروں طرف سے خوب چکنا کر کے اور آگے کی طرف جھکا کے اُس کے
بیچ میں ایک مصنوعی پہاڑ بنایا گیا تھا جس کے اندر سیکڑوں نالیاں دوڑائی گئی تھیں۔
اور اوپر سے دو ایک جگہ کاٹ کے پانی کا چشمہ بھی بہا دیا گیا تھا۔ اس پہاڑ میں
ہزاروں بڑے بڑے دو دو تین تین گز کے لمبے سانپ چھوڑ دیے گئے تھے جو برابر دوڑتے
اور رینگتے پھرتے۔ پہاڑ کی چوٹی تک چڑھ جاتے اور پھر نیچے اُتر آتے۔ مینڈکیں
چھوڑی جاتیں۔ اُنھیں دوڑ دوڑ کے پکڑتے۔ پہاڑ کے گرداگرد نہر کی شان سے
ایک نالی تھی۔ اُس میں سانپ لہرا لہرا کے دوڑتے اور مینڈکوں کا تعاقب کرتے۔
اور لوگ بلا کسی خوف کے پاس کھڑے سیر دیکھا کرتے۔ اس پہاڑ کے نیچے بھی دو
کٹہرے تھے جن میں دو بڑی بڑی چیتیں رکھی گئی تھیں۔ یوں تو خاموش پڑی
رہتیں لیکن جس وقت مرغ لا کے چھوڑا جاتا اُسے جھپٹ کے پکڑتیں اور مسلّم
نگل جاتیں۔ سانپوں کے رکھنے کا انتظام اس سے پہلے شاید کہیں نہ کیا گیا ہوگا
اور یہ خاص واجد علی شاہ کی ایجاد تھی جس کو یورپ کے سیاح حیرت سے دیکھتے
اور اس کی تصویریں اور شرحِ کیفیت قلم بند کرتے جاتے تھے۔
مذکورہ جانوروں کے علاوہ ہزارہا طیور کے چہکتے ہوئے برنجی پنجرے خاص
سلطان خانے کے اندر تھے۔ بیسیوں بڑے بڑے ہال تھے جو لوہے کے جال سے
محفوظ کر دیے گئے تھے اور گنج کہلاتے تھے۔ اُن میں قسم قسم کے طیور کثرت سے
لا کے چھوڑ دیے گئے تھے۔ اور اُنکے رہنے اور نشو و نما پانے کا پورا سامان فراہم
کیا گیا تھا۔ بادشاہ کی کوشش تھی کہ چرند و پرند میں سے جتنی قسم کے جانور دستیاب
ہو سکیں سب جمع کر لیے جائیں۔ اور واقعی ایسا مکمل زندہ عجائب خانہ شاید روئے
زمین پر کہیں موجود نہ ہوگا۔ اِن جانوروں کی فراہمی میں بے روک روپیہ صرف
کیا جاتا۔ اور کوئی شخص کوئی نیا جانور لائے تو مُنہ مانگے دام پاتا۔ کہتے ہیں
کہ بادشاہ نے ریشم پرے کبوتروں کا جوڑا چوبیس ہزار روپے کو اور سفید مور کا جوڑا
گیارہ ہزار روپے کو لیا تھا۔ زرافہ جو افریقہ کا بہت بڑا اور نہایت عجیب جانور
ہے اُس کا بھی ایک جوڑا موجود تھا۔ دو کوہان کے بغدادی اونٹ ہندوستان
میں کہیں نہیں نظر آتے اور بادشاہ کے وہاں تھے۔ کلکتے میں ہاتھی مطلق نہیں

مگر بادشاہ کے اس زندہ نیچرل ہسٹری میوزیم میں ایک ہاتھی بھی تھا۔ محض اس خیال سے کہ کوئی جانور رہ نہ جائے دو گدھے بھی رہنے میں لا کے چھوڑ دیے گئے تھے۔
درندوں میں سے شیر ببر۔ دیسی شیر۔ چیتے۔ تیندوے۔ ریچھ۔ سیاہ گوش۔ چرخ۔ بھیڑیئے۔ سب کٹہروں میں بند تھے اور بڑی خاطرداشت سے رکھے جاتے۔
کبوتروں کا انتظام دیگر جانوروں سے الگ تھا۔ بادشاہ کی مختلف کوٹھیوں میں سب ملا کے چوبیس پچیس ہزار کبوتر تھے۔ جن کے اڑانے میں کبوترباز وں نے بڑے بڑے کمالات دکھائے تھے۔
جانوروں پر جو صرف ہو رہا تھا اُس کا ناقص اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آٹھ سو سے زیادہ جانورباز تھے۔ تین سو کے قریب کبوترباز تھے۔ آسی کے کے قریب ماہی پرور تھے۔ اور تیس چالیس مارپرور تھے۔ جن کو دس روپیہ ماہوار سے لے کے چھ روپیہ ماہوار تک تنخواہیں ملتی تھیں۔ افسروں کی تنخواہیں تیس سے بیس روپیہ تک تھیں۔ اور کبوتروں سانپوں اور مچھلیوں کے علاوہ دیگر جانوروں کی خوراک میں کچھ کم نو ہزار روپیہ ماہوار صرف ہوتے تھے۔
عمارت کا کام زیادہ تر مونس الدولہ اور ریحان الدولہ کے سپرد رہا جن کو عمارت کی مد میں تقریباً پچیس ہزار ماہوار ملا کرتے تھے۔
ہزار کے قریب پہرے کے سپاہی تھے جن کی تنخواہیں عموماً چھ روپیہ ماہوار تھیں۔ بعض بعض آٹھ یا دس روپے بھی پاتے۔ یہی تنخواہ مکان داروں کی تھی جن کا شمار پانچ سو سے زیادہ تھا۔ مالیوں کی بھی یہی تنخواہ تھی۔ اور اُن کا شمار بھی پانچ سو سے زیادہ تھا۔ تقریباً اسی اہل قلم یعنی محرر تھے جو تیس سے دس روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے تھے۔ معزز مصاحبوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کا شمار چالیس پچاس سے کم نہ ہوگا جو اٹھاسی روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ سو سے زیادہ کہار تھے انکے علاوہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے محکمے تھے۔ باورچی خانہ۔ آبدارخانہ۔ بھنڈی خانہ۔ خس خانہ۔ اور خدا جانے کیا کیا تھا۔ پھر ایک مدلواحق بیگمات یعنے ممتوعات کے رشتہ داروں اور بھائی بندوں کی تھی جنھیں حسب حیثیت تنخواہیں ملتی تھیں۔

ان سب لوگون نے کوٹھیون کے رقبے سے باہر زیادہ تر اُسی زمین پر جو بادشاہ کو دی گئی تھی اور بہتون نے پاس کی دوسری زمینون پر مکان بنا لیے تھے۔ اور ایک شہر بس گیا تھا جس کی مردم شماری چالیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ان سب کی زندگی بادشاہ کی تنخواہ کے ایک لاکھ روپیہ ماہوار سے وابستہ تھی۔ اور کسی کی سمجھ مین نہ آتا تھا کہ اتنی خلقت عظیم اس تھوڑی سی رقم مین کیونکر زندگی بسر کر لیتی ہے بنگالہ کے عوام مین یہ مشہور تھا کہ بادشاہ کے پاس پارس پتھر ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے لوہے یا تانبے کو اُس مین رگڑ کے سونا بنا لیا کرتے ہین۔

حقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ کے قیام سے کلکتے کے پڑوس مین ایک دوسرا لکھنؤ آباد ہو گیا تھا۔ اصلی لکھنؤ مٹ گیا تھا اور اُس کی منتخب صحبت مٹیا بُرج مین چلی گئی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُن دنون لکھنؤ لکھنؤ نہین رہا تھا مٹیا برج لکھنؤ تھا۔ یہی چہل پہل تھی۔ یہی زبان تھی۔ یہی شاعری تھی۔ یہی صحبتین اور بذلہ سنجیان تھین۔ یہین کے علما و اتقیا تھے۔ یہین کے امرا اور رؤسا تھے۔ اور یہین کے عوام تھے۔ کسی کو نظر ہی نہ آتا تھا کہ ہم بنگالے مین ہین۔ یہی پتنگ بازیان تھین یہی مرغ بازیان تھین۔ یہی بٹیر بازیان تھین۔ یہی افیونی تھے۔ یہی داستان گوئی تھی۔ یہی تعزیہ داری تھی۔ یہی مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی تھی۔ یہی امام باڑے تھے اور یہی کربلا تھی۔ بلکہ جس جلوس اور شان و شوکت سے بادشاہ کی ضریح اُٹھتی تھی لکھنؤ مین عہد شاہی مین شاید اُٹھ سکی ہو۔ غدر کے بعد تو کبھی کوئی تعزیہ نہین اُٹھ سکا۔ کلکتے کی ہزارہا خلقت اور انگریز تک زیارت کو مٹیا بُرج مین آ جاتے تھے۔

بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج مین مطلق تعصب نہ تھا۔ اُن کا یہ مقولہ تھا کہ "میری دو آنکھون مین سے ایک شیعہ ہے اور ایک سُنی ہے۔" ایک بار دو شخصون مین مذہبی اختلاف پر مار پیٹ ہو گئی۔ بادشاہ نے دونون کی معزولی کا حکم دیا۔ بلکہ اپنے وہان ممنوع الملازمۃ کر دیا اور فرمایا "ایسے لوگون کا میرے یہان گذر نہین ہو سکتا۔" آخر آخر مین بادشاہ کی ایک کتاب مین بعض ایسے ناگوار الفاظ چھپ گئے تھے جن پر کلکتے کے سُنیون مین بڑی شورش ہوئی۔ مگر

اس سے لوگ واقف نہین ہین کہ وہ الفاظ اصل کتاب مین نہین بلکہ دوسرون کی تاریخ یا تقریظ مین تھے۔ اور بادشاہ کو جیسے ہی اطلاع ہوئی بغیر کسی تحریک کے معافی مانگنے کو تیار ہوگئے۔ بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوگا کہ سارا انتظامی کاروبار سُنیون ہی کے ہاتھ مین تھا۔ وزیر اعظم منفرد الدولہ بہادر سُنّی تھے۔ منشی السلطان جو ایک زمانے مین سب سے زیادہ مقرب اور سارے جانورخانے۔ کُل اہل قلم۔ اور کئی اور محکمون کے افسر اعلیٰ تھے سُنّی تھے۔ بخشی امانت الدولہ بہادر جن کے ہاتھ سے کُل ملازمون حتیٰ کہ محلون اور شاہزادون تک کو تنخواہ ملتی تھی سُنّی تھے۔ عطارد الدولہ اور داروغہ تقی علی خان جو آخر مین سب سے بڑے عہدہ دار اور کُل کاروبار کے مالک تھے دونون سُنّی تھے۔ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ امام باڑہ سبطین آباد کا اور محل کے خاص امام باڑے بیت البکا کا انتظام اور مجلسون اور مذہبی تقریبون کے بجالانے کا انصرام بھی سُنیون ہی کے ہاتھ مین تھا۔ وہان کبھی کسی نے اس کو محسوس ہی نہین کیا کہ کون سُنّی ہے اور کون شیعہ ہے۔

مٹیا برج کے دکاندار اور مہاجن تک لکھنؤ کے تھے۔ اور لکھنؤ کی کوئی چیز نہ تھی جو مکمل ترین صورت مین وہان موجود نہ ہو۔ جدھر گذر جائیے ایک عجیب رونق اور چہل پہل نظر آتی۔ اور اُس لطف مین لوگ اس قدر محو اور مست و از خود رفتہ ہو رہے تھے کہ کسی کو انجام کی خبر ہی نہ تھی۔ عمارات شاہی اور رمنہ وغیرہ کے اندر جانے کی اہل لکھنؤ جملہ ملازمین بلکہ ساکنین مٹیا برج کو عام آزادی حاصل تھی۔ باغون مین پھریے تو اُس سے زیادہ پُر فضا مقام کہین نصیب نہ ہو سکتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو جائیے تو عجیب لطف نظر آتا۔ کلکتے کو آنے جانے والے جہاز سامنے سے ہو کے گذرتے۔ جو فورٹ ولیم کی سلامی کے لیے یہین سے اپنی جھنڈیان اُتارنا شروع کر دیتے۔ اور لوگ سمجھتے کہ بادشاہ کی سلامی لے رہے ہین۔ محلات کی ڈیوڑھیون اور محلسراؤن کے دروازون پہ کھڑے ہو جایئے تو عجب لطف کی دھوم دھام مین کبھی کبھی ایسی صورتین نظر آجاتین اور ایسی فصیح و دلکش زبان اور ایسی مزے مزے کی پیاری باتین سننے مین

آ جاتین کہ انسان مدتون بلکہ زندگی بھر مزہ لیا کرتا۔

آہ! یہ خوبصورت اور دلفریب نقش توٹنے کے قابل نہ تھا! مگر ہائے زمانے نے مٹا ہی دیا۔ اور ایسا مٹایا کہ گویا تھا ہی نہین۔ سنہ ۱۳۱۴ ہجری (سنہ ۱۸۹۶ء) مین یکایک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور معلوم ہوا کہ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا" سب باتین خواب و خیال تھین۔ ایک طلسم تھا کہ یکایک ٹوٹ گیا۔ اور وہ خوبصورت بقعہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سلاطین اور ہندوستان کے والیان ملک کو رہا کرتی تھی آج ایک وحشتستان فنا اور عبرت کدہ ہے۔ جہان کچھ بھی نہین۔ جس نے اس اگلے رنگ کو کبھی دیکھا تھا اب وہان کے سناٹے کو دیکھ کے سوا اس کے کہ کمال حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہے "رہے نام اللہ کا!" اور کیا کر سکتا ہے؟

(۹)

اس دربار کے فرمان رواؤن کی تاریخ مین سے اب صرف اس قدر بتانا باقی ہے کہ مرزا برجیس قدر بہادر لکھنؤ سے بھاگے تو سرحد نیپال پر دم لیا۔ ہمراہ رکاب تقریباً ایک لاکھ آدمیون کا مجمع تھا۔ ان لوگون نے ارادہ کیا کہ ہمالیہ کی گھاٹیون مین پناہ گزین ہو جائین۔ اور جب موقع ملے نکل کے انگریزون پر حملہ کرین۔ فتح ہو تو اپنے وطن پہونچین۔ شکست ہو تو پھر بھاگ کے پہاڑون مین ہو رہین۔ مگر یہ نبھنے والی صورت نہ تھی۔ ریاست نیپال نہ اتنے آدمیون کو اپنے دامن پناہ دے سکتی تھی اور نہ اُنکے لیے انگریزون سے لڑ سکتی تھی۔ اُس مین اتنی قوت ہی نہ تھی کہ انگریزون کا مقابلہ کرتی۔ لہذا حکومت نیپال نے صرف مرزا برجیس قدر اور اُن کی ماں کو تو پناہ دے دی۔ مگر اُنکے ہمراہی طوفان بے تمیزی کو قطعی حکم دے دیا کہ فوراً واپس جائین۔ اور نہ جائین تو مار کے نکال دیے جائین۔ نیپال کی قلمرو فوراً ان سے خالی کرا لی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے سب وہان سے نکل نکل کے بھاگے۔ بہت سے مارے گئے۔ بہت سے بھیس بدل بدل کے کسی طرف نکل گئے۔ اور مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال مین جا کے سکونت پذیر ہو گئے۔ دربار نیپال سے اُنکے لیے کچھ معمولی وظیفہ مقرر کر

اور کہتے ہین اُن کے ساتھ جس قدر جواہرات تھا سب دولت نیپال کی نذر ہو آخر حضرت محل وہین پیوند زمین ہوئین - اور اُن کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر دولت برطانیہ نے مرزا برجیس قدر کا قصور معاف کر دیا - اُنھین اپس آنے کی اجازت ملی تو بغیر کسی کو اطلاع دیے نیپال سے بھاگ کے کلکتے پہونچے یہان واجد علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا - اور بحیثیت اولاد اکبر مرزا قمر قدر سب سے زیادہ تنخواہ پا رہے تھے - برجیس قدر نے دعوے کیا کہ بادشاہ کے تمام بیٹون سے زیادہ معزز و مستحق مین ہون - از روے قانون پنشن بادشاہ کی پنشن مین سے ایک ثلث گھٹا کے باقی تنخواہ مجھ پر جاری کی جائے - اور اُنکے تمام ورثاء اور وابستگان دامن کی خبر گیری میرے ذمے کی جائے - اس کی پیروی مین وہ انگلستان مین جانے کی تیاریان کر ہی رہے تھے کہ اُنکے خاندان والون ہی مین سے کسی نے دعوت کی - دعوت سے واپس آئے تو قے و دست جاری ہو گئے - آناً فاناً حالت خراب ہو گئی - اور ایک ہی دن مین وہ - اُنکی بی بی - اور اُنکے کئی فرزند سب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا - اور دنیا اس خاندان کی اُن تمام یادگارون سے خالی ہو گئی جنھون نے کبھی تخت و تاج کی صورت دیکھی تھی -

تاہم مٹیا برج کی چہل پہل اور اُس نئی بستی کی رونق و آبادی نے ایسی صورت پیدا کر لی تھی کہ اگر چشم زخم حوادث سے بچ جاتا تو مدتون تک یاد دلاتا رہتا کہ اس بخت برگشتہ بادشاہ کے دربار اور اُس کے وابستگان دامن کی کیا وضع قطع تھی - اور اُن کا کیا مذاق تھا - مگر برٹش گورنمنٹ کی عدالت گستری نے واجد علی شاہ کا ترکہ تقسیم کرنے اور اُن کے ورثا کی دادرسی مین یہ شان عدالت دکھائی کہ ساری جائداد اور سارا گھر بار بیچ کے حصہ رسدی سب مین تقسیم کر دیا جائے - اور جو کچھ ہے نقد روپئے کی صورت مین کر لیا جائے - اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مٹیا برج کی اینٹ سے اینٹ بج گئی - لاکھون کا سامان کوڑیون کو بک گیا - اور وہی بقعہ جو چند روز مین باغ ارم بن گیا تھا حضیض ادبار کا جہنم ہو کے رہ گیا - اب تم وہان جا کے خاک اُڑاؤ کچھ نہ نظر آئے گا - اگر
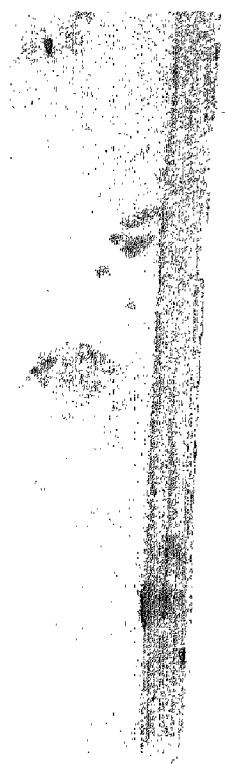
آتھیں انگلی رونق اور چہل پہل کو ڈھونڈتی ہوں تو کسی امراء القیسؔ عہ کو بلاؤ جو آنسو بہاتا جائے اور تمہیں بتاتا جائے کہ یہاں فرحبخش منزل تھی۔ یہاں نور منزل تھی۔ یہاں سلطان خانہ تھا۔ اور یہاں اسد منزل تھی۔ وہاں مشاعرے ہوتے تھے۔ وہاں علمائے باکمال کی مجلس تھی۔ وہاں یاران باصفا کی بذلہ سنجیاں تھیں۔ اور وہاں فصحائے جادو بیان کی سحر طرازیاں تھیں۔ اس مقام پر عجب حسینان جہان کا جھرمٹ تھا۔ اس مقام پر رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ اس مقام پر حوروش مہ جبینوں کو گانے ناچنے کی تعلیم ہوتی تھی۔ اور اس مقام پر جہاں پناہ ناز آفرین معشوقات کے بیچ میں بیٹھ کے جشن منایا کرتے تھے۔ اس جگہ افیونیوں کے مجمع میں داستان ہوتی تھی۔ اس جگہ بٹیروں کی پالیاں ہوتی تھیں۔ اس جگہ کبوتر اُڑتے تھے۔ اور اس جگہ کنکوے کے میدان بدے جاتے تھے۔ اس ڈیوڑھی پر ماہ وش جادو نگاہیں پردے سے سر نکالے جھانکتی نظر آتی تھیں۔ اس ڈیوڑھی پر ماماصیلوں کی آمد و رفت سے ہر وقت ایک عجیب جوش و خروش نمایاں رہتا تھا۔ اس ڈیوڑھی پر خاص خاص شعراء حاضر رہتے اس لیے کہ محلسرا والی کو فن شعر سے دلچسپی تھی۔ اور اس ڈیوڑھی پر وہ رنگین عبارت لکھنے والے جوان مزاج ادیبوں کی تلاش رہتی تھی۔ اس لیے کہ دوسرے تیسرے دن سے ایک نئے رنگ کا توڑ وہ نامہ عہ جا کے بادشاہ کے ملاحظے میں پیش ہوتا۔

لیکن مٹیا برج کے مٹ جانے پر بھی اس مرحوم دربار کی ہزاروں یادگاریں باقی ہیں۔ خود شہر لکھنؤ اور اُسکی سوسائٹی اس دربار دُربار کو یاد دلا رہی ہے اور اودھ کی سرزمین کا چپہ چپہ اُسکی عظمت کی یادگار ہے۔ اس لیے کہ اُس پر جا بجا سلطنت ماضیہ کے مارکے بنے ہوئے ہیں۔ اہل لکھنؤ کی ہر حرکت اور ادا اسکے ارکان دربار کی زندہ تاریخ ہے۔ اور اُنکی چال دیکھ کے بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے "اے گل تو خرسندم تو بوئے کسے داری"۔ لہذا ان دیرپا آثار سلطنت کی یاد تازہ

عہ جاہلیت عرب کا ایک نہایت مشہور شاعر جس نے اپنے قدیم عشرت کدے کی ویرانی اور تباہی کی تصویر نہایت ہی سوز و گداز کے الفاظ میں دکھائی ہے۔ عہ توڑ وہ نامہ ان خطوط کو کہتے تھے جو بیگمات و محلات عالیات جہاں پناہ کی خدمت میں بھیجتی تھیں جو عموماً عاشقانہ رنگ میں ہوتے۔

کرنے کی غرض سے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہین کہ اس دربار کے قائم ہونے سے لکھنؤ مین جو سوسائٹی پیدا ہو گئی تھی وہ کیا تھی ؟ کیسی تھی ؟ اور اُس نے کس کس عنوان سے ہندوستان کی معاشرت پر اثر ڈال رکھا تھا۔

ہندوستان مین اُن دنون فارسی زبان کورٹ لینگوج (درباری زبان) تھی اور اہل ہندوستان کی بہترین معاشرت ایرانی تہذیب سے ماخوذ تھی - دولت صفویہ کے عہد مین ایرانیون کا عام مذہب شیعۂ اثنا عشری ہو گیا تھا - اور ہندوستان کا حکمران خاندان مغلیۂ چغتائیہ مذہب اہل سنّت کا پیرو تھا۔ مگر معاشرت پر فارسیت کا سکہ جاری ہونے کا یہ اثر تھا کہ باوجود اختلاف مذہب کے جو عجمی یہان آتے ادب کے ہاتھون سے لیے جانے تھے - اسی اخلاقی رجحان نے نورجہان بیگم کو جہانگیر کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا - اسی کی بدولت دہلی کے اکثر معزز عہدہ دار آخر عہد مین شیعہ تھے - اور اسی کی وجہ سے امین الدین خان نیشاپوری یہان پہونچتے ہی نواب برہان الملک بن کے وادی گنگا کے سارے وسیع علاقے کے مالک ہو گئے - برہان الملک کا اثر اور اقتدار جس قدر بڑھتا اور ترقی کرتا گیا اُسی قدر زیادہ وہ باکمالان دہلی کے مرجع و ماویٰ بنتے گئے - باوجود اس کے اُن کی اور نواب صفدر جنگ کی زندگی چونکہ ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے مین صرف ہوئی اس وجہ سے سوا بہادر سپہ گرون کی قدردانی کے اُنھین قومی تمدن اور معاشرتی امور کی طرف متوجہ ہونے کے بہت ہی کم مہلت ملی - کیونکہ ان باتون کو بمقابل فتحمندی و فتحمندی کے امن و امان کے پُرعیش زمانے سے زیادہ تعلق ہوا کرتا ہے۔

لیکن جب شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی مین ہمت ہارنے کے بعد انگریزون سے نیا معاہدہ کیا - اور مجبور ہو کے فیض آباد مین خاموش بیٹھے تو سرزمین اودھ مین ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑ گئی - اس مضمون کے آغاز مین ہم بتا چکے ہین کہ شجاع الدولہ کے زمانے مین کس کثرت سے باکمالان دہلی وطن چھوڑ چھوڑ کے یہان آنے لگے تھے - دہلی سے فیض آباد تک ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگون کے آنے کا کیسا تانتا بندھ گیا تھا - اور صرف نو سال کی مدت مین فیض آباد کیا

سے کیا ہو گیا تھا؟ شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ نے جب لکھنؤ مین قیام کیا تو فیض آباد کا جما جمایا اکھاڑہ کیا، رنگی فیض آباد سے اُکھڑ کے لکھنؤ مین آ گیا۔ اور دہلی کے اعلیٰ خاندانون اور باکمالون کا جو سیلاب فیض آباد کو جا رہا تھا لکھنؤ ہی مین روک لیا گیا جو کہ عین سر راہ واقع ہوا تھا۔ اور آخر مین چند شرفا و صاحب ہنر جو فیض آباد مین بیگمون کی سرکارون مین اُلجھے رہ گئے تھے رفتہ رفتہ وہ بھی لکھنؤ مین آ گئے۔ اس لیے کہ آصف الدولہ نے یہان دولت کی ایسی گنگا نہین بہا رکھی تھی کہ کوئی سنتا اور سیراب ہونے کے شوق مین بے اختیار نہ دوڑ پڑتا۔

ان دنون یون تو بہت سی ہندو ریاستین موجود تھین مگر مہذب اور شائستہ دربار مسلمان حکمرانون ہی کے سمجھے جاتے تھے۔ اور ہندو راجہ خود معترف تھے کہ تمدن اور معاشرت مین ہم مسلمان دربارون کا مقابلہ نہین کر سکتے۔ کیونکہ اپنی قدیم تہذیب کو زندہ کر کے اپنے لیے نیا تمدن اور نیا لٹریچر پیدا کرنے کا خیال ابھی اُن مین انگریزی تعلیم نے نہین پیدا کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر کوئی باکمال عالم شاعر۔ یا سپاہی مسلمان امرا سے برخاستہ خاطر ہو کے ہندو امرا کے علاقے مین پہونچ جاتا تو ہاتھون ہاتھ لیا جاتا اور دیوتاؤن کی طرح اُس کی قدر و منزلت کی جاتی۔

مسلمان دربار ان دنون چند گنتی کے تھے۔ سب سے پہلے تو دہلی کا دربار مغلیہ تھا۔ اور اس کی قدامت اور گذشتہ شوکت کی وجہ سے ہر قسم کے باکمالون اور مستند خاندانی شرفا کی کان دہلی بنی ہوئی تھی۔ اور اسی سرزمین کے منتشر روڑے تھے جنھون نے دور و دراز صوبون مین جا کے نئے نئے دربار قائم کیے تھے۔ جن مین سے دکن مین آصف جاہ کا دربار تھا۔ وہان سے آگے بڑھ کے ٹیپو سلطان اور نواب ارکاٹ کے دربار تھے۔ شمال مین دہلی سے چلیے تو پہلے روہیلکھنڈ کے بہادر و خونی کی قلمرو ملتی۔ اس کے بعد یہ اودھ کا دربار تھا۔ پھر اُس سے آگے مرشدآباد مین نواب ناظم بنگالہ کا دربار تھا۔ مذکورہ اسلامی دربارون سے دکن کے دربار نہایت ہی دور تھے۔ اُن کا راستہ اول تو جنگلون اور پہاڑون کی وجہ سے نہایت دشوار گذار تھا۔ اور اس پر بھی جرأت کر کے کوئی چل کھڑا ہوتا تو ٹھگ اور ڈاکو

جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ راستے ہی میں اُس کی زندگی کا خاتمہ کردیتے ٹیپو سلطان اور نواب کرناٹک کی قلمرو تک جانا درکنار کسی کو نظام حیدرآباد کی مملکت تک پہونچنا بھی مشکل سے نصیب ہوتا۔ اس لیے جب دہلی بگڑنا شروع ہوئی اور تاجداران مغلیہ کی حالت خراب ہونے سے قدردانی کا بازار وہاں سرد پڑا تو لوگوں نے عموماً شمالی ہندوستان کا رُخ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ روہیلکھنڈ بہت قریب تھا۔ یہاں کے خوانین اگر قدردانی کرتے تو اُن سے زیادہ موقع کسی کو نہیں حاصل تھا۔ مگر اُن میں دینداری تھی۔ شجاعت تھی۔ اور بہت سی خوبیاں تھیں مگر علمی مذاق اور معاشرتی رنگینیوں سے وہ لوگ بالکل معرا تھے۔ انکی حالت کا صحیح اندازہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص فوجی مذاق کے لوگ تھے۔ جنھیں اپنے ہموطنوں کے جمع کرنے اور اپنے جرگوں کی تعداد بڑھا کے اپنی جنگی قوت کو ترقی دینے کے سوا اور کسی بات کا شوق نہ تھا۔ معاشرت کے رسیلے پن اور تمدنی زندگی کے آداب و اخلاق کے لحاظ سے دیکھیے تو اُنکی حالت بالکل وحشی گنواروں کی سی تھی۔ ایسے لوگ بھلا شاعروں ادیبوں اور دیگر قسم کے باکمالوں کی کیا قدر کر سکتے تھے؟ لہذا اُن کی سرزمین میں جو داخل ہوا قدم بڑھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ چار پانچ منزلیں طے کر کے لکھنؤ میں پہونچا تو دیکھا کہ رئیس سے لے کے ادنی طبقے والے تک استقبال میں آنکھیں بچھا رہے ہیں۔ اور ہر طرح خدمتگذاری کو طیار ہیں۔ ایسی جگہ پہونچ کے پھر بھلا کون واپس آ سکتا ہے؟ جو گیا وہیں کا ہو گیا۔ اور دہلی کا ہر خاندان بربادیہاں آتے ہی پاؤں توڑ کے بیٹھ گیا۔ نہ وطن ہی یاد رہا اور نہ کسی اور دربار کے دیکھنے کی ہوس ہی دل میں باقی رہی چند لوگ یہاں سے آگے بڑھ کے نواب ناظم بنگالہ تک بھی پہونچ گئے مگر وہ وہی تھے جنکی لکھنؤ قدر نہ کر سکا۔ مگر ایسے چند گنتی ہی کے لوگ تھے ورنہ دہلی سے جتنے باکمال آئے سب لکھنؤ ہی میں کھپتے چلے گئے۔ تھوڑے ہی زمانے کے اندر یہ حالت ہو گئی کہ اُس دَور کی مہذب ترین سوسائٹی کے جتنے مشہور اور نامور بزرگ تھے سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے۔

فقط ایک چیز لکھنؤ میں اس دربار کے قائم ہونے سے پہلے موجود تھی۔ اور وہ

عربی کا علم و فضل تھا۔ جس کی بنیاد اُس وقت پڑ گئی تھی جب شہنشاہ اورنگ زیب نے فرنگی محل کے مکانات ملا نظام الدین سہالوی کو عطا کیے تھے۔ ملا صاحب ممدوح اور اُنکے خاندان کے قیام نے چند ہی روز مین فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلیٰ ترین یونیورسٹی بنا دیا کہ سارے ہندوستان کے علما و فضلا کا مرکز لکھنؤ کا یہی چھوٹا سا محلہ قرار پا گیا۔ شیخ عبد الحق دہلوی کے بعد دہلی مین بھی کوئی نمودِ کا عالم نہین پیدا ہو سکا تھا۔ آخر مین شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان نے البتہ بہت بڑا عروج حاصل کیا مگر اُن کی شہرت علم حدیث تک محدود تھی۔ مگر حدیث کے علاوہ اور جتنے علوم ہین ان سب کی یونیورسٹی لکھنؤ ہی تھا۔ اُن دنون لکھنؤ ایک گمنام شہر تھا۔ مگر ایسے ایک گمنام مقام کا اتنی بڑی یونیورسٹی بنجانا کہ ہندوستان درکنار بخارا۔ خوارزم۔ اور ہرات و کابل اس کے آگے سر جھکا دین بہت ہی حیرت کے قابل ہے ساری اسلامی دنیا یہین کی شاگردی پر فخر کر رہی تھی اور یہین کے منتخب کیے ہوے نصاب تعلیم یعنی سلسلۂ نظامیہ کی پیرو تھی۔ غرض علماے فرنگی محل کی بدولت اس نئے دربار کے قائم ہونے سے پہلے ہی لکھنؤ حکمت و فلسفہ۔ منطق و کلام۔ فقہ و اصول فقہ اور دیگر مختلف علوم کا معدن و مرجع بن چکا تھا۔ لہذا ایک اس چیز مین تو لکھنؤ اس نئے دربار کا زیر بار احسان نہین ہے باقی اور تمام ترقیان اس سلطنت کے قائم ہونے ہی سے پیدا ہوئین۔

اب ہم جدا جدا بیان کرنا چاہتے ہین کہ دہلی سے لکھنؤ مین کون کون سی چیزین آئین۔ اور یہان آکے اُنھون نے کیا رنگ پکڑا؟ سب سے مقدم اُردو زبان ہے جو دہلی کے اُن شرفا اور سردارانِ فوج کی زبان تھی جو آپ برہان الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ مین آئے تھے۔ یہ زبان دہلی مین پیدا ہوئی۔ اور اسکی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ ولی گجراتی نے دہلی مین آکے اپنا دیوان پیش کیا۔ اور اپنے نغمۂ دلکش سے اہل زبان کو خواب غفلت سے جگایا۔ اس نغمے مین کچھ ایسا جادو تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہو گیا۔ اور دہلی مین اُردو شاعری شروع ہو گئی۔

ابتداءً چند ہی بزرگ تھے جنھون نے اُستادی کی شان سے دہلی مین داد سخن

دینا شروع کی۔ مگر اس زمانے کو اگر اُردو زبان کی طفلی نہین تو اُردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیے۔ دنیاے اُردو کے ان سابقین الاولین مین سب سے زیادہ صاحب علم و فضل اور سب سے بڑے باکمال خان آرزو تھے۔ جنھین مولانا آزاد مرحوم نے دوسرے دَور شاعری مین رکھا ہے۔ زمانۂ مابعد کے بڑے بڑے باکمال جن مین سودا۔ میر۔ میرزا مظہر جانِ جانان اور خواجہ میر دَرد شامل ہین سب ان کے شاگرد تھے۔ شاعری اور کمال زباندانی کے لکھنؤ مین آنے کی بنیاد انھین اُستادِ اول خان آرزو سے پڑی۔ نواب شجاع الدولہ کے ماموں سالار جنگ نے کمال قدردانی سے اُنھین لکھنؤ بلوایا۔ اور ایک زمانے تک وہ وہین اقامت گزین رہ کے وہ شجاع الدولہ کی مسندنشینی کے دو برس بعد ۱۱۶۹ھ (۱۸۴۲ محمدی مطابق ۱۷۵۲ء) مین خاص لکھنؤ کے اندر دہگراے آخرت ہوے۔ وہی پہلے اُستاد اُردو شاعری کے تھے۔ اور اُنھین سے اُردو شعر و سخن کے لکھنؤ مین آنے کی بنیاد پڑی۔ مگر افسوس کہ اُنکی ہڈیان سرزمین لکھنؤ کے دامن شوق سے چھین کے خاک دہلی کو سونپی گئین۔

اس کے بعد اسی دَور کے دوسرے نامی اُستاد سخن اشرف علی خان فغان نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے قدردانی کی تلاش مین لکھنؤ کی راہ لی۔ شجاع الدولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی۔ ہاتھون ہاتھ لیا اور ایک زمانے تک اپنے دربار مین رکھا۔ مگر شعرا نازک خیال سے زیادہ نازک دماغ ہوا کرتے ہین۔ کسی خفیف سی بات پر رُوٹھ کے عظیم آباد چلے گئے۔ اور شجاع الدولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہین پیوند زمین ہو گئے۔

اب مولانا آزاد کا مقرر کیا ہوا تیسرا دَور شاعری شروع ہوا۔ جبکہ خان آرزو کے شاگرد نظم اُردو پر حکومت کر رہے تھے۔ اس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنے باکمالون کو اپنے آغوش مین سنبھال نہین سکتی۔ ہر طرح کے صاحبان کمال اُسکی سواد سے نکلتے چلے جاتے ہین۔ اور جو جاتا ہے پھر نہین آتا۔ اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحب فن آتا ہے چاہے کہین کا ہو یہین کا ہو جاتا ہے۔ مرزا رفیع سودا۔ میر تقی میر۔ سید محمد میر سوز جو اس تیسرے

دور کے پیران سخن ہیں سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آئے اور یہیں پیوند زمین ہو گئے۔

ان کے علاوہ جو باکمالان سخن اس زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے اور یہیں کے ہو گئے۔ میرزا جعفر علی حسرت۔ میر حیدر علی حیران۔ خواجہ حسن حسن۔ میرزا فاخر مکین۔ میر ضاحک۔ بقاء اللہ خان بقا۔ میر حسن دہلوی۔ میر ضاحک کے فرزند (صاحب مثنوی) اور انھیں کے ایسے بیسیوں شعرا ہیں۔ میر قمرالدین منت۔ میر ضیاءالدین ضیا۔ اشرف علی خان فغان دہلی سے لکھنؤ میں آکے ایک مدت تک رہے اور یہیں چلے۔ مگر آخر میں بیرونی قدر دانوں کی کشش سے نکلتے اور عظیم آباد میں جا کے نذر اجل ہوئے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ اُنکے وطن ٹکمینے میں ہوا مگر وہ بھی ایک مدت تک اسی لکھنؤ کی سبھا کے ایک رکن تھے

صرف میرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی میں پڑے رہ گئے جن کو فقیرانہ قناعت اور مرجعیت کی وجہ سے دہلی میں قدم جانے کا موقع مل گیا تھا۔ اور سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی مسند درویشی کو نہ چھوڑ سکتے تھے غرض شاعری کا یہ تیسرا دور وہ زمانہ ہے جبکہ دہلی کی سبھا وہاں سے اُکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی۔ اور لکھنؤ میں ایک جوش قدردانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

اب چوتھا دور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی و اکبرآباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی میں چمکی۔ یہیں سے ان کا نام مشہور ہوا۔ یہیں کے مشاعروں کے میر مجلس تھے۔ یہ لوگ علی العموم یہیں سے نکلے۔ یہیں رہے۔ یہیں عروج پایا اور یہیں مر کھپ گئے۔ اس دور کے رکن رکین جرأت۔ سید انشا۔ مصحفی۔ قتیل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد میں زبان پر حکومت کر رہے تھے۔ اور انکی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا کہ ان کے سامنے کسی اُردو شاعر کا نام چمک ہی نہ سکا۔ ان سب کی ہڈیاں کہاں ہیں؟ لکھنؤ کی خاک میں۔

اس زمانے میں دہلی کے صاحبان مذاق جس کثرت سے لکھنؤ میں آ رہے تھے

اُس کا اندازہ سید انشا کی ایک روایت سے ہو سکتا ہے جس مین اُنھون نے اُس عہد کے ایک شریف وضعدار بڈھے اور نورا نام ایک کسبی کی گفتگو نقل کی ہے - وہ بزرگ اور کسبی دونون دہلی کے ہین مگر دونون لکھنؤ مین باتین کر رہے ہین - بی نورا کہتی ہین "اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہو گئے - دلی مین آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے - لکھنؤ مین تمھین کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہین دکھاتے - آپ کی کربلا مین کتنا مین نے ڈھونڈھا کہین تھا ، اثر آثار معلوم نہ ہوا - ایسا نہ کیجیو کہ آٹھون مین بھی نہ چلو - تمھین علیؑ کی قسم آٹھون مین مقرر چلیو"۔ اس کا جواب جو میر صاحب نے دیا ہے وہ اگرچہ نہایت ہی دلچسپ ہے مگر ہم تطویل سے بچنے کے خیال سے اُسے چھوڑے دیتے ہین - اُنھون نے دلی و لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر اعتراضات کیے ہین - اور معاصر شعرا پر نکتہ چینیان کی ہین جس سے ہمین بحث نہین - ہمین صرف یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے مین شرفا و کملا و کنار رنڈیان تک لکھنؤ مین آ آ کے بستی جاتی تھین - اور جو لوگ دلی مین پھول والون کی سیر کے رسیا تھے اب کربلا اور آٹھون کے میلے مین اپنا دل بہلاتے تھے -

شمس العلما مولانا آزاد مرحوم نے بعد کے تمام شعرائے دہلی و لکھنؤ کو بلحاظ امتیاز و عہد ایک جگہ جمع کر کے اور زمانے کی طنابین کھینچ کے پانچوان دور بنا دیا ہے - لیکن یہ ناانصافی ہے - اصلی پانچوان دَور صرف ناسخ و آتش کا تھا جس مین زبان نے نئی وضع اختیار کی - بہت سے پُرانے محاورات ترک ہو گئے - نئی بندشین پیدا ہوئین - اور اُس زبان کی بنیاد پڑی جو بعد کے شعرائے دہلی و لکھنؤ مین یکسان طور پر مقبول ہوئی - اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندوستان مین مستند ہے - اور یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری کی قلمرو مین سب سے پہلے پہل لکھنؤ کا سکہ جاری ہوا -

اس کے بعد چھٹا دَور وہ تھا جب لکھنؤ مین وزیر - صبا - رند - گویا - رشک نسیم دہلوی - اسیر - نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم صاحبان مثنوی کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا - اور دلی مین مومن - ذوق - غالب نغمہ شاعرانہ

شمار ہے تھے۔ اس دور نے سچ یہ ہے کہ زبان کو بلحاظ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے درجے پر پہونچا دیا۔

اس کے بعد ساتوان دَور آمیر۔ دآغ۔ منیر۔ تسلیم۔ مجروح۔ جلال۔ لطافت۔ افضل اور حکیم وغیرہ کا تھا۔

ان آخری دَورون پر غائر نظر ڈالنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ مین کیسی مضبوط جگہ پکڑ لی تھی۔ چند ہی روز مین شعر کہنا لکھنؤ مین ایک وضعداری بن گیا۔ اور شعرا کی یہان اس قدر کثرت ہوگئی کہ شاید کہین کسی زبان مین نہ ہوئی ہوگی عورتون تک مین شعر و سخن کا چرچا ہوا۔ اور جہلا کے کلام مین بھی شاعرانہ خیال آفرینیون۔ تشبیہون اور استعارون کی جھلک نظر آنے لگی۔

(۱۰)

فارسی شاعری کا اصلی اُٹھان مثنوی سے ہوا ہے۔ اور یہ صنعت شاعری ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور با وقعت سمجھی گئی۔ ابتدا فردوسی کی رزمیہ مثنوی شاہنامے سے پڑی۔ پھر نظامی۔ سعدی۔ مولانائے روم۔ خسرو۔ جامی۔ اور ہاتفی وغیرہ نے اس مین اعلیٰ ترین شہرت و ناموری حاصل کی۔ اُردو مین میر تقی میر نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مثنویان دہلی و لکھنؤ کے قیام کے زمانے مین لکھی تھین مگر وہ اس قدر مختصر اور معمولی ہین کہ مثنویون کے تذکرے مین اُن کا ذکر بھی بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی لکھنے کا آغاز اُردو مین میر ضاحک کے بیٹے میر غلام حسن حسن سے ہوا۔ جو بچپن ہی مین اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہین کی صحبت مین اُن کا نشو و نما ہوا تھا۔ یہین پرورش پائی تھی۔ اور یہین کی آب و ہوا کے آغوش مین اُن کی شاعری پلی تھی۔ کیونکہ جس تعلیم اور جس سوسائٹی نے اُن کی مثنوی "بے نظیر و بدر منیر" لکھوائی وہ خالص لکھنؤ کی تھی۔ اسی زمانے مین مرزا محمد تقی خان ہوس نے مثنوی لیلیٰ مجنون لکھی۔ اور لکھنؤ مین مثنویت کا مذاق بڑھنا شروع ہوا۔ آتش و ناسخ کے زمانے مین تو ذرا خاموشی رہی۔ مگر پھر جو یہ مذاق اُبھرا تو پنڈت دیاشنکر نسیم نے گلزار نسیم۔ آفتاب الدولہ قلق نے طلسم الفت۔ اور نواب مرزا شوق نے بہار عشق۔

زہر عشق اور فریب عشق لکھیں۔ اور انھیں اس قدر عام نمود و شہرت اور عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر ان مثنویوں کے اشعار چڑھ گئے۔ اس سے پیشتر کے زمانے میں کسی صاحب نے مثنوی میر حسن کے جواب میں لذت عشق نام ایک مثنوی لکھی تھی وہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کے ساتھ شایع ہونے کی وجہ سے اُنھیں کی جانب منسوب ہو گئی۔ لیکن حقیقت میں نہ وہ اُن کی ہے اور نہ اُنکے زمانے کی ہے۔

ان سب مثنویوں کے دیکھنے مثنوی گلزار نسیم باوجود عام مقبولیت کے صدہا غلطیوں سے مملو ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک خیال نومشق ہے جو ہر قسم کی شاعرانہ خوبیاں اپنے کلام میں پیدا کرنا چاہتا ہے مگر قادر الکلامی کے نہ ہونے سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور کسی جگہ اپنے مقصد کو نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کے جواب میں آغا علی شمس نے جو ایک بہت ہی کہنہ مشق شاعر تھے اسی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی جس میں غلطیوں سے پاک رہ کے تشبیہات۔ استعارات۔ اور رعایت لفظی کے کمالات دکھائے تھے۔ مگر افسوس وہ مثنوی مٹ گئی۔ اور گلزار نسیم کو جو شہرت حاصل ہو چکی تھی اُسپر غالب نہ آسکی۔ دلی میں ان دنوں مومن خان نے چند چھوٹی چھوٹی بے مثل مثنویاں لکھیں جو بہت ہی مقبول اور مشہور ہوئیں۔

مومن خان کے مذاق شاعری میں نازک خیالی بڑھی ہوئی تھی۔ خیالی تشبیہوں اور استعاروں پر وہ اپنی سخن آفرینی کی عمارت قائم کرتے تھے۔ مثنویوں میں وہ زیادہ تر خیالی جذبات و صفات کو مشخص کرکے اپنے کلام میں ایک خاص لطف پیدا کیا کرتے تھے۔ مومن خان کے ایک شاگرد نسیم دہلوی لکھنؤ میں آئے۔ اور یہاں کے مشاعروں میں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ بہت سے لوگ اُن کے شاگرد ہو گئے۔ نسیم دہلوی نے لکھنؤ میں اپنے اُستاد کے رنگ کو خوب چمکایا۔ اور اُنکے شاگرد تسلیم لکھنوی نے اُردو مثنویوں میں نظیری و عرفی و صائب کی خیال آرائیاں دکھا دیں۔ اور نظم اُردو میں جیتے جاگتے فیضی و غنیمت لا کے ٹکڑے کر دیے۔ ادھر آخر زمانے میں مولوی میر علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی نے شراب کی مذمت میں ساقی نامۂ شفقتیہ کے نام سے ایک ایسی بے نظیر اخلاقی نظم اُردو پبلک کے سامنے پیش کر دی کہ اُس کا

جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ مومن خان کی چند مختصر مثنویوں سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو اُردو مثنوی گوئی کا آغاز بھی لکھنؤ میں ہوا۔ اور ترقی بھی یہیں ہوئی۔

بعض حضرات مثنوی میرحسن اور گلزار نسیم کے ذریعے سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ و موازنہ کیا کرتے ہیں۔ جس خیال کو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اور زیادہ قوت دے دی۔ لیکن اول تو گلزار نسیم کو نظیر اکبرآبادی کے بنجارہ نامے کی طرح اگر شہرت ہو بھی گئی تو اُسے مثنوی میرحسن کے مقابلے میں رکھنا اُردو شاعری کی سخت تذلیل و توہین ہے۔ صحیح مقابلہ ہو سکتا ہے تو مثنوی میرحسن اور مثنوی طلسم الفت کا۔ اور اگر گلزار نسیم کی زبان زبردستی لکھنؤ کی زبان مان بھی لی جائے تو مثنوی میرحسن اور گلزار نسیم کا مقابلہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہیں بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانوں کا مقابلہ ہے۔ اس لیے کہ مثنوی میرحسن لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا۔

شاعری کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف مرثیہ خوانی ہے۔ قدیم عربی شاعری میں زیادہ تر مرثیے اور رجز ہی شعر و سخن میں اظہار کمال کا ذریعہ تھے۔ فارسی میں مرثیہ خوانی کمزور پڑ گئی تھی۔ لیکن بعہد سلاطین صفویہ ایران میں مذہب شیعہ کو فروغ حاصل ہوا تو مصائب اہل بیت رسالت کی یاد تازہ کرنے کے لیے شعرا کو مرثیہ خوانی کی طرف توجہ ہوئی۔ مولانا محتشم کاشی نے چند بندوں کا ایک بے مثل مرثیہ لکھا تھا جو عموماً مقبول ہوا۔ اس کے بعد سے رواج تھا کہ شعرا کبھی کبھی ماتم حسینؑ میں دو ایک مرثیے بھی موزون کر دیا کرتے۔ لیکن شعر و سخن کی دنیا میں مرثیہ گوئی کی وقعت اس قدر کم تھی کہ مشہور تھا "بگڑا شاعر مرثیہ گو"۔ پھر جب مذہبی اقبال سے دولت صفویہ مرحومہ کی جانشین اودھ کی سلطنت قرار پائی تو لکھنؤ میں مجالس کی ترقی و عزاداری کے جوش و خروش نے مرثیہ گوئی کی ایسی قدردانی کی کہ اس فن کو غیر معمولی عروج حاصل ہونا شروع ہوا۔ اور در اصل لکھنؤ کے عروج کا سارا راز اسی تاریخی واقعے میں مستتر ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی جنہوں نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا۔ اور فارسی معاشرت اُن کی امیرانہ زندگی اور اُن کے تمام کمالات کا مرکز تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایرانی ہندوستان میں آتے ہی

آنکھون پر بٹھایا جاتا - اور اُس کی ہر حرکت اور ہر وضع مقبولیت کی نگاہون سے دیکھی جاتی - دہلی کی سلطنت مین بادشاہون کا مذہب سُنّی ہونے کی وجہ سے ایرانی اپنی بہت سی باتون کو چھپاتے - اور وہان کی محفلون مین اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے جس قدر کہ وہ اصل مین تھے - اودھ کا دربار شیعہ تھا - اور یہان کا خاندان حکمرانی خاص خراسان سے آیا تھا - اس لیے یہان ایرانی بالکل کھُل گئے - اور اپنے اصلی رنگ مین نمایان ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر شگفتہ ہوئے اُسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہان کے اہل دربار نے اُنکے اوضاع و اطوار کو حاصل کرنا شروع کیا - اور ایرانیت جو دراصل ساسانی اور عباسی شان و شوکت کے آغوش مین پلی ہوئی تھی چند ہی روز کے اندر لکھنؤ کی معاشرت مین سرایت کر گئی -

غرض سودا و میر کے زمانے مین میان سکندر - گدا - مسکین - اور افسردہ مرثیہ گو تھے جو چھوٹی چھوٹی نظمین شہادت امام حسین کے بیان مین تصنیف کر کے مجلسون مین سُنا دیا کرتے - اُن کے بعد میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی - اور مرثیون کی موجودہ وضع انھین کے زمانے مین ایجاد ہوئی - یہان تک کہ زمانہ میر ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر اور میر خلیق کے صاحبزادے میر انیس کو ناموری کے شہ نشین پر لایا - اور ان دونون بزرگون نے مرثیہ خوانی مین ایسے ایسے کمالات شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کے چمکے - وہی مقابلہ جو میر و سودا اور آتش و ناسخ مین رہا تھا اب میر انیس اور مرزا دبیر مین قائم ہوا - مرزا دبیر مین شوکت الفاظ تھی - بلند خیالی تھی - اور علم و فضل کا زور تھا میر انیس مین سادگی بے تکلف اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیان تھین جو سوا مبدأ فیاض کی عنایت کے سیکھنے سے نہین آسکتین - ان دونون بزرگون نے فن مرثیہ گوئی کو شاعری کی اور تمام اصناف سے بڑھا دیا - اور ادب اُردو مین وہ نئی چیزین پیدا کر دین جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتین ڈھونڈھنے لگی تھین -

انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو اس درجۂ کمال پر پہونچا دیا تھا کہ اب مرثیہ گوئی

بجاے معیوب ہونے کے سب سے بڑا شاعرانہ ہنر بن گئی تھی۔ تمام اہل لکھنؤ ان دونون بزرگون کے اس قدر معرف و مداح ہوے کہ سارا شہر دو گروہون مین بٹا ہوا تھا اور ہر سخن سنج یا انیسیا تھا یا دبیریا۔ اور ان دونون گروہون مین ہمیشہ باہمی مخالفت رہتی۔

میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یونانیون کے بعض مقررون اور خطیبون کی نسبت سنا جاتا ہے کہ اُنھون نے اپنی تقریرون مین اثر پیدا کرنے کے لیے خاص خاص کوششین کی تھین اور آواز کے نشیب و فراز اور اوضاع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو مین اثر پیدا کرتے تھے۔ اسلام کی اس طولانی عمر مین اس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص میر انیس نے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے۔ کلام کو اعضا و جوارح کے متناسب حرکات اور خط و خال کے اشارات سے قوت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیس کے گھرانے کی ایجاد ہے۔ جسکی ترقی مین اب تک کوششین جاری ہین۔ اور ہمارے اسپیکر اپنی فصیح البیانی مین اثر پیدا کرنے کے لیے اگر ان باکمالون کی شاگردی کرین تو نہایت ہی کامیاب اسپیکر ثابت ہون۔

ڈراما کا فن سخن جو مغربی شاعری کی جان ہے اُس سے عربی و فارسی کا ادب مطلقاً خالی تھا۔ اور فارسی کی شاگردی کی وجہ سے اُردو مین بھی اُس کی طرف کبھی توجہ نہین کی گئی۔ سنسکرت مین اعلیٰ درجے کے ڈراما تھے۔ مگر اُن سے ہندوستان کی آخری سوسائٹی بالکل ناآشنا ہو چکی تھی۔ رامچندر جی اور سری کرشن جی کے کارنامے البتہ ہندوون مین مذہبی آداب کے ساتھ دکھائے جاتے تھے۔ مگر اُردو شاعری کو اُن سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ رام چندر جی کے حالات انگلستان کے اُلمپیا کی طرح کھُلے میدانون مین رزمیہ نقالیون کی شان سے دکھائے جاتے۔ اور سری کرشن جی کے حالات رقص و سرود اور موسیقی کے پیرائے مین مذہبی اسٹیجون پر بعینہٖ اُپیرا کے طریقے سے نظر آتے جو "رہس" کہلاتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور رہس کے پلاٹ سے ماخوذ کر کے اُنھون نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا جس مین وہ کنھیا جی بنتے یا عشق کے ستائے ہوے جوگی بن کے دھونی رماتے۔ اور بہت سی عورتین پریان اور عاشق مزاج

گوپیاں بن کے اُنھیں ڈھونڈھتی پھرتیں۔ پھر جب قیصر باغ کے میلوں کا دروازہ عوام الناس کے لیے بھی کھُل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈراما کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا۔ اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعرا بھی اُس زمانے کے مذاق کے موافق طبع آزمائیاں کرنے اور ڈراما لکھنے لگے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میاں اَمانت نے جو ایک مشاق شاعر تھے اَندر سبھا لکھی۔ اور موجودہ عہد کی کمپنیوں کی طرح شہر میں جا بجا مختلف جماعتیں اُن کی "اندر سبھا" کو اسٹیج پر کھیلنے لگیں۔ جن میں کہیں عورتیں اور کہیں لڑکے ایکٹ کرتے۔ اس اندر سبھا میں اصول موسیقی کے مطابق دلکش دُھنیں قائم کی گئیں۔ اور سارا شہر اندر سبھا کے جلسے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ میاں اَمانت کی اندر سبھا کی کامیابیاں دیکھ کے اور لوگوں کو بھی شوق ہوا۔ اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہو گئے۔ اور سب کا نام "سبھا" قرار پایا۔ چنانچہ شہر میں مَداری لال وغیرہ کی بہت سی سبھائیں قائم ہو گئیں جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے۔

سبھا کے نئے رنگ نے شہر میں ایسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے لوگ کسی اور قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ ہر طرف سبھاؤں کی دھوم تھی۔ اور اس کی بنیاد پڑ گئی کہ سوسائٹی کے مذاق کے مطابق اگلے عاشقانہ قصے نقل کے طور پر اچھی نظموں میں اور دلکش مضمون کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ پارسی تھیٹروں نے اپنی انتظامی خوبیوں اور نمایشی دل فریبیوں کی وجہ سے سبھاؤں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ ڈراما کا وہ پُرانا مذاق جو لکھنؤ میں ایجاد ہو کے مروج ہوا تھا مٹ گیا۔ اول تو پارسیوں نے بھی اس چیز کو لکھنؤ سے لیا ہے۔ اُن کا پہلا عام کھیل اَمانت کی اَندر سبھا تھا۔ اور باوجود اس کے لکھنؤ کے تمام قومی جلسوں میں آج تک سپیرے۔ ہرش چندر وغیرہ کے ایسے پیسیوں پر فارنس ہو رہے ہیں۔ اور اس مذاق کے ایکٹروں کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا ہے جو شرفا میں سے قومی مذاق اُٹھ جانے پر بھی عوام کو محظوظ کرتا ہے۔ بہر تقدیر اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو ڈراما کی بنیاد خاص لکھنؤ ہی میں پڑی اور یہیں سے سارے ہندوستان میں اس کا رواج ہوا۔

اُردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہین - یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدس ہوتے ہین - اور اُن کا مضمون عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار - اس کے بعد معشوق کا سراپا - اُس کی بے وفائیان - پھر اُس سے روٹھ کے اُسے یہ باور کرانا کہ ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہوگئے - اس فرضی معشوق کے حسن وجمال کی تعریف کرکے معشوق کو جلانا چھیڑنا - جلی کٹی سُنانا - اور یون اُس کا غرور توڑکے پھر ملاپ کرلینا - نظم اُردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی - زمانۂ وسط کے قریب قریب تمام شاعرون نے واسوخت لکھے ہین اور اُن مین بڑے بڑے لطف پیدا کیے ہین - دہلی مین بھی بعد کے زمانے مین مختلف واسوخت لکھے گئے - خصوصاً مومن خان نے کئی بہت اچھے واسوخت لکھے - مگر آغاز لکھنؤ ہی سے ہوا -

امرا کی عیاشانہ طبیعتون نے شاعری کی کئی اور صنفون کو بھی پیدا کرایا جن کا آغاز دہلی ہی سے ہوا تھا - ان مین سب سے زیادہ مہمل ہزل گوئی ہے اور کسی قدر پُرلطف ریختی ہے - ہزل گوئی کا آغاز دہلی مین جعفر زٹلی سے ہوا جو غالباً محمد شاہ کے زمانے مین تھے - اُنکے کلام کو مین نے اول سے آخر تک دیکھا ہے - سوا فحش گوئی اور حد سے گذری ہوئی بیحیائی کے نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آتی ہے اور نہ زبان کا کوئی لطف ہے - اسکے بعد دہلی ہی کی خاک نے صاحبقران تخلص بلگرام کے ایک ہزل گو لکھنؤ مین آئے - اور یہین بچلے - ان کا نام سید آغا علی تھا - اور آصف الدولہ کے زمانے مین وارد لکھنؤ ہوے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے مبتذل مذاق والے رئیس زادون مین اُن کا نشوونما ہوا - اُن کا دیوان ملتا ہے اور گوکہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسون دُور ہے مگر پھر بھی اُس مین ایک بات ہے - شاعرانہ خوبیون کے ساتھ زبان اور محاورون کا پورا لطف ہے - لیکن اس فن کو لکھنؤ کے آخری دور مین میان مشیر نے جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے کمال کے درجے کو پہونچا دیا -

مجھے اس موقع پر بلا لحاظ اس کے کہ شیعون اور سُنیون کے متعصبانہ جذبات کا لحاظ کرون یہ بتادینا ضروری ہے کہ لکھنؤ مین جب شیعہ سلطنت قائم ہوئی تو شیعیت نے اپنے اصلی رنگ کو قائم رکھ کے کمال آزادی کے ساتھ اپنے ہر اصول مین ترقی

شروع کی۔ مذہب شیعہ کی بنیاد دو چیزون پر ہے۔ ایک تولّا۔ یعنی اہلبیت کرام اور
خاندان نبوت کے ساتھ اظہار محبت۔ اور دوسرا تبرّا یعنی اُس خاندان محترم کے
دشمنون سے اپنی براءت ظاہر کرنا۔ جس نے باہمی رقابت و تعصب کے بڑھنے
سے سب وشتم کی صورت اختیار کر لی۔ اصولاً اس عقیدے مین سُنّی بھی اُن کے
ساتھ شریک ہین مگر فرق یہ آپڑا کہ پہلے تینون جانشینان رسالت کو اہل سنت
افضل الناس بعد انبیا و رسل اور سچے جانشینانِ رسالت مانتے ہین۔ اور شیعہ
اُن کو غاصب و ظالم بتاتے ہین۔ اور جب یہ بزرگ بھی اُن کے عقائد مین خاندان
رسالت کے دشمن قرار پائے تو اُن سے بھی تبرا واجب ہو گیا۔ جس کو مہذب اور
صاحب علم لوگون نے اگر حرف براءت کے صحیح معنون کی حد تک رکھا تو عوام شیعہ
اپنے مذاق کے مطابق اُن پر زبان سب وشتم دراز کرنے لگے۔ اور یہی چیز سُنّی شیعون
کے باہمی تعصب کی بنا قرار پا گئی۔

ان دونون مذہبی چیزون نے لکھنؤ کی شاعری پر نہایت ہی عمدہ اور مناسب
اثر ڈالا۔ تولّا نے مرثیہ گوئی کے فن کو اپنے آغوش مین لے کے جملہ اصناف شاعری
سے بڑھا دیا تو دشمنان خاندان نبوت سے تبرا کرنے کے جوش نے پرانی ہجو گوئی کو
اختیار کر کے اُسے ہرزیہ گوئی کے نام سے ترقی دی۔ اس فن کے متعدد باکمال
لکھنؤ مین مشہور ہوے مگر افسوس یہ چیز بالتخصیص اہل سنت کو ناگوار گذرنے والی
تھی۔ عہد شاہی مین اس پر تلوارین نکل پڑا کرتی تھین۔ اور انگریزی مین بھی آج تک
کبھی کبھی فوجداریان اور مقدمہ بازیان ہو جایا کرتی ہین۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ
ہرزیہ گوئی وہرزیہ خوانی کو مکانون کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی
اگر ہرزیہ گوئی کا تمام سبجکٹ ایسا محدود اور مایۂ النزاع نہ ہوتا تو زمانہ دیکھتا
کہ لکھنؤ کے ہرزیہ گویون نے اپنی بیہودہ گوئیون اور فحاشیون مین بھی کیسے کیسے
کمال دکھائے ہین۔

اس فن مین سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیر کے شاگرد میان مشیر کو حاصل
[illegible] محاورات سے
[illegible]

کی۔ اور صحبت کو مارے ہنسی کے لٹا دینے اور سامعین کے پیٹ مین بل ڈال
دینے کے لیے جو زبان اور جیسا اسلوب سخن اختیار کیا اُس کی خوبیان اور جدتین
بیان سے باہر ہین۔ ابتذال مین بھی لطف پیدا کر کے اُسے شایستہ لوگون کے
سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دیا اُن کا خاص جوہر تھا جو اُن سے پہلے اور اُنکے
بعد کسی کو نہین نصیب ہوا۔

ہزل گوئی ہی کے سلسلے مین میان چرکین کا نام بھی لینا چاہیے۔ لکھنؤ کے زمانۂ
وسطیٰ مین عاشور علی خان نام ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و باذاق
رئیس تھے۔ اُن کے وہان کی صحبت اُسوقت کی سوسائٹی کا ایک اکمل ترین
نمونہ تھی۔ انھین نے جان صاحب اور چرکین کو پیدا کیا۔ اور بعض لوگ کہتے
ہین کہ انھین کی صحبت مین صاحبقران کا بھی نشو و نما ہوا تھا۔ چرکین اپنے ہر شعر
مین پیشاب پیخانے کی رعایت رکھتے۔ اور اُن کے اشعار سے ایسی تعفن آتی ہے
کہ نام سنتے ہی ہمارے ناظرین کے دماغ سڑ گئے ہونگے۔ مگر چونکہ اُنکو ایک قسم
کی خصوصیت تھی ہم نے اُن کا ذکر کر دیا۔ اُنکے کلام مین بعض شاعرانہ خوبیان
اور اچھی تشبیہین بھی ہین مگر اُن کے مذاق نے اُن خوبیون کو بھی گندہ اور پلید
کر دیا ہے۔

لیکن ریختی کا فن باوجود غیر مہذب ہونے کے دلچسپ ہے اور چرکین کی
شاعری کی طرح اذیت رسان نہین۔ مردون اور عورتون کے محاورون اور
لہجے مین تھوڑا بہت فرق ہر زبان مین ہوا کرتا ہے۔ مگر اتنا نہین جتنا ہمین اپنی
زبان مین نظر آتا ہے۔ فارسی عربی سب زبانون مین یہ امتیاز موجود ہے۔ مگر اردو
اس خصوصیت مین بڑھی ہوئی ہے فارسی اور عربی کا پُرانا مذاق تھا کہ
عورتین شعر کہتین تو اپنی زبان مین کہتین۔ اور مرد کبھی عورتون کی زبان سے
کوئی خیال ادا کرتے ہین تو زبان مین لطف پیدا کرنے کے لیے اُن کی زبان اختیار کرلیتے
یہی حال انگریزی کا ہے۔ اردو شاعری ہمیشہ سے صرف مردون کی زبان مین رہی
یہان تک کہ اس مین عورتین کہتی بھی ہین تو مرد بن کے کہتی ہین۔ مردون ہی کی
زبان اختیار کرتی ہین اور اپنے لیے ضمیرین تک مذکر استعمال کرتی ہین۔ اگر شاعر

کا نام نہ معلوم ہو تو کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ کسی مرد کا کلام ہے یا عورت کا۔

اُردو شاعری کا تیسرا یا چوتھا ہی دور تھا کہ شوخ طبع جوانون مین خیال پیدا ہوا کہ ریختہ کی طرح ایک ریختی ایجاد کی جائے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی مین ضرورت کے موقعون پر یہ زبان موزون کی تھی۔ گر وہان تک مضائقہ نہ تھا۔ میان رنگین نے اس رنگ کو مستقل طور پر اختیار کیا۔ جو دہلی کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کی صحبتون مین شریک رہا کرتے تھے۔ ابتداءً مہذب لوگون کی صحبت نے اس رنگ کو بے شرمی اور خلافِ تہذیب جانا۔ چنانچہ سید انشا کی زبانی ہم نے لکھنؤ مین دہلی کے جن مہذب سن رسیدہ بزرگ اور وہین کی ایک رنڈی نورا کی گفتگو لکھی ہے اُس مین وہ بزرگ فرماتے ہین " اور سب سے زیادہ ایک اور سُنیئے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ اپنے کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیون کی بولی اُس مین باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے۔ ہرچند اُس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہین کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہین۔ بھلا اس کو شعر کیونکر کہیے؟ سارے لوگ دلّی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لے کے مرد تک پڑھتے ہین۔

چلی وہان سے دامن اُٹھاتی ہوئی کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

سو اُس سچا ریے رنگین نے بھی اسی طرز پر قصہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم۔ لیکن سپاہ دار برچھی بھالے کا ہلانے والا تیغے کا چلانے والا تھا۔ تُو ایسا قابل کہان سے ہوا؟ اور شُہدا پن مزاج مین رنڈی بازی سے آگیا ہے۔ تو ریختہ کے تئین چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمیون کی بہو بیٹیان پڑھ کر مشتاق ہون۔ اور اُن کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے؟

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو یہان سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر کہتا ہے۔ ع۔ کہین ایسا نہ ہو کمبخت مین ماری جاؤن۔ اور ایک کتاب بنائی ہے اُس مین رنڈیون کی بولی لکھی ہے۔ جس مین آوپر والیان چیلین۔ آوپر والا چاند۔ اُجلی دھوبن۔ وغیرہ وغیرہ "

مگر مہذب بڈھے شکایت کرتے کرتے مرگئے۔ نوجوانوں کی رنگینی نے رنگین کے مذاق کو ترقی دے ہی کے چھوڑا۔ اور ریختی اُردو کا ایک فن ہو گیا جس کی ایجاد گو ایک دہلی ہی کے شاعر سے ہوئی تھی مگر لکھنؤ میں ہوئی۔ اور یہیں اُسے فروغ ہوا۔ قصے کے سلسلے میں اس زبان کو میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق نے جس اعلیٰ درجۂ کمال کو پہونچا دیا تعریف نہیں ہو سکتی۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے ہی نہیں پتہ چلتا کہ موزون کرنے میں شاعرانہ ضرورتوں نے بولنے کی زبان پر کہیں کچھ تصرف بھی کیا ہے یا نہیں۔ لیکن غزل گوئی میں رنگین کی جانشینی جان صاحب نے کی جو لکھنؤ کے ایک معمولی شخص تھے اور عاشور علی خان کی خرادپر چڑھ کے تیار ہوے تھے۔ گو کہ جان صاحب کے بعد اور ریختی گو بھی لکھنؤ میں پیدا ہوے۔ مگر جان صاحب پر کمال اور شہرت کا خاتمہ ہو گیا۔ اُنھوں نے غزلیں کہیں۔ واسوختیں کہیں اور اور بھی کئی نظمیں کہیں۔

ریختی میں اگر مخش اور بدکاری کے مذاق سے پرہیز کر کے پاکدامنی کے جذبات اختیار کیے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابل ترقی ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی۔ اس لیے ریختی گویوں کا قدم ہمیشہ جادۂ تہذیب و اعتدال سے باہر ہو گیا۔ اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا ہو مگر اخلاق کو نقصان پہونچ گیا

(۱۱)

نثر اُردو کی عمر نظم کے دیکھتے کم ہے۔ مدت تک تعلیم یافتہ لوگوں کی یہ وضع رہی کہ اگرچہ بعض لوگ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے مگر عام رجحان اور میلان اُردو غزل سرائی کی طرف تھا۔ اور ہندوستان میں اُردو شاعروں کی تعداد فارسی شاعروں سے بہت زیادہ تھی۔ مگر نثر میں سارے ملک کو فارسی ہی میں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ علوم و فنون کی کتابیں فارسی میں لکھی جاتیں۔ دین و مذہب کی کتابیں فارسی میں تصنیف ہوتیں۔ یہاں تک کہ بوڑھے سے لے کے بچے تک سب فارسی ہی میں خط و کتابت کرتے۔ بچوں کو مکتب میں فارسی ہی کی انشائیں پڑھائی جاتیں اور فارسی ہی میں خط لکھنا اُنھیں سکھایا جاتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ بول چال میں اُردو زبان

چاہے کیسی ہی شیرین و فصیح ہو گئی ہو لکھنے کی ضرورت پیش آئی اور سب گونگے ہو گئے۔

پہلے پہل اُردو مین میرامن دہلوی نے انگریزون کی حوصلہ افزائی و ہدایت سے اپنی کتاب چار درویش لکھی۔ اسی زمانے مین میرزا علی لطف نے اپنا تذکرۂ شعرائے اردو تصنیف کیا۔ جو عبداللہ خان صاحب مقیم حیدرآباد کی کوشش سے چھپ گیا ہے۔ اسی زمانے کے قریب مولوی اسمٰعیل صاحب شہید نے توحید و اتباع سنت پر اپنی کتاب تقویۃ الایمان تحریر فرمائی۔ جو کتابین اب چاہے جس نظر سے دیکھی جائین اُن دونون ادبی کمال دکھانے کے لیے نہین لکھی گئی تھین۔ اُن کی تصنیف سے صرف مقصود یہ تھا کہ بے تکلف اور سیدھی سادھی زبان مین مطلب ادا کر دیا جائے اور عوام فائدہ اُٹھا سکین۔ مذکورۂ بالا بزرگون کو اگر ادب اُردو کا کمال دکھانا ہوتا تو اُس زمانے کی انشا پردازی کے اصول کے مطابق ظہوری و نعمت خان عالی اور ابوالفضل و طاہر وحید کا رنگ اختیار کرتے جو اُسوقت ادبی دنیا پر حکومت کر رہا تھا۔ اور جسکے بغیر کوئی تحریر ملک مین قابل داد نہ تصور کی جاتی۔ تحریر ہی نہین گفتگو مین بھی اگر زیادہ تہذیب و شایستگی ملحوظ خاطر ہوتی تو وہی انداز اختیار کر لیا جاتا جیسا کہ سید انشا نے میرزا مظہر جان جانان کی تقریر کے چند الفاظ نقل کر کے بتا دیا ہے۔

سچ پوچھیے تو اُردو کی نثاری لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی جبکہ پہلے مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب اور اپنی دوسری کتابون کو شایع کیا۔ اُسی زمانے مین بعد نو رتن بھی لکھنؤ مین لکھی گئی جس کے مصنف محمد بخش مہجور شاگرد جرأت لکھنؤ ہی کی صحبت کے ساختہ و پرداختہ تھے۔

رجب علی بیگ سرور نے سچ یہ ہے کہ انشا پردازی کا اعلیٰ کمال دکھایا ہے۔ اور جسوقت وہ کتاب شایع ہوئی ہے اُردو صحبتون مین حیرت کے ساتھ دیکھی گئی۔ مگر بدقسمتی سے اُنھون نے دیباچے مین میرامن پر حملہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے اُن کے تمام کمالات اہل دہلی کے نزدیک خاک مین مل گئے۔ یہان تک کہ میر محمد حسین آزاد کے سے مہذب بزرگ بھی اُنھین "لکھنؤ کا شہدا" فرماتے ہین۔ اور معلوم نہین رجب علی

بیگ مرحوم سے اس گستاخی کا انتقام کب تک لیا جائے گا؟ میر امّن کا ہنر انشا پردازی انگریزوں کو اُن دنوں چاہے نظر آ گیا ہو مگر ہندوستان کے اہل زبان میں کسی کو نہ نظر آیا تھا اور نہ نظر آ سکتا تھا۔ اس لیے کہ انگریزی تعلیم کے اثر نے اُسوقت تک ملکی لٹریچر کا مذاق نہیں بدلا تھا۔ اور مشرقی ادب خیالوں اور دماغوں میں بسا ہوا تھا۔

ادبی رنگ کے متعلق میں نے کئی بار لکھا ہے اور پھر لکھتا ہوں کہ وہ بالکل تعلیم اور مذاق کی پرورش سے وابستہ ہوتا ہے۔ جس طرح غذاؤں خوشبوؤں اور رنگوں اور دیگر تمام چیزوں کو گرد کی معاشرت پسندیدہ بنا یا کرتی ہے۔ اور مختلف قوموں اور ملکوں میں اس قدر اختلاف رہتا ہے کہ ایک کی لذیذ ترین اور محبوب ترین چیز دوسرے کے نزدیک نہایت ہی بدمزہ اور سخت قابل نفرت ہوتی ہے۔ ویسے ہی ادب اور لٹریری مذاق کا حال ہے کہ جو رنگ ایک قوم میں پرورش پا کے دماغوں اور زبانوں پر چڑھ جاتا ہے دوسری قوم کے نزدیک بھی وہ بے لطف اور بدمزہ ہوتا ہے اور صحیح فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا کہ کون اچھا ہے اور کون بُرا ہے۔

جاہلیت عرب میں فصاحت و بلاغت کا رنگ یہ تھا کہ مقفّیٰ فقرے لائے جائیں عبارت میں تناسب و متداول الفاظ مترادف آئیں۔ اور ایک ہی مطلب بار بار ادا کر کے موثر اور دلچسپ بنایا جائے۔ اسی مذاق کو قرآن نے چونکہ وہ لسانِ قوم میں تھا نہایت معجز نما طرز سے تکمیل کو پہونچایا۔ پھر وہی مذاق ادب عربی کا عنصر اعظم بن گیا۔ آج کل کے معیار سے دیکھا جائے تو عربی کی فصیح ترین کتابیں مقامات حریری و تاریخ تیموری وغیرہ میں قافیہ پیمائی۔ تطویل بیجا۔ اور بے ضرورت الفاظ لانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جس کا مدتوں اور صدیوں تک ایک دنیا مزہ لیتی رہی ہے۔ یہی رنگ فارسی کے ادیبوں نے اختیار کیا۔ اور جو جو ادبی ترقی ہوتی گئی وہی رنگ پختہ اور گہرا ہوتا گیا۔ اور اُس مذاق کے دماغوں میں بسے ہونے کی وجہ سے وہی رنگ اُردو کے اُدبائے اولین نے اختیار کیا اور دنیا سے داد پائی۔ لہذا یہ خیال کرنا کہ چار درویش جن دنوں لکھی گئی ہے اُن دنوں وہ سوا انگریزوں کو پسند ہونے کے جو اُردو کو جانتے ہی نہ تھے ہندوستان کے اہل علم میں کوئی ادبی کمال تصور کی گئی ہو گی بالکل بے اصل ہے

اب انگریزی کے اثر سے بیشک ایسا زمانہ آگیا ہے جب اُردو کو پُرانے لٹریچر نے جو زیور اور لباس پنہایا تھا اُتار لیا گیا اور نئے مغربی کپڑے پہنائے گئے۔ چار درویش اور اُس کی سی دوسری کتابیں چونکہ پُرانے ادبی زیور و لباس سے معریٰ تھیں اس لیے لوگوں کو پسند آئیں۔ اس لیے نہیں کہ اُن میں کوئی خاص خوبی تھی بلکہ اس لیے کہ اُس پُرانے مقبول عام قومی لٹریچر کے رنگ سے معریٰ تھیں جو موجودہ لوگوں کو ناپسند ہے۔

اسی زمانے میں لکھنؤ میں مولوی غلام امام شہید نے اپنا مشہور مولد شریف لکھا جو اُس وقت کے ادبی مذاق میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ لوگوں کو بہت پسند آیا۔ اور مذہبی مقبولیت کی وجہ سے آج تک بہت پسند ہے۔

مگر موجودہ نثر اُردو اصل میں دہلی ہی سے نکلی اور ہمیشہ دہلی کی زیر بار احسان رہے گی۔ مرزا غالب نے اُردو انشا میں بے تکلفی کا رنگ اختیار کیا جو موجودہ مذاق سے بہت ہی قریب ہے۔ اگرچہ وہ بھی کبھی کبھی قافیہ بندی کی رعایت کر جاتے ہیں لیکن اس بے تکلفی کے ساتھ کہ پڑھنے والے کو قافیہ کا خیال بھی غور کرنے سے آتا ہے۔ موجودہ تعلیم نے لوگوں کو اس رنگ کو قبول کرنے کے لیے خوب تیار کر دیا تھا۔ ہر صحبت میں واہ واہ ہونے لگی۔ اُن کے بعد سر سید نے اس سادگی میں متانت پیدا کی مگر اس کوشش کے ساتھ کہ زبان دقیق نہ ہونے پائے۔ اور ایسی رہے کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ اُسے سمجھ لے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اس میں متانت کے ساتھ اور لطف پیدا کر دیا۔ جبکہ لکھنؤ کے لوگ انگریزی کے اثر سے دُور ہونے کے باعث ہنوز پُرانے ہی رنگ کے دیوانے تھے۔ یہاں واجد علی شاہ کے آخر ایام زندگی تک رنگین اور مقفیٰ عبارت لکھی جاتی تھی اور لوگوں کو اس سادگی کا مزہ نہیں ملنے پایا تھا۔ اب علی گڈھ سے تہذیب الاخلاق۔ آگرے سے تیرھویں صدی اور لکھنؤ سے اودھ پنچ نکل رہے تھے جن میں سے ہر ایک نثر اُردو کی ایک ممتاز شان رکھتا تھا۔ تہذیب الاخلاق میں متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ قومی درد کا سوز و گداز تھا۔ سلجھی ہوئی صاف زبان تھی۔ اور نئے مغربی فلسفہ و ادب سے لیے ہوئے خیالات اور اثر ڈالنے والے مضامین و خطبات تھے۔ تیرھویں صدی میں اعلیٰ نشیانہ قابلیت

کے ساتھ قدیم ادبی مذاق کی نگہداشت نئی خیال آرائیوں اور جدتوں کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اور پرانا شرقی لٹریچر کچھ ایسی جدت طرازیوں کے ساتھ نئے لباس مین ظاہر کیا جاتا تھا۔ کہ نئے اور پرانے دونوں گروہوں سے بے اختیار "واہ واہ" کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اودھ پنچ مین زبان اپنی اصلی شان مین دکھائی جاتی تھی جس مین مذاق کا پہلو غالب رہتا۔ اس مین مختلف لکھنے والے تھے اور ہرایک کا مذاق خاص لطف اور خاص خوبیان رکھتا تھا۔ منشی سجاد حسین اڈیٹر کی شوخیان۔ مرزا مچھو بیگ صاحب کی کوثر کی دھوئی ہوئی زبان۔ منشی احمد علی کسمنڈوی کی فارسیت کی اعلیٰ ادبی اور شاعرانہ دلچسپیان ظاہر کرنے والا رنگ۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر کی ہندی نظمین اور اُنکی خوبیون کو نہایت دلچسپی کے ساتھ ظاہر کرنے والے مضامین اُردو نثر مین ایک عجیب زندگی و شگفتگی پیدا کرا رہے تھے۔

اسی اثنا مین اودھ اخبار کے ساتھ پنڈت رتن ناتھ کا ناول "فسانہ آزاد" شایع ہونا شروع ہوا جس نے ملک پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اور اُردو دنیا ناول نویسی کے مذاق سے آشنا ہوکے اُسکی بے انتہا فریفتہ ہوگئی۔ فسانۂ آزاد مین جہان مصنف نے اپنے قلم سے کوئی سین دکھایا ہے یا کوئی واقعہ لکھا ہے وہی فسانۂ عجائب کا پرانا رنگ ترقیون کے ساتھ اختیار کیا ہے اور جہان دوسرون کی زبان سے گفتگو کرائی ہے بہت ہی سادی اور بے تکلف زبان رکھی ہے۔ خصوصاً عورتون کی زبان بہت ہی پاکیزہ ہے۔ گو کہ جابجا غلطیان بھی ہوگئی ہین۔ مگر سچ یہ ہے کہ اپنی کوشش مین وہ جس درجے تک پہونچ گئے ہین اُن سے پہلے کوئی نہین پہونچا تھا۔

یہی زمانہ ہے جبکہ مولوی نذیر احمد صاحب نے گورنمنٹ کی فرمایش سے تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا اور اپنی کتابون کے ذریعے سے ایک ایسی زبان ملک کے سامنے پیش کی جو کہین روانی اور صفائی مین بے نظیر ہے اور کہین لغات عربی سے مملو ہونے کے باعث سخت دقیق و بلیغ۔ اور اسی عہد مین مولوی محمد حسین صاحب آزاد کا لٹریچر ایک بہت ہی پسندیدہ رنگ پیش کر رہا تھا۔ خصوصاً اُنھون نے زبان اُردو کی تاریخ اور تذکرۂ شعرائے اُردو لکھکے ادب اُردو مین خاص ناموری حاصل کی۔

اسی زمانے مین ۱۸۸۲ء مین محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ مین نے مولوی محمد عبد الباسط صاحب محشر کے نام سے نکالا۔ جس کے ذریعے سے اڈیسن کا رنگ اردو مین ایسے دلکش عنوان اور موزون و مناسب الفاظ و خیالات مین پیش کیا گیا کہ ملک یک بیک چونک سا پڑا۔ ساتھ ہی میرے مضامین اودھ اخبار کے کالمون مین شایع ہونا شروع ہوے جنھون نے ملک کے سامنے ایک بالکل نیا لٹریچر پیش کیا جو اس قدر مقبول ہوا کہ ہر طرف سے مرحبا کی صدائین سنی جانے لگین۔ یکایک نظر آیا کہ اکثر مضمون نگار اُسی رنگ کو اختیار کر رہے ہین۔ اور ملک کا عام رجحان اُسی طرف ہے۔ اُسی درمیان مین مین نے اپنا ناول دلچسپ اور مؤثر ڈراما شہید وفا ملک کے سامنے پیش کیا۔ اور ہر طرف سے حوصلہ افزائی ہونے لگی۔

آخر ملک کا اصرار و تقاضا دیکھ کے آغاز ۱۸۸۷ء سے مین نے رسالہ دلگداز جاری کیا جس کا لٹریچر انگریزی دانون اور پرانے مذاق کے لوگون دونون مین مقبول ہوا۔ پھر ۱۸۸۸ء سے اُس کے ساتھ تاریخی ناولون کا سلسلہ جاری کیا گیا جن مین سب سے پہلا ناول "ملک العزیز ورجنا" ہے۔ ان ناولون کو ملک نے جس شوق سے لیا اُس کے بیان کرنے کی تو ضرورت نہین ہے مگر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ اُنھین ناولون کی وجہ سے واقعات کے معلوم کرنے اور کتابون کے مطالعے کا شوق بڑھنے کی بنیاد پڑی۔ اُنھین ناولون کے ذریعے سے ملک مین تاریخ کے پڑھنے اور واقعات عالم سے دلچسپی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور اُنھین ناولون اور دلگداز کے صفحون نے وہ رنگ پیدا کیا جس پر موجودہ ادب اُردو کی بنیاد قائم ہے۔

بہرحال نثر اُردو کا تعلق جہان تک پرانے ادبی رنگ سے ہے اسکی بنیاد لکھنؤ مین پڑی۔ ہان جدید رنگ کا آغاز دہلی سے ہوا مگر اس کوشش مین جہان تک ممکن ہوا لکھنؤ نے دہلی کی رفاقت کی۔ خصوصاً ظرافت کا مذاق تو لکھنؤ ہی سے پیدا ہوا اور لکھنؤ مین تکمیل کو پہونچا۔

لیکن زبان اردو کو جو ترقیاں لکھنؤ میں حاصل ہوئیں وہ شاعروں - ادیبوں نثاروں اور مصنفوں ہی تک محدود نہیں ہیں مختلف سوسائٹیوں اور طبقوں میں ترقی و وسعت زبان کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے ہر گروہ والوں کے لیے خاص دلچسپیاں پیدا کیں -

ان میں سے زیادہ قابل توجہ داستان گوئی ہے - جو در اصل فی البدیہ تصنیف کرنے کا نام ہے - یہ فن اصل میں عربوں کا ہے جہاں عہد جاہلیت میں بھی داستان گوئی کی صحبتیں مرتب ہوا کرتی تھیں - لیکن ہندوستان کی داستان گوئی کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ عرب کی قصہ خوانی سے اُن کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں - امیر حمزہ کی داستان جو داستان گوؤں کی اصلی اور حقیقی جولان گاہ ہے وہ دراصل فارسی میں تھی اور کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں امیر خسرو نام ایک قابل شخص نے اُسے تصنیف کیا - تاریخ سے ثابت ہے کہ فیروز تغلق کے عہد میں داستان امیر حمزہ موجود تھی -
دہلی کے مشہور داستان گو لکھنؤ میں آنا شروع ہوئے - یہاں رئیسوں نے اُن کی یہاں تک قدر کی کہ داستان سننے کو اپنی صحبتوں کا ایک عنصر اعظم قرار دے لیا - چند ہی روز میں لکھنؤ کے اندر اس کو اس قدر فروغ ہو گیا کہ کوئی دولتمند نہ تھا جس کی سرکار میں کوئی داستان گو نہ مقرر ہو - سیکڑوں داستان گو پیدا ہو گئے سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آج کل کے مقبول سے مقبول اسپیکروں میں سے ابھی تک کسی کو فصیح البیانی میں وہ درجہ نہیں نصیب ہو سکا ہے جو قادر الکلام داستان گوؤں کو حاصل تھا - دہلی میں بھی دو ایک صاحب کمال داستان گو آج تک پڑے ہیں مگر لکھنؤ میں اُن کا شمار بہت زیادہ ہے - اور اُن کے طرز تقریر کا اثر عوام شہر کی زبانوں پر بےحد پڑ گیا ہے - ناولوں کا ذوق پیدا ہونے کے بعد جب اس بات کی کوشش کی گئی کہ داستان کو داستان گوؤں ہی کی زبان میں قلمبند کرا دیا جائے تو لکھنؤ ہی ایسے باکمال داستان گو پیش کر سکا جنھوں نے ضخیم جلدیں لکھ کے اُردو داں پبلک میں پھیلا دیں - چنانچہ جاہ اور قمر کے تصانیف ملک میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں -

داستان کے چار فن قرار پا گئے ہیں - رزم - بزم - حسن و عشق اور عیاری -

ان چاروں فنون مین لکھنؤ کے داستان گوؤن نے ایسے ایسے کمال دکھائے ہین جن کا اندازہ بغیر دیکھے اور سُنے نہین ہو سکتا - الفاظ مین تصویر کھینچنا اور تصویرون کا نہایت گہرا دیرپا اثر سامعین کے دلون پر ڈال دینا ان لوگون کا خاص کمال ہے -

سوشل تفنن - مذاق ظرافت اور دل لگی کے عنوان سے بھی لکھنؤ مین علم زبان کے کئی فن پیدا ہو گئے جن مین کوئی مقام لکھنؤ کا مقابلہ نہین کر سکتا - انھین مین سے ایک فن پھبتی کہنا ہے - اسکو دراصل شاعرانہ تشبیہ و استعارے سے تعلق ہے لیکن اس مین اتنی خصوصیت ہے کہ یہ کسی کو بگاڑکے دکھانے - اُسکے عیب کے نمایان کرنے - اور برجستہ کوئی انوکھی - ہنسانے والی اور عیب و نقصان ظاہر کرنیوالی تشبیہ پیش کر دینے تک محدود ہے - لکھنؤ کے ادنی ادنی لڑکے - بازاری عورتین - جاہل ڈھکا نذار - ادنی طبقون کے اہل حرفہ تک ایسی برجستہ پھبتیان کہہ جاتے ہین - کہ باہر والون کو حیرت ہو جاتی ہے - ایک صاحب کربلاے معلّٰی کی زیارت کرکے واپس آئے اور براق کپڑے پہن کے دوستون مین آکے بیٹھے ہی تھے کہ ایک لونڈے نے کہا " آین یہ فرات کا بگلا کہان سے آگیا ؟" - ایک بوڑھے دولھا خضاب کرکے دولھن بیاہنے کو آئے اور بڑی دھوم کی برات لائے - زنانے سے نکل کے وہ محفل مین آرہے تھے - جوتا اُتارنے کے لیے جھکے اور چند قدم فرش پر گھٹنے ٹیک کے چلے - کسی کی زبان سے نکلا " دولھا کہان ہین ؟" شوخ مزاج رنڈی جو کھڑی مجرا کر رہی تھی ہنس کے بولی " اے وہ مینون مینون چلا تو آتا ہے " ایک کبڑا چوک مین پونڈے بیچ رہا تھا صدا یہ تھی کہ " ارے بھئی یہ کنکوے کون لوٹے گا ؟" کیا اس سے زیادہ بامذاق کوئی استعارہ ہو سکتا ہے ؟ نازک ترین استعارہ وہ ہے جس مین مشبہ اور مشبہ بہ دونون کا نام نہ لیا جائے - صرف مشبہ بہ کی کوئی خصوصیت بتا کے کلام مین لطف پیدا کر دیا جائے - اس کی اس سے بہتر مثال کون ہو سکتی ہے کہ نہ پونڈے کا نام لیا نہ لگّے کا جس سے کنکوے لوٹے جاتے ہین - صرف اتنا کہہ کے کہ " کنکوے کون لوٹے گا " یہ بتا دیا کہ یہ پونڈے لگّون کے برابر ہین جن سے کنکوے لوٹے جاتے ہین - اور پھر اس سے زیادہ مناسب اور بازاری لوگون کے مذاق کی کوئی تشبیہ نہین ہو سکتی - اسی طرح کی صدہا ہزارہا مثالین ہین جو بیان کی

لیکن زبان اُردو کو جو ترقیاں لکھنؤ مین حاصل ہوئین وہ شاعرون - ادیبون
نثارون اور مصنفون ہی تک محدود نہین ہین مختلف سوسائٹیون اور طبقون مین ترقی
و وسعت زبان کی نئی نئی صورتین پیدا ہوئین جنھون نے ہر گروہ دلون کے لیے
خاص دلچسپیان پیدا کین -

ان مین سے زیادہ قابل توجہ داستان گوئی ہے - جو دراصل فی البدیہہ تصنیف
کرنے کا نام ہے - یہ فن اصل مین عربون کا ہے جہان عہد جاہلیت مین بھی داستان
گوئی کی صحبتین مرتب ہوا کرتی تھین - لیکن ہندوستان کی داستان گوئی کی نسبت
ہم نہین جانتے کہ عرب کی قصہ خوانی سے اُن کا کوئی رشتہ ہے یا نہین - امیر حمزہ کی
داستان جو داستان گوئون کی اصلی اور حقیقی جولان گاہ ہے وہ دراصل فارسی مین
تھی اور کہتے ہین کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے مین امیر خسرو نام ایک قابل شخص نے
اُسے تصنیف کیا - تاریخ سے ثابت ہے کہ تغلق کے عہد مین داستان امیر حمزہ موجود تھی -
دہلی کے مشہور داستان گو لکھنؤ مین آنا شروع ہوے - یہان رئیسون نے اُن کی
یہان تک قدر کی کہ داستان سننے کو اپنی صحبتون کا ایک عنصر اعظم قرار دے لیا -
چند ہی روز مین لکھنؤ کے اندر اس کو اس قدر فروغ ہو گیا کہ کوئی دولتمند نہ تھا
جس کی سرکار مین کوئی داستان گو نہ مقرر ہو - سیکڑون داستان گو پیدا ہو گئے سچ
تو یہ ہے کہ ہمارے آج کل کے مقبول سے مقبول اسپیکرون مین سے ابھی تک کسی
کو فصیح البیانی مین وہ درجہ نہین نصیب ہو سکا ہے جو قادر الکلام داستان گوئون کو
حاصل تھا - دہلی مین بھی دو ایک صاحب کمال داستان گو آج تک پڑے ہین
مگر لکھنؤ مین اُن کا شمار بہت زیادہ ہے - اور اُن کے طرز تقریر کا اثر عوام شہر کی
زبانون پر بےحد پڑ گیا ہے - ناولون کا ذوق پیدا ہونے کے بعد جب اس بات کی کوشش
کی گئی کہ داستان کو داستان گوئون ہی کی زبان مین قلمبند کرا لیا جائے تو لکھنؤ ہی
ایسے باکمال داستان گو پیش کر سکا جنھون نے ضخیم جلدین لکھ کے اُردو دان پبلک
مین پھیلا دین - چنانچہ جاہ اور قمر کے تصانیف ملک مین بڑی قدر کی نگاہون سے
دیکھے جاتے ہین -

داستان کے چار فن قرار پا گئے ہین - رزم - بزم - حسن و عشق اور عیاری۔

ان چارون فنون مین لکھنؤ کے داستان گوؤن نے ایسے ایسے کمال دکھائے ہین جن کا
اندازہ بغیر دیکھے اور سُنے نہین ہو سکتا - الفاظ مین تصویر کھینچنا اور تصویرون کا نہایت
گہرا اور پایا اثر سامعین کے دلون پر ڈال دینا ان لوگون کا خاص کمال ہے -
سوشل تفنن - مذاق ظرافت اور دل لگی کے عنوان سے بھی لکھنؤ مین علم زبان
کے کئی فن پیدا ہو گئے جن مین کوئی مقام لکھنؤ کا مقابلہ نہین کر سکتا - انھین مین
سے ایک فن پھبتی کہنا ہے - اسکو دراصل شاعرانہ تشبیہ و استعارے سے تعلق ہے
لیکن اس مین اتنی خصوصیت ہے کہ یہ کسی کو بگاڑ کے دکھانے - اُسکے عیب کے نمایان
کرنے - اور برجستہ کوئی انوکھی - ہنسانے والی اور عیب و نقصان ظاہر کرنیوالی
تشبیہ پیش کر دینے تک محدود ہے - لکھنؤ کے ادنےٰ ادنےٰ لڑکے - بازاری عورتین -
جاہل دُکاندار - ادنےٰ طبقون کے اہل حرفہ تک ایسی برجستہ پھبتیان کہہ جاتے ہین
کہ باہر والون کو حیرت ہو جاتی ہے - ایک صاحب کربلاے معلےٰ کی زیارت کر کے
واپس آئے اور براق کپڑے پہن کے دوستون مین آ کے بیٹھے ہی تھے کہ ایک
لونڈے نے کہا " آئین یہ فرات کا بگلا کہان سے آ گیا ؟" - ایک بوڑھے دولھا
خضاب کر کے دولھن بیاہنے کو آئے اور بڑی دھوم کی برات لائے - زنانے سے
نکل کے وہ محفل مین آ رہے تھے - جوتا اُتارنے کے لیے جھکے اور چند قدم فرش پر گھٹنے
ٹیک کے چلے - کسی کی زبان سے نکلا " دولھا کہان ہین ؟" شوخ مزاج رنڈی جو
کھڑی مجرے کر رہی تھی ہنس کے بولی " اے وہ مینون مینون چلا تو آتا ہے "! ایک
کبڑا چوک مین پونڈے بیچ رہا تھا صدا یہ تھی کہ " ارے بھئی یہ کنکوے کون
لوٹے گا ؟" کیا اس سے زیادہ بامذاق کوئی استعارہ ہو سکتا ہے ؟ نازک ترین استعارہ
وہ ہے جس مین مشبہ اور مشبہ بہ دونون کا نام نہ لیا جائے - صرف مشبہ بہ کی کوئی
خصوصیت بتا کے کلام مین لطف پیدا کر دیا جائے - اس کی اس سے بہتر مثال کون
ہو سکتی ہے کہ نہ پونڈے کا نام لیا نہ لگّے کا جس سے کنکوے لُوٹے جاتے ہین - صرف
اتنا کہہ کے کہ " کنکوے کون لوٹے گا " یہ بتا دیا کہ یہ پونڈے لگّون کے برابر ہین جن سے
کنکوے لوٹے جاتے ہین - اور پھر اس سے زیادہ مناسب اور بازاری لوگون کے
مذاق کی کوئی تشبیہ نہین ہو سکتی - اسی طرح کی صدہا ہزارہا مثالین ہین جو بیان کی

صحبتوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت سُنی جاتی ہیں۔

دوسرا "ضلع" ہے۔ یہ دراصل شاعرانہ رعایت ہے جس نے عوام کی بات چیت اور مذاق کی گفتگو میں آکے خاص رنگ پیدا کر لیا ہے۔ ضلع میں کوشش کی جاتی ہے کہ جس چیز کا تذکرہ آجائے اُس کے تمام متعلقات کسی نہ کسی پہلو سے باتوں میں لے آئے جائیں۔ آزاد فقیر جو ایک خاص وضع رکھتے تھے ضلع بولنے میں باکمال مانے جاتے تھے۔ آمانت نے اپنی شاعری میں رعایت کی اس قدر کوشش کی کہ تمام شاعرانہ خوبیوں سے قطع نظر کر کے رعایت ہی کو اپنا مقصد قرار دے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا کلام شاعری کے درجے سے نکل کے ضلع بولنے کے حکم میں داخل ہو گیا۔ مگر لکھنؤ کے اکثر عوام نے اپنی بے تکلفی کی صحبتوں میں اس فن کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ آمانت کی شاعری پیچھے پڑ گئی۔ سچ یہ ہے کہ کسی جگہ کے لوگ ضلع بولنے میں اہل لکھنؤ کے عُشر عشیر درجے کو بھی نہیں پہونچ سکتے۔ اس فن میں ایک کتاب بھی شایع ہو گئی

تیسرا فن "تُک بندی" ہے۔ یہ شاعری کی قافیہ پیمائی ہے۔ بہت سے جاہل جب ادھر توجہ کرتے ہیں تو جواب سوال میں اس طرح فی البدیہہ قافیہ استعمال کرتے ہیں کہ بڑے بڑے شعرا کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ہم نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایک ہندو بُڑھیا کے کاتے والا دیکھا تھا جو صبح کو خوانچہ لگا کے نکلتا۔ صورت دیکھتے ہی صدہا بازاری لونڈے اُسے گھیر لیتے۔ اور وہ سر راہ خوانچہ رکھ کے بیٹھ جاتا۔ فوراً لونڈوں سے اُس سے تُک بندی میں مقابلہ شروع ہو جاتا۔ سارا مجمع ایک طرف ہوتا۔ فریقین میں گالیوں کی بوچھار رہتی۔ مگر شرط تھی کہ کوئی گالی تُک سے باہر نہ ہو۔ اور کوئی قافیہ رہ نہ جائے۔ ہم نے اُسے بیسیوں بار دیکھا۔ گھنٹوں اُس سے مقابلہ رہتا۔ مگر ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ جواب میں کبھی عاجز رہا ہو۔ کوئی نہ کوئی قافیہ ڈھونڈھ کے پیش ہی کر دیتا تھا۔

اسی طرح مذاق اور گفتگو میں طرح طرح کی خیال آفرینیاں ہوتی تھیں۔ اور جاہل عوام بعض وقت ایسے خیالات پیش کر دیا کرتے تھے کہ بڑے بڑے شعرا چھوٹ میں رہ جاتے۔ یہ زمانہ دراصل لکھنؤ کا گولڈن ایج تھا۔ شاعری اور ادبی خوبیاں لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھیں۔ ہر شخص جو معمولی طور پر پڑھنے میں شُد بُد

ہو جاتا طبع آزمائی شروع کردیتا - جہلا و عوام - ادنیٰ طبقے کے لوگون - اور گھر کی بیٹھنے والی عورتوں تک مین شاعرانہ لوچ اور ادبی نزاکتین پیدا ہوگئی تھین - اَن پڑھ کبڑیے شاعر تھے - اور جہلا کی زبان بھی اس قدر شستہ و رُفتہ - اخلاقی حفظ مراتب کے الفاظ سے مملو - اور تمدنی آداب سے لبریز تھی کہ اکثر صاحب علم اُن کی گفتگو سُن کے ششدر رہ جاتے - اور کسی کو اُن پر جاہل ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا - سودا بیچنے والون کی صدائین شاعرانہ نکات اور فصاحت و بلاغت کے غوامض سے اس قدر آراستہ و پیراستہ تھین کہ اوروں کو سمجھنا بھی دشوار تھا -

ادنیٰ طبقے والون نے بھی اپنے مذاق کے مطابق خاص ادبی دلچسپیان پیدا کر لی تھین - مثلاً ایک فن خیال کا پیدا ہوگیا - لوگ فی البدیہہ اشعار تصنیف کرکے دائرے پر گاتے - اس کا نام خیال اس لیے رکھا گیا کہ ہر شخص اپنی تخئیل کا جوہر دکھائے اور کوئی نئی بات پیدا کرے - اس فن مین یہان بہت سے باکمال پیدا ہوے جن کو اعلیٰ سوسائٹی اور تعلیم یافتہ لوگون کی صحبتون سے کوئی تعلق نہ تھا مگر بجائے خود اگر غور کیجیے تو وہ اصلی اور فطری شاعری تھی اور اسی وضع کی شاعری جیسی کہ عہد جاہلیت عرب مین تھی -

اسی طرح ایک گروہ ڈنڈے والون کا پیدا ہوگیا - ان لوگون کی یہ شان تھی کہ قریب کے زمانے کے اہم اور مشہور واقعات کو کمال آزادی کے ساتھ موزون کرتے - جو جیسا ہوتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا صاحب اثر اور دولتمند ہوئے ویسا ہی بڑی بیباکی سے دکھاتے - اور ثابت کرنے کہ ملک و قوم کو اُس سے کیا فائدہ ہوا یا کتنا بڑا ضرر پہونچا - پھر اپنی اُن نظمون کو ایک شعرخوانی کی خاص وضع مین ڈنڈے بجا بجا کے سُناتے -

عورتون کی زبان مردون کے مقابل ہر ملک اور ہر قوم مین زیادہ شستہ اور دلکش ہوتی ہے - مگر لکھنؤ مین یہ خاص بات تھی کہ محلات اور محترم خاندان کی معزز بیگمون کی زبان مین علاوہ نسائی دلفریبیون کے ادبی اور شاعرانہ نزاکتین پیدا ہوگئی تھین - باتین کرتین تو معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہین - اور غور کیجیے تو صحت الفاظ - پیاری بندشین - اور طرز ادا کی نزاکتین بتاتین کہ زبان

کی خوبیاں اس سرزمین مین کس اعلیٰ کمال کو پہونچ گئی ہین -

(۱۳)

زبان اور شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم وفضل مین بھی ہندوستان کے تمام شہرون سے زیادہ ترقی کی - اگر سچ پوچھیے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد وقرطبہ اور اقصاے مشرق کا نیشاپور وبخارا تھا -

یہان کے علم وفضل کا آغاز علماے فرنگی محل سے ہوا - جن کے حالات کی طرف اس مضمون کے آغاز مین اشارہ کیا جا چکا ہے - علم بے شک یہان دہلی ہی سے آیا ہوگا - لیکن پرانے زمانے مین علماے دہلی مین سے صرف ایک شیخ عبد الحق نظر آتے ہین جنھون نے حدیث اور علوم دینیہ مین شہرت دوام حاصل کی - فرنگی محل کے سے کسی دار العلوم کا وہان کسی زمانے مین پتہ نہین لگتا - اہل فرنگی محل کے مشہور ہو جانے کے بعد دہلی مین شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان البتہ بہت مشہور ہوا - جن کے فیض وبرکت سے آج ہندوستان کے تمام شہرون مین علم حدیث کی تعلیم جاری ہوئی - لیکن اگر علم حدیث کی تعلیم اس نامور خاندان دہلی کی یادگار ہے تو اُس کے ساتھ ہی صرف ونحو منطق وحکمت - اور معانی وبیان اور دیگر فنون درسیہ کی تعلیم لکھنؤ کی نامور یونیورسٹی فرنگی محل کی یادگار ہے -

غائر نظر ڈالنے اور جستجو سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جیسے معقولی علما لکھنؤ اور خاص فرنگی محل مین پیدا ہوے کبھی کسی زمانے مین اور کسی جگہ ہندوستان مین نہین پیدا ہو سکے تھے - اس کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ سلسلۂ درس مین جو کتابین جاری ہین وہ یا تو سلف کے نامورانِ عجم کی تصنیف ہین یا فرنگی محل والون کی - یا اُن لوگون کی جنھون نے فرنگی محل سے فیض حاصل کیا تھا -

مجتہدین شیعہ کا آغاز بھی فرنگی محل ہی سے ہوا - لکھنؤ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی صاحب نے بھی ابتداءً کتب درسیہ فرنگی محل ہی مین پڑھی تھین - پھر عراق مین جا کے علماے کربلا ونجف کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا - اور واپس آ کے خود فرنگی محل والون کی تصدیق وتقریب سے مجتہد اور شیعہ فرمانروایان وقت کے مقتدا قرار پائے - اُنھون نے چونکہ عراق مین تعلیم پائی تھی لہذا عربی کا

نیا ادبی ذوق اپنے ساتھ لائے۔ اور ادبیت مین خاندان اجتہاد اور لکھنؤ کے شیعہ علما کو فرنگی محل والون پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی۔ اور آج تک حاصل ہے۔

علماے شیعہ کے ادبی مذاق نے لکھنؤ کو ادب کی تعلیم کا اعلیٰ ترین مرکز بنا دیا جس نے مفتی میر عباس صاحب کا ایسا ادیب گران پایہ پیدا کیا۔

علوم دینیہ مین سے فقہ۔ اصول فقہ۔ کلام اور عقائد مین۔ علوم ادبیہ مین سے نحو و صرف۔ اور معانی و بیان مین۔ علوم عقلیہ مین سے منطق۔ فلسفہ۔ طبعیات و الٰہیات مین۔ اور علوم ریاضی مین سے اقلیدس۔ اور ہیأت مین علماے فرنگی محل کو خاص ناموری حاصل تھی۔ اور سارے ہندوستان مین ان علوم کی تعلیم کا مرکز اصلی لکھنؤ تھا۔ ادب۔ شاعری۔ اور عروض عربی کو علماے شیعہ و مجتہدین لکھنؤ نے اپنا بنا لیا تھا۔

مناظرہ جس سے ہماری مراد یہان خاص کلامی مباحث اور شیعہ و سنی کا باہمی رد و قدح ہے۔ اس فن کا آغاز ہندوستان مین قاضی نور اللہ شوستری سے ہوا۔ جو ایران سے خاص اس لیے آئے تھے کہ سنیون کی تردید کرین جبھی سے یہان شیعہ و سنی مین جھگڑے پیدا ہو گئے۔ اور آخر قاضی صاحب کے ایک مدت بعد شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے شیعون کی رد مین تحفۂ اثنا عشریہ لکھی۔ مولوی دلدار علی صاحب نے اُس کے بعض ابواب کی تردید مین کچھ لکھا۔ پھر مولانا حیدر علی پیدا ہوے جو اصل مین رہنے والے تو فیض آباد کے تھے مگر اُن کا نام لکھنؤ ہی سے چمکا۔ اُنھون نے منتہی الکلام لکھی جو شیعون کی تردید مین اعلیٰ ترین کتاب سمجھی جاتی تھی۔ اسی زمانے مین مولوی لطف اللہ صاحب نے جو لکھنؤ مین تحصیل علم کر کے یہین کے ہو گئے تھے اپنی کئی کتابین لکھین جن مین تحقیق و تردید کے علاوہ شوخی بیان بھی تھی۔ میان مشیر نے اُنکی تردید بڑے زور و شور سے کی لیکن سچ یہ ہے کہ اُن کی کتاب تردید کے درجے سے گذر کے ہزل گوئی و ہجو کی سرحد مین داخل ہو گئی۔ آخر مین مولوی حامد حسین صاحب نے سُنیون کے مذہب کی تردید مین بہت بڑی بڑی ضخیم کتابین لکھ دین جن مین محدثانہ شان سے سُنیون کے

مذہب کی تردید کی ہے۔ اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی عبد الشکور صاحب بھی اس فن میں اہل سنت کی طرف سے نمود حاصل کر رہے ہیں۔

ہمارے مذاق میں مذہبی رد و قدح چاہے کسی فریق کے لوگوں کو خوش کر دے مگر بالکل بے نتیجہ ہے۔ اور اس کے نفع سے مضرت بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن اس موقع پر ہمیں صرف یہ دکھانا ہے کہ اس فن میں بھی لکھنؤ نے جو عروج حاصل کیا ہے اس سے پہلے کبھی کسی شہر کو نہیں نصیب ہو سکا تھا۔

علوم دینیہ میں سے لکھنؤ میں تفسیر۔ حدیث۔ رجال۔ اور تاریخ کی کمی تھی۔ ان میں سے تفسیر کا فن ایک معمولی درجے تک لکھنؤ میں موجود تھا۔ اور جتنا تھا اس سے زیادہ اور بھی کہیں نہ تھا۔ تاہم بعض شہروں میں بعض نامور مفسر گذرے ہیں مگر اُن کا تبحر و کمال اُنھیں کی ذات تک محدود رہا اور اُنھیں پر ختم ہو گیا۔ حدیث کو دہلی ہی کے ساتھ خصوصیت رہی۔ آخر عہد میں مولانا محمد عبد الحی مرحوم مکۂ معظمہ کے شیوخ حدیث سے درس و روایت حدیث کی سند حاصل کر کے آئے اور سلسلۂ درس بھی جاری کر دیا۔ مگر اس فن کو یہاں اچھا نشو و نما نہیں ہونے پایا۔ رجال کا فن حدیث کے تابع ہے۔ حدیث میں جس قدر توغل بڑھتا ہے اُسی قدر فن رجال میں انسان کی بصیرت بڑھتی جاتی ہے۔ لہذا علمائے لکھنؤ جس قدر حدیث کے فن میں ناقص تھے اُسی قدر رجال میں بھی ناقص رہ گئے۔ باقی رہی تاریخ اس فن کو ہندوستان میں کبھی عروج نہیں حاصل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سوسائٹی کی ضرورت سے فارسی دانوں میں تاریخ کا بہت کچھ مذاق تھا۔ مگر علمائے ہند نے اس فن کو افسانہ خوانی سے زیادہ وقعت کبھی نہ دی۔ جس کی وجہ سے عموماً علما میں ایک بہت بڑا نقص رہ جاتا تھا۔ اور یہی چیز تھی جس نے ہندوستان کے بچے بچے کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ "عالموں کو زمانہ شناسی سے کیا کام؟ وہ لوگ تو سیدھے سادے جنتی ہوتے ہیں!"

لیکن زمانے کی ضرورتیں دیکھ کے دونوں فریق کے علما نے اپنے نصابوں میں مناسب اضافہ شروع کر دیا ہے۔ اور دوسری طرف ندوۃ العلما کا دار العلوم قائم ہے جو ان ضروری علوم کی طرف خاص توجہ کر رہا ہے جو اسوقت تک متروک تھے

لیکن ان نقصانات کے ساتھ بھی لکھنؤ مین جو کچھ ہوا دیگر مقامات سے بہت زیادہ ہے۔

(۱۴)

یہ ہم بتا چکے ہین کہ شیعہ خاندانِ اجتہاد اور فرنگی محل کے علماے اہلِ سنت کی برکت سے اس آخری دربار کے عہد مین علم و فضل نے لکھنؤ مین کیسا عروج حاصل کیا اور اپنی سواد مین کیسی علمی کشش اور مرجعیت پیدا کرادی۔ لیکن ابھی ہمین طب یونانی سے بحث کرنا باقی ہے۔

یہ شریف ترین فن جس کو عالم انسانی کے محفوظ رکھنے اور نسل انسانی کو ترقی دینے سے واسطہ ہے۔ گو کہ اس کا ظہور ہر قدیم ملک مین خود رو طریقے اور جزئی تجربات سے ہوا ہے مگر قدیم الایام مین مغرب کی طرف اہل یونان نے اس فن مین بہت ہی نمایان ترقی کی تھی۔ اور مشرق مین ہندوون کے ناموران سلف نے اسے اعلیٰ درجۂ کمال پر پہونچا دیا تھا۔ مسلمانون مین جب دربار خلافت قائم ہوا تو یہ فن دونون جگہ سے آیا۔ اور دونون سرزمینون کے حاذق اطبا دربارِ بغداد کے طبیب تھے۔ ابتداءً دو ایک صدیون تک تمام مستند اطباے دربارِ عباسی ہندو تھے۔ عیسائی تھے۔ یہودی تھے۔ مگر مسلمان نہ تھے۔ مگر اس دور کے اطباے باکمال چاہے کسی مذہب کے پیرو ہون آغوش اسلام کے پروردہ اور عالم اسلامی کے ممتاز ناموِر تھے۔ اور انھین کے ہاتھون سے فن طب ایک نئی شان اور نئے عنوان سے مدوّن و منضبط ہونا شروع ہوا۔ جس مین تھوڑی اصلاح اور رد و بدل کے بعد اصولی ترتیب تو یونانیون کی برقرار رکھی گئی مگر تجربات ہر ملک اور ہر قوم کے یکسان طور پر لیے گئے۔

اس کے چند روز بعد مسلمان اطباے نامور پیدا ہونا شروع ہوے۔ اور اُنھون نے فن طب کو اپنے اجتہادون اور اپنے تجربات سے اپنا بنانا شروع کیا۔ یہان تک کہ ابن سینا نے قانون کی سی بے نظیر و لاجواب کتاب لکھ کے دنیا کے ہاتھ مین دیدی۔ اور اُسکے آگے مشرق و مغرب کی تمام قومون نے سر جھکا دیا۔ اُدھر دربارِ اُندلس نے عمل بالید اور تجربات مین مشرق سے بھی زیادہ ترقی کی۔ اور فن طب مسلمانون کا خاص فن بن گیا جس کے مرجع و ماویٰ ہر جگہ وہی بنتے۔ ہر قوم اُسے

وفنون سے حاصل کر رہی تھی۔ اور اُسی پر یورپ کی موجودہ ڈاکٹری کی عمارت قائم ہوئی جس کو زیادہ تعلق اُندلس کے اسلامی طبی اسکول سے تھا۔

لیکن ادھر آخری صدیوں میں جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوا تو اس کا اثر سب سے پہلے اُن کے علوم وفنون میں اور سب سے زیادہ فن طب میں نمایاں ہوا۔ اور اکثر ممالک میں اُس کی وہی حالت ہوگئی جو عروج یونان کے آغاز میں تھی یعنی معمولی قابلیت کے لوگ بغیر اس کے کہ فن کی اعلیٰ ترین کتابوں پر اُنکی نظر پڑی ہو اپنے جزئی تجربوں سے لوگوں کا علاج کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں مصر وعرب شام وعراق فن جاننے والے طبیبوں سے خالی ہوگئے۔ صرف ایران اور ہندستان میں یہ فن باقی تھا۔ لیکن اس پچھلی صدی میں ایران بھی طبیبوں سے خالی ہوگیا۔ اور تمام ممالک اسلام میں اپنے اس فنِ قدیم کے متعلق ایسی جہالت تھی کہ جب یورپ کے فرانسیسی اور انگریز ڈاکٹر نمودار ہوئے تو عوام وخواص سب کو ایک نعمتِ الٰہی نظر آئے۔ اور کسی کو اس کی حس نہ تھی کہ یہ اصلی فن ہمارا ہی تھا یا [illegible] یہان بھی کبھی اطبا ہوتے تھے۔

مسلمانوں کی طب کو اگر فنا ہونے سے بچایا تو صرف ہندوستان نے۔ جہان آج تک اطبائے یونانی یورپ کی جدید اصناف طب کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اور باوجودیکہ خیراتی ہسپتال گانون گانون موجود ہیں مگر پھر بھی لوگون کو جو اعتبار یونانی اطبا کے علاج پر ہے ڈاکٹرون پر نہین۔

دہلی مین اگلے دنون اس فن کے بہت سے باکمال گذرے جن مین حکیم ارزانی۔ حکیم شفائی خان۔ حکیم علوی خان۔ حکیم محمد شریف خان بہت اعلیٰ شہرت وکمال کے اطبا گذرے ہین۔ لکھنؤ مین برہان الملک کے زمانے سے دہلی کے حاذق اطبا سرزمین اودھ مین آنا شروع ہوگئے۔ خصوصاً شجاع الدولہ کے عہد مین تو دہلی کے دو ایک طبیبون کے سوا جتنے تھے سب یہین چلے آئے۔ فیض آباد کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہان جتنی سرکارین تھین اُن مین سے ہر ایک سے کوئی یونانی طبیب ضرور وابستہ تھا۔ جن کا بہت کچھ ادب اور پاس ولحاظ کیا جاتا۔ اور یہ لوگ تنخواہ کے علاوہ روزانہ انعام واکرام سے سرفراز ہوتے رہتے۔

آصف الدولہ کے زمانے سے جب لکھنؤ کمالون کی قدردانی کا مرکز قرار پایا تو دہلی کے بہت سے خاندانی اطبا نے یہین توطن اختیار کر لیا - اور چند روز کے بعد زبان اور شاعری کی طرح فن طب بھی خاص یہین کا فن بن گیا - چنانچہ لکھنؤ نے حکیم مسیح الدولہ حکیم شفاء الدولہ - حکیم مرزا محمد علی - حکیم سید محمد مرتعش - حکیم مرزا کوچک - حکیم بنا - حکیم مرزا محمد جعفر کے ایسے عالی پایہ و گران قدر طبیب پیدا کیے جو سچ یہ ہے کہ اپنے فنون کے مجتہد تھے - اور سلف کے سارے سرمایۂ علمی پر اُن کی نظرین تھین - ہوتے ہوتے فن طب کو یہان تک ترقی ہوئی کہ لکھنؤ کا شاذ و نادر ہی کوئی محلہ ہوگا جس مین کوئی نامور خاندان اطبا نہ موجود ہو - خاص شہر کے صدہا محلون کے علاوہ گرد و نواح کے گانون اور قصبون مین بھی ہزارون مطب جاری تھے - اور ہندوستان کے جن دربارون اور شہرون مین مشہور و نامور طبیب تھے سب لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے تھے - چنانچہ قصبۂ موہان کے ایک طبیب کو دربار گیکواڑ بڑودہ مین وہ عزت حاصل ہوئی جو بہت کم اطبا کو حاصل ہو سکی ہوگی - غرض ایسے نامور طبیب خاک لکھنؤ نے پیدا کیے جن کی مسیحا نفسی کے کارنامے آج تک بچے بچے کی زبان پر ہین -

دربار اودھ کے آخر عہد مین سید محمد مرتعش کے ایک شاگرد رشید حکیم محمد یعقوب نے اپنا مطب جاری کر کے ایسی مرجعیت عامہ حاصل کی کہ اُن کی ذات سے ایک بہت بڑے نامور طبی خاندان کی بنیاد پڑ گئی - جو آج بلا مبالغہ دنیا بھر مین جواب نہین رکھتا - اسی خاندان کے مرحوم ناموروں مین حکیم محمد ابراہیم - حکیم حافظ محمد عبد العلی - حکیم محمد اسمٰعیل - حکیم محمد مسیح - حکیم محمد عبد العزیز - حکیم حافظ محمد عبد الولی تھے - اور حکیم عبد الحفیظ صاحب - حکیم عبد الرشید صاحب - اور حکیم عبد المعید حسب اسوقت اپنی مسیحائی کے کمالات دکھا رہے ہین - کاش یہ اپنے خاندانی فن کو چھوڑ کے دوسری ہوسون مین نہ پڑتے -

دہلی مین حکیم محمد شریف خان کا خاندان اسوقت تک موجود ہے - جس مین حکیم محمود خان اور حکیم عبد المجید خان کے ایسے باکمال گذر چکے اور حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب بزرگون کے نام کو اپنے ذاتی کمالات سے آج تک ظاہر کر رہے ہین - دہلی مین حکیم محمد اجمل خان صاحب نے ایک مدرسۂ طبیہ بھی جاری

کر دیا ہے اور طبی ویدک کانفرنس قائم کر کے اپنے فن کو بہت عروج دے رہے ہین
اُن کے مقابل لکھنؤ مین حکیم عبد العزیز صاحب نے مدرسۂ تکمیل الطب قائم کیا جس سے
ہر سال بیسیون اطبا تیار ہو کے اقطار ارض مین پھیلتے اور لکھنؤ کی طبی مرجعیت کا
ثبوت دیتے ہین۔

بہر تقدیر مسلمانون کا برائے نام یونانی فن طب آج اگر دنیا بھر مین کہین زندہ ہے
تو ہندوستان مین۔ اور ہندوستان مین اُسکے مرکز دو ہی شہر ہین۔ دہلی اور لکھنؤ
مگر دہلی مین صرف ایک حکیم محمود خان کا خاندان ہے۔ اور لکھنؤ مین ایسے بیسیون
خاندان پڑے ہین۔ دہلی مین بعض اور اطبا بھی مطب کرتے نظر آتے ہین مگر وہ اسی
زمانے کے جدید طبیب ہین جنھون نے اپنے مطب جما لیے ہین۔ لکھنؤ مین گو کہ بہت
سے نئے طبیب ہین۔ لیکن ایسے بہت سے خاندان بھی ہین جن مین صدیون سے
فن طب کو ترقی رہی۔

لکھنؤ اور دہلی کے اطبا مین ایک اور فرق بھی ہے۔ طب کا موجودہ نصاب تعلیم
ہمین نہین معلوم اطباے دہلی کا مرتب کیا ہوا ہے یا اطباے لکھنؤ کا۔ لیکن اس پر
پورا پورا عمل جیسا اطباے لکھنؤ نے کیا اطباے دہلی نہین کرتے۔ پڑھائی وہان بھی
یہی کتابین جاتی ہین مگر دہلی مین طبیبون کا مطب ایک بڑی حد تک اُن کی مدونہ
طب سے الگ ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اُنھون نے ویدک کی دواؤن کے
اختیار کر لینے مین اسی قدر نہین کیا کہ اُن نئے اجزا کو اپنے مطب مین داخل کر لیا
بلکہ یہ بے احتیاطی بھی کی کہ اُن کے داخل کرنے مین اپنے قدیم مدونہ و مسلمہ اصول
خصوصاً مزاج کے مباحث سے چشم پوشی کر لی۔ اور اُن اجزا کو استعمال کرا دیتے
ہین جن کے مزاج اور افعال و خواص سے وہ پوری طرح واقف نہین ہین۔
وہان فی الحال سب سے بڑی شکایت یہ سُنی جاتی ہے کہ مدرسۂ طبیہ دہلی کے نصاب
مین تشریح کے علاوہ ڈاکٹری کے دیگر اصول بھی اس کثرت اور بے احتیاطی سے
اختیار کر لیے گئے ہین کہ اصلی فن طب بجاے ترقی کرنے کے بالکل مٹا جاتا ہے۔ یہی
بے احتیاطی اُنھون نے پہلے اصول ویدک کے اختیار کرنے مین کی تھی اور یہی اب
اصول ڈاکٹری کے لینے مین ہو رہی ہے۔ ایسی حالت مین دہلی مین ہمارے قدیم

فن طب کا جو انجام ہوتا نظر آتا ہے نہائیت خطرناک ہے۔

برخلاف اس کے لکھنؤ کے تمام طبی خاندانون خصوصاً حکیم یعقوب مرحوم کے خاندان اور تکمیل الطب مین اصلی اصول طبی کے قائم رکھنے اور اُنکو اُنھین کے دائرے مین رکھکے ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُن کے مطب اس وقت تک اپنے فن اور اپنی کتابون سے ذرا بھی جدا نھین ہین اور ایسی سلامت روی کے راستے پر جا رہے ہین۔ جس سے امید ہو سکتی ہے کہ شاید اسلامی طب دست برد زمانہ سے بچ جائے۔ اگرچہ اصلی خدمت فن سے یہ لوگ بھی ہنوز بہت دور ہین۔ طب کی روح علم دواسازی ہے جو ہمارے قدیم علم کیمیا کا ایک شعبہ ہے۔ اُسی فن پر یورپ کے موجودہ معجز نما فن کیمسٹری کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ اس فن مین مسلمان مصنفین سلف کی کتابین ابھی کلیۃً نھین مٹین بلکہ بہت سی باقی رہ گئی ہین۔ اساتذۂ طب کا کام ہے کہ بار بار اُن کا مطالعہ کرکے اُن کو سمجھین۔ انکو غور و خوض کرکے حل کرین۔ اور اُنھین نصاب تعلیم مین داخل کرین۔ پھر اُنکے اصول و ضوابط مین جدید تجربات سے فائدہ اُٹھاکے مجتہدانہ تصرف کرین۔ اور اپنے دواسازی کے فن کو باضابطہ بنالین۔ جس کے بغیر طب کے تمام کمالات اکثر اوقات بے نتیجہ اور غیر سودمند ثابت ہو جاتے ہین۔

مگر اس کمی کے ساتھ بھی لکھنؤ نے طب کو جیسی ترقی دی اور مضبوط بنایا وہ دہلی سے بہت زیادہ ہے۔ اور دنیا کے اور کسی حصے مین نھین ہے۔

(۱۵)

لیکن باوجود اس کے کہ علوم عربیہ کے بڑے بڑے علمائے گران پایہ لکھنؤ کی خاک سے پیدا ہوئے اس سے انکار نھین کیا جا سکتا کہ عربی کی تعلیم مقتدایان امت اور پیشوایان ملت تک محدود تھی۔ ہندوستان مین درباری زبان فارسی تھی۔ لیاقت حاصل کرنے اور مہذب و معزز صحبتون مین چمکنے کے لیے یہان فارسی کی تعلیم بخوبی کافی خیال کی جاتی تھی۔ اور وہ ہی نھین سارے ہندوستان مین ادبی و اخلاقی ترقی کا ذریعہ صرف فارسی قرار پا گئی تھی۔ مسلمان تو مسلمان اعلیٰ طبقے کے ہندوؤن کا عام رجحان فارسی ادب و انشا کی طرف تھا۔ یہان تک کہ اعلیٰ درجے کی

انشائین ہند و مصنفون ہی کے قلم سے مرتب و مدون ہوئی تھین۔ ٹیک چند بہار نے بہار عجم کی سی لاجواب کتاب تصنیف کر دی جو مصطلحات زبان فارسی کا ایک بے عدیل و نظیر ذخیرہ ہے۔ اور جس مین ہر محاورے کی سند مین اہل زبان کے بے شمار اشعار پیش کر دیے گئے ہین۔ لکھنؤ کے ابتدائی عروج مین ملا فائق کا اور پھر مرزا قتیل کا نام مشہور ہوا جو ایک نومسلم فارسی دان تھے۔ وہ خود تو مذاقاً کہا کرتے کہ "بوے کباب مرا مسلمان کرد" مگر سچ یہ ہے کہ فارسی کی تعلیم۔ اُسکے شوق۔ اور کمال فارسی دانی کی آرزو نے اُنھین مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا۔ انھون نے محض اسی شوق مین ایران کا سفر کیا۔ برسون شیراز و اصفہان اور طہران و آذربائجان کی خاک چھانی۔ اور ادب فارسی کے اس اعلیٰ کمال کو پہونچ گئے کہ خود اہل زبان بھی ایسے باکمال زباندان پر حسد کرین تو تعجب کی بات نہین ہے۔

مرزا غالب نے جابجا مرزا قتیل پر حملے کیے ہین۔ بے شک مرزا غالب کا مذاق فارسی نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ وہ اس اصول پر بار بار زور دیتے تھے کہ سوا اہل زبان کے کسی کا کلام سند نہین ہو سکتا۔ مگر اُن کے زمانے مین چونکہ اودھ سے بنگالے تک لوگ قتیل کے پیرو تھے اور بات بات پر قتیل کا نام لیا جاتا تھا اس لیے مرزا غالب کو اکثر طیش آ گیا۔ اور جب پیروان قتیل نے اُن کی خبر لینا شروع کی تو کہنے لگے۔

فیضے از صحبتِ قتیلم نیست	رشک بر شہرتِ قتیلم نیست
مگر آنانکہ فارسی دانند	ہم برین عہد و رائے پیمانند
کہ ز اہلِ زبان نبود قتیل	ہرگز از اصفہان نبود قتیل
لاجرم اعتماد را نسزد	گفتہ اش استناد را نسزد
کین زبان خاص اہلِ ایران ست	مشکلِ ما و سہل ایران است
سخنست آشکار و پنہان نیست	دہلی و لکھنؤ ز ایران نیست

مگر اس سے یہ نہین نکلتا کہ قتیل نے فارسی دانی مین جو کوششین کی تھین اور اس مین واقفیت و کمال حاصل کرنے مین جو زندگی صرف کی تھی وہ بالکل بیکار گئی۔ اس بات کے ماننے مین کسی کو عذر نہین ہو سکتا کہ قتیل کا کوئی دعوے جب تک

وہ اہل زبان کی سند نہ پیش کریں قابل تسلیم نہیں ہے۔ اور نہ خود قتیل کے ذہن میں کبھی یہ خیال گذرا ہوگا۔ لیکن اس کی خصوصیت قتیل ہی کے ساتھ نہیں۔ ہندوستان کا کوئی شخص بجائے خود سند نہیں ہو سکتا۔ خود مرزا نوشہ غالب بھی کوئی فارسی کا محاورہ بغیر اہل عجم کے ثبوت پیش کیے نہیں استعمال کر سکتے۔ ہندوستانی فارسی دانوں کا اگر کچھ وقار قائم ہو سکتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ کلام فارسی میں اُن کی نظر وسیع ہے اور ہر ہر لفظ کے صحیح محل استعمال سے واقف ہیں۔ اور اس حیثیت سے سچ پوچھیے تو غالب کے مقابلے میں قتیل کا پایہ بہت بلند تھا غالب زندگی بھر ہندوستان کی خاک چھانتے رہے۔ اور اسکے ساتھ طلب معاش میں سرگردان رہے۔ قتیل کو اطمینان کا زمانہ ملا تھا۔ اور مدتوں خاک پاک ایران میں رہ کے گانوں گانوں کی ٹھوکریں کھاتے پھرے تھے۔

بہر تقدیر لکھنؤ کی فارسی دانی کا آغاز قتیل سے ہوا۔ اور اُن سے کچھ پہلے مُلا فائق نے جن کا خاندان آگرے سے آکے مضافات لکھنؤ میں بس گیا تھا ادب و انشائے فارسی اور فارسی نظم و نثر میں اعلیٰ درجے کی بے نظیر کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی گو اور فارسی دان ہندوستان میں ان سے پہلے بھی گذرے تھے۔ مگر فارسی دانی کے ساتھ زبان فرس کے اصول و ضوابط اور اُس کی صرف و نحو کے مدوّن کرنے کا شوق پہلے پہل لکھنؤ ہی میں شروع ہوا۔ اور وہ اُنھیں کے قلم سے ظاہر ہوا۔ اُن کی کتابیں اگر سچ پوچھیے تو بیمثال و لاجواب ہیں۔

اس کے بعد فارسی یہاں کی عام تعلیم میں داخل رہی۔ اور نصاب فارسی ایسا بلیغ و دقیق رکھا گیا جو سچ یہ ہے کہ خود ایران کے نصاب سے زیادہ سخت تھا۔ ایران میں جیسا کہ ہر ملک کے لوگوں کا معمول ہے سیدھی سادی فصیح زبان جس میں صفائی کے ساتھ خیال آفرینی کی جائے پسند کی جاتی ہے۔ اور اُسی قسم کا نصاب بھی ہے۔ ہندوستان میں عرفی و فیضی اور ظہوری و نعمت خان عالی کے ایسے نازک خیال شعرا کا کلام داخل درس کیا گیا۔ ملا طغرا اور مصنف پنج رقعہ کے ایسے دقت پسندوں کا کلام پڑھا اور پڑھایا جانے لگا۔ جس سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی زبان دانی اس آخر عہد میں خود ایران سے بڑھ گئی تھی۔ اور یہیں کے لوگوں نے فارسی کی تمام درسی

کتابوں پر اعلیٰ درجے کی شرحین لکھ ڈالین تھین - اور اُسی کا یہ حیرت خیز نتیجہ ہے کہ جبکہ دنیا کی تمام زبانون کے شعرا اہل زبان ہی کے حلقے مین محدود رہتے ہین - اور غیراہل زبان مین اگر دو چار شاعر پیدا بھی ہو جاتے ہین تو اہل زبان مین اُن کا اعتبار نہین ہوتا - فارسی کے شعرا ایران سے زیادہ نہین تو ایران کے برابر ہی ہندو مین پیدا ہوے - خصوصاً گذشتہ صدی مین جبکہ ترقی و تعلیم کی دنیا مین لکھنو کا ڈنکا بج رہا تھا یہان کا بچہ بچہ فارسی گو تھا - جاہل زنڈیون اور بازاری مزدورون کی زبان پر فارسی کی غزلین تھین - اور بھانڈ تک فارسی کی نقلین کرتے تھے - قصبات اودھ کے تمام شرفا کا مہذب شغلہ اور ذریعۂ معاش فارسی پڑھانا تھا - اور ایسے اعلیٰ درجے کے دیہاتی فارسی مدرس لکھنو کی گلیون مین مارے مارے پھرتے تھے کہ اُن کی زبان دانی پر خود اہل عجم بھی عش عش کر جاتے - اُن کا لب ولہجہ اہل زبان کا سا نہ ہو مگر فارسی کے محاورون اور بندشون اور الفاظ کی تحقیق و تدقیق مین ان کو وہ درجہ حاصل تھا کہ معمولی اہل زبان کو بھی خطرے مین نہ لاتے تھے۔

لکھنو مین فارسی کا مذاق جس قدر بڑھا ہوا تھا اُس کا اندازہ لکھنو کی اُردو زبان سے ہو سکتا ہے - جہلا اور عورتون تک کی زبان پر فارسی کی ترکیبین بندشین اور اضافتین موجود ہین - اور لکھنو کی زبان پر حملہ کرنے والون کو اگر کوئی اعتراض اتنے دنون مین مل سکا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس مین فارسی اعتدال سے زیادہ بڑھ گئی ہے - لیکن اُس دَور کے معیار ترقی کے لحاظ سے یہی چیز لکھنو کی زبان کی خوبی اور اُس کی معاشرت کے زیادہ بلند ہو جانے کی دلیل تھی - خود دہلی مین زبان اُردو کی ترقی کے جتنے دَور قائم کیے جائین اُن مین بھی اگلے پچھلے دَور کا امتیاز صرف یہی ہو سکتا ہے کہ پہلے کے بہ نسبت بعد والے مین فارسی کا اثر زیادہ ہے -

مسلمانون کی طرح ہندو بھی فارسی مین نمود حاصل کر رہے تھے - اگرچہ یہ امر دولت مغلیہ کے ابتدائی عہد سے ظاہر ہونے لگا تھا - اُس وقت بھی بعض نامور و مستند فارسی دان اور فارسی گو موجود تھے مگر اودھ مین یہ مذاق انتہائی کمال کو پہونچ گیا تھا - چنانچہ جیسے باکمال فارسی دان ہند و سواد لکھنو مین موجود تھے کہین نہ تھے - کائستھون اور کشمیری پنڈتون نے تعلیم فارسی کو اپنے لیے لازمی قرار دے لیا

تھا۔ اور یہان تک ترقی کی کہ کشمیری پنڈتون کی تو مادری زبان ہی اُردو ہوگئی۔ اور اُن کی اور مسلمانون کی فارسی دانی مین بہت کم فرق تھا۔ کایستھ چونکہ یہین کے متوطن تھے اس لیے اُنکی زبان بھاشا رہی۔ مگر تعلیم فارسی کی کایستھون کے رگ و پے مین اس قدر سرایت کر گئی تھی کہ نہایت ہی بے اعتدالی اور بے ربطی کے ساتھ محاورات فارسی کو استعمال کرنے لگے۔ جو بات کہین کے ہندوون مین نہ تھی اُن دنون لوگ کایستھون کی زبان کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے۔ مگر سچ یہ ہے کہ بجاے مضحکہ اُڑانے کے اُن کی قدر کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ اُن کی زبان اُن کی علمی ترقی کی دلیل تھی۔ جس طرح آج کل انگریزی لفظون کے جا و بیجا استعمال کو انگریزی دان اپنی علمی ترقی کا ثبوت خیال کرتے اور نہایت بدتمیزی سے انگریزی الفاظ اپنی زبان مین بھرتے چلے جاتے ہین۔

لکھنؤ مین اُن دنون فارسی کے صدہا نثار اور شاعر موجود تھے۔ اور اُردو کی طرح برابر فارسی مشاعرون کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ فارسی شرفا ہی نہین عوام الناس تک کا شعار و وثار بن گئی تھی۔ اور اب باوجودیکہ فارسی درباری زبان نہین باقی رہی اور حکومت کی مسند پر اُردو زبان قابض و متصرف ہوگئی ہے مگر مہذب سوسائٹی پر آج تک فارسی کا سکہ جما ہوا ہے۔ اور عام خیال یہی ہے کہ فارسی مدارس و مکاتب سے نکل گئی اور تحصیل معاش کے لیے اسکی ضرورت نہین باقی رہی مگر انسان بغیر فارسی پڑھے مہذب سوسائٹی مین بیٹھنے کے قابل نہین ہو سکتا۔ اور نہ صحیح معنون مین انسان کامل بن سکتا ہے۔

انگلستان مین فرانس کی زبان کبھی درباری زبان تھی۔ اب اگرچہ مدت ہوئی کہ وہ دربار سے نکال دی گئی مگر معاشرت اور اخلاقی ترقی آج بھی وہان بغیر فرانسیسی زبان کے سیکھے نہین حاصل ہو سکتی۔ کھانے پینے۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ پہننے اوڑھنے۔ اور ہنسنے بولنے۔ غرض زندگی کے تمام اسلوبون پر فرانسیسی کی حکومت اب تک ویسی ہی موجود ہے۔ اور لڑکیان بغیر فرنچ زبان حاصل کیے شایستہ بیبیان نہین بن سکتین۔ یہی حال لکھنؤ کا ہے کہ فارسی دربار سے گئی۔ خط و کتابت سے گئی۔ مگر معاشرت کے تمام شعبون پر اب تک حکومت کر رہی ہے۔ اور بغیر فارسی

کی تعلیم پائے نہ ہمارا مذاق درست ہو سکتا ہے اور نہ ہمیں بات کہنے کا سلیقہ آسکتا ہے
مٹیا برج (کلکتہ) میں آخری محروم القسمت تاجدار اودھ کے ساتھ جو چند لوگ وہاں کے سکونت پذیر ہو گئے تھے اُن میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا جو فارسی نہ جانتا ہو۔ دفتر کی زبان فارسی تھی۔ اور ہندو مسلمانوں میں صدہا فارسی گو شاعر تھے عورتیں تک فارسی میں شعر کہتی تھیں۔ اور بچہ بچہ فارسی زبان میں اپنا مطلب ادا کر لیتا تھا۔

موجودہ لکھنؤ میں اگرچہ فارسی کی تعلیم بہت کم ہو گئی ہے اور ہندوؤں نے تو اُسے اس قدر چھوڑ دیا کہ وہ کایستھوں کی زبان ہی خواب و خیال ہو گئی جس کا زبان دانی کی صحبتوں میں مضحکہ اُڑایا جاتا تھا۔ اور بھانڈ تک اُس فارسی آمیز زبان کی نقلیں کرتے تھے مگر پھر بھی پُرانے بزرگوں اور خصوصاً مسلمانوں میں بہت کچھ فارسی کا مذاق موجود ہے۔ اس لیے کہ اُنکی اُردو دانی ہی ایک حد تک اُنکے لیے فارسی دانی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مسلمانوں میں اب تک خواجہ عزیز الدین صاحب کا ایسا محقق فارسی اگلی بزم سخن کے یاد دلانے کو پڑا ہوا ہے جو اپنے کمال کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں یکتا ہیں۔ اور پُرانے سن رسیدہ ہندوؤں میں بھی متعدد فارسی کے اسکالر ملیں گے جن کا ایک نمونہ سندیلہ کے راجہ دُرگا پرشاد صاحب ہیں۔ جن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ زمانہ بدل گیا زمین و آسمان بدل گئے۔ آب و ہوا بدل گئی۔ مگر وہ آج تک وہی ہیں۔ فارسی دانی کی داد دینے اور لینے کو موجود ہیں۔ اور اگلی تاریخ کے ایک کرم خوردہ ورق کی طرح چومنے چاٹنے اور آنکھوں سے لگانے کے قابل ہیں۔

(۱۶)

علوم ہی سے وابستہ کتابت اور تحریر کے فن ہیں۔ مسلمانوں کا پُرانا خط عربی تھا جس کو نسخ کہتے ہیں۔ خلافت بغداد کے ازمنۂ وسطےٰ تک ساری دنیاے اسلام میں مشرق سے مغرب تک یہی خط تھا جو ارض حیرہ کے پُرانے خط سے خط کوفی۔ اور خط کوفی سے خطِ نسخ بن گیا تھا۔ خاندان طاہریہ کے زمانے سے وہ تمام علم و فن جو بغداد میں رواج پا رہے تھے ایران و خراسان کی طرف آنے لگے۔ اور دیلمیوں اور سلجوقیوں کے زمانے

مین بغداد کے اکثر کمالات ایران مین بخوبی جمع ہو گئے ۔ خصوصًا دلیمیون کے علمی ذوق
اور تفنن طبع سے ایران کا مغربی صوبہ آذربایجان جو قدرۃً عراق عجم و عراق
عرب کے آغوش مین واقع تھا ۔ ہر قسم کی خوبیون اور ترقیون کا گہوارہ قرار پا گیا۔
اسی علاقے مین پہلے پہل خط نے بھی نئی وضع اختیار کرنا شروع کی۔ کتابت
خطاطی کی حدون سے نکل کے نقاشی کی قلمرو مین داخل ہو گئی - اور اُس مین مصورانہ
نزاکتین پیدا کی جانے لگین ۔ عجمی نزاکت پسندون کو خط عرب کی پُرانی سادگی مین
بھدا پن نظر آیا ۔ اور پُرانی شان اور وضع خود بخود چھوٹنے لگی ۔ نسخ مین قلم ہر حرف
اور لفظ مین اول سے آخر تک یکسان رہا کرتا تھا ۔ حرفون مین غیر موزون خمی اور
غیر متناسب ناہمواری ہوتی تھی ۔ دائرے گول نہ تھے بلکہ بیچے اور چپٹے ہوتے اور
اِدھر اُدھر اُن مین کونے پیدا ہو جاتے ۔ اب نقاشی کی نزاکت کو خطاطی مین ملا کے
تحریر مین نوک پلک پیدا کی جانے لگی ۔ حرفون کی نوکین ۔ گردنین ۔ اور دُمین
باریک بنائی جانے لگین ۔ دائرے خوبصورت اور گول لکھے جانے لگے ۔ اس جدید
مذاق کو پوری طرح پیش نظر رکھ کے سب سے پہلے میر علی تبریزی نے جو خاص تبریز کا
رہنے والا تھا ۔ اس نئے خط کو با اصول و با قاعدہ بنا کے مشرقی بلاد مین رواج
دیا ۔ اور اُس کا نام نستعلیق قرار دیا ۔ جو اصل مین نسخ تعلیق یعنی ضمیمہ نسخ تھا۔
نہین معلوم کہ میر علی تبریزی کس زمانے مین تھے ۔ منشی شمس الدین صاحب
آج لکھنؤ کے مشہور و مستند خوشنویس ہین اُن کا زمانہ تیمور سے پہلے بتاتے ہین ۔
لیکن نستعلیق کی کتابین اتنی پُرانی ملتی ہین کہ تیمور درکنار ہم سمجھتے ہین کہ اس خط
کی ایجاد محمود غزنوی سے بھی پہلے ہو چکی تھی ۔ اس مین شک نہین کہ محمود کے
آنے کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان مین فارسی خوش نویسون کی بھی آمد شروع
ہو گئی ہو گی ۔ جن کے اثر سے یہان اس خط کا رواج شروع ہوا ۔ اور ہندوستان
کے ہر صوبے اور ہر خطے مین نستعلیق کے خوش نویس کثرت سے پیدا ہو گئے ۔ لہذا یا تو
میر علی تبریزی کا زمانہ بہت قدیم ہے اور یا وہ اصلی موجد خط نہین ہین ۔ لیکن اس
مین شک نہین کہ دہلی و لکھنؤ بلکہ سارے ہندوستان کی موجودہ خوش نویسی اپنا
استاد اول میر علی تبریزی کو بتاتی ہے ۔ ان کے ایک مدت دراز کے بعد ایران

مین نستعلیق کی اُستادی مین میر عماد الحسنی کا نام مشہور رہا - جو خوشنویسون مین بڑے
ممتاز و نامور کاتب اور اُستاد الکل مانے جاتے ہین - اُن کے بھانجے آغا عبد الرشید دیلمی
نادرشاہ کے حملون کے زمانے مین وارد ہند ہوے اور لاہور مین آکے ٹھہر گئے - لاہور
مین اُن کے صدہا شاگرد پیدا ہوے - جنھون نے اقطاع ہند مین پھیل کے اُنھین
ہندوستان کی خوشنویسی کا آدم نہین تو نوح ضرور ثابت کر دیا -

اُنھین کے دو شاگرد جو ولایتی تھے وارد لکھنؤ ہوے - ان دونون بزرگون مین
سے ایک حافظ نور اللہ اور دوسرے قاضی نعمت اللہ تھے - کہا جاتا ہے کہ
عبد اللہ بیگ نام آغا عبد الرشید کے ایک تیسرے باکمال شاگرد بھی لکھنؤ مین آئے
تھے - ان حضرات کے آنے کا زمانہ غالباً نواب آصف الدولہ بہادر کا عہد تھا جب
یہان کوئی باکمال آکے واپس نہ جانے پاتا تھا - قاضی نعمت اللہ آتے ہی اس
خدمت پر مامور ہو گئے کہ شاہزادون کو اصلاح دیا کرین - اور حافظ نور اللہ کو بھی
دربار اودھ سے تعلق ہو گیا - اور ان دونون نے یہان ٹھہر کے لوگون کو خوش نویسی
کی تعلیم دینا شروع کی -

ان بزرگون کے علاوہ یہان اور پرانے خوش نویس بھی تھے - جن مین سے ایک
نامور بزرگ منشی محمد علی بتائے جاتے ہین - مگر آغا عبد الرشید کے شاگردون نے اپنا ایسا
سکہ جما لیا کہ خوشنویسی کے تمام شائق بلکہ سارا شہر اُن کی طرف رجوع ہو گیا
جسے خطاطی کا شوق ہوا اُنھین کا شاگرد ہو گیا - اور تمام خوشنویسان سلف کے
نام مٹ کے گمنامی کے ناپیدا کنار سمندر مین غرق ہو گئے - اور سچ یہ ہے کہ یہ بزرگ
اپنے کمال کے اعتبار سے اسکے مستحق بھی تھے -

حافظ نور اللہ کی لکھنؤ مین جو قدر ہوئی اُس کا اندازہ اسی سے نہین ہو سکتا
کہ وہ یہان سرکار مین ملازم ہو گئے تھے - بلکہ لکھنؤ کی قدردانی کا صحیح اندازہ اس
ہوتا ہے کہ لوگ اُنکے ہاتھ کے لکھے ہوے قطعون کو موتیون کے دامون مول لیتے
یہان تک کہ اُنکی معمولی مشق بازار مین صرف ایک روپیہ حرف کے حساب سے
ہاتھون ہاتھ بک جاتی تھی -

اُن دنون امرا اور شوقین لوگ اپنے مکانون کو بجائے تصویرون کے قطعات

سے آراستہ کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے علی العموم قطعوں کی بے انتہا مانگ تھی۔ اور جہان کسی اچھے خوش نویس کے ہاتھ کا قطعہ مل جاتا اُسپر لوگ پروانون کی طرح گرتے اور اُسے آنکھون سے لگاتے۔ اس سے سوسائٹی کو تو یہ فائدہ پہونچا کہ اکثر اخلاقی اصول اور ناصحانہ فقرے یا اشعار ہمیشہ پیش نظر رہتے۔ اور ہر وقت گھر مین اخلاقی سبق ملتا رہتا۔ اور خوش نویسی کو یہ فائدہ پہونچا کہ خوش نویسون اور صاحب کمال خطاطون نے اپنے کمال کو قطعہ نویسی ہی تک محدود کر دیا تھا۔ جو آبدار اور عمدہ وصلیون کو لکھ کے تیار کرتے۔ اور اسی مین وہ گھر بیٹھے دولتمند ہو جاتے۔ مگر افسوس اب ہندوستان سے قطعات اور کتبون کا رواج اُٹھتا جاتا ہے اور اُنکی جگہ تصویرون نے لے لی ہے۔ جس کی وجہ سے اگلے نفیس و مہذب شرعی مذاق آرایش کے مٹ جانے کے ساتھ خوش نویسی بھی ہندوستان سے اُٹھ گئی۔ اب کاتب مین خوش نویس نہین ہین۔ اور جو دو ایک خطاط مشہور بھی ہین وہ مجبور ہین کہ کاپی نویسی اور کتابت سے اپنا پیٹ پالین جو چیز کہ اصل مین خوشنویسی کی دشمن ہے۔ بخلاف اس کے اُن دنون ایک گروہ قائم ہو گیا تھا جس کا کام فقط یہ تھا کہ خوشنویسی کو اپنے اصول پر قائم رکھے اور اُس کو وقتاً فوقتاً مناسب ترقیان دیتا رہے۔ چنانچہ اگلے خوش نویس کتابت کو اپنی شان سے ادنیٰ سمجھتے تھے۔ اور خیال کرتے کہ جو شخص پوری پوری کتابین لکھے گا وہ غیر ممکن ہے کہ اول سے آخر تک اصول و قواعد خوش نویسی کو پوری طرح نباہ سکے۔ اور سچ یہ ہے کہ جتنی محنت اور مشقت وہ لوگ ایک ایک وصلی کی درستی مین کرتے تھے اُس کی عشر عشیر محنت بھی کاتب کسی پوری کتاب کے لکھنے مین نہین کر سکتے۔

اُن کی محنت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ نور اللہ سے ایک بار نواب سعادت علی خان نے فرمایش کی کہ "مجھے گلستان کا ایک نسخہ لکھ دیجیے"۔ نواب سعادت علی خان گلستان سعدی کے بجید شایق تھے۔ اور کہتے ہین کہ گلستان ہر وقت اُنکے سرہانے موجود رہا کرتی تھی۔ اور کوئی ایسی فرمایش کرتا تو حافظ نور اللہ اپنی توہین سمجھ کے اُس کا مُنہ ہی نوچ لیتے۔ مگر فرمان روائے وقت کا کہنا تھا منظور کر لیا۔ اور عرض کیا "تو مجھے اسّی گڈّی کاغذ (اُن دنون رِم کو گڈّی

سکتے تھے) ایک سو قلمتراش چاقو۔ اور خدا جانے کتنے ہزار قلموں کے تیزے منگوا دیجئے۔" سعادت علی خان نے حیرت سے پوچھا "فقط اکیلی ایک گلستان کے لیے اتنا سامان درکار ہوگا؟" کہا "جی ہاں میں اتنا ہی سامان خرچ کیا کرتا ہوں" نواب کے لیے اس سامان کا فراہم کرنا کچھ دشوار تو تھا نہیں۔ منگوا دیا۔ اب حافظ صاحب نے گلستان لکھنا شروع کی مگر پوری نہیں ہونے پائی تھی سات ہی باب لکھنے پائے تھے اور آٹھواں باب باقی تھا کہ انتقال ہوگیا۔ انکے بعد جب انکے بیٹے حافظ ابراہیم دربار میں پیش ہوے اور انھیں سیاہ خلعت تعزیت عطا ہوا تو سعادت علی خان نے کہا "بھئی میں نے حافظ صاحب سے گلستان لکھوائی تھی خدا جانے اُس کا کیا حال ہوا؟" حافظ ابراہیم نے عرض کیا۔ "انکے لکھے ہوے سات باب تیار ہیں۔ آٹھواں باب باقی ہے اُسے یہ حقیر لکھ دیگا اور اس قدر اُن کی شان سے ملا دے گا کہ حضور امتیاز نہ کر سکیں گے۔ لیکن ہاں اگر کسی مبصر خوش نویس نے دیکھا تو وہ بیشک پہچان لے گا" نواب نے اجازت دی اور اُس گلستان کو حافظ ابراہیم نے پورا کیا۔

حافظ نوراللہ کے شاگردوں میں زیادہ ممتاز سب سے اول تو خود انکے بیٹے حافظ ابراہیم تھے۔ دوسرے منشی سرب سکھ نام ایک ہندو بزرگ تھے جن کو کوئی کایستھ بتاتا ہے اور کوئی کشمیری پنڈت۔ اور تیسرے محمد عباس نام لکھنؤ کے ایک خوش نویس۔ حافظ ابراہیم نے بھی بہت نام پیدا کیا۔ سیکڑوں آدمیوں کو خوش نویس بنا دیا۔ اور فن میں مجتہدانہ مرتبہ پیدا کرکے اپنے والد سے جدا ایک شان پیدا کی۔ حافظ نوراللہ کے دائرے بالکل گول ہوتے تھے۔ حافظ ابراہیم نے اُن میں ایک خفیف سی بیضاویت اختیار کی۔ منشی سرب سکھ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اپنے اُستاد کی شان اس قدر اُڑا لی تھی کہ صدہا وصلیاں حافظ نوراللہ کے نام سے پھیلا دیں۔ اور بڑے بڑے خوش نویس بالکل تمیز نہیں کرسکتے تھے اور یہ اُن دنوں خوشنویسی کا بہت بڑا کمال تھا۔

حافظ ابراہیم کے ممتاز شاگردوں میں پہلے تو اُن کے فرزند حافظ سعیدالدین تھے۔ ان کے علاوہ منشی نظیر حمید۔ منشی عبدالمجید جو سرکار شاہی میں احکام شاہی

اور پرچہ وپیام (یعنی مراسلت فی مابین دولت انگلشیہ و دولت اودھ) لکھنے پر مامور تھے۔ مگر حافظ ابراہیم کے دو شاگردوں نے بہت ہی فروغ پایا جو اپنے زمانے میں سارے لکھنؤ کے اُستاد قرار پاگئے تھے۔ ایک تو منشی منسا رام کشمیری پنڈت جو اپنے فن کے بہت بڑے کامل تھے۔ اور دوسرے منشی محمد ہادی علی جو نستعلیق کے علاوہ نسخ اور طغرا نویسی میں بھی لکھنؤ میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔

اُدھر قاضی نعمت اللہ کے شاگرد ایک تو اُن کے فرزند مولوی محمد اشرف تھے اور دوسرے مولوی قل احمد۔

غرض نستعلیق کے یہی لوگ اُستاد تھے۔ جن سے لکھنؤ میں خوش نویسی کمال کو پہونچی۔ پھر مطبع جاری ہونے کے بعد کتابت وکاپی نویسی کو فروغ ہوا۔ اور در اصل یہ اسی خاندان کی برکت ہے کہ لکھنؤ میں ہزاروں مسلمان ہزاروں کالستھ جن سے نوستہ اور اشرف آباد کے محلے بھرے ہوئے ہیں اور سیکڑوں کشمیری پنڈت خوشنویس ہوگئے۔ مگر افسوس کشمیری پنڈتوں نے انگریزی تعلیم کے شوق میں اور خوشنویسی کی کساد بازاری دیکھ کے اس فن کو مطلقاً چھوڑ دیا۔ اور اب جتنے اچھے لکھنے والے ہیں سب مسلمان ہیں یا کایستھ۔

آخر زمانے میں سندیلہ کے ایک منشی عبدالحی بھی بڑے باکمال خوشنویس تھے۔ جن کے شاگرد منشی امیر اللہ تسلیم اُن کے بڑے بھائی منشی محمد عبداللطیف اور منشی اشرف علی وغیرہ تھے۔ فی الحال نستعلیق میں منشی شمس الدین صاحب اور نسخ میں منشی حامد علی صاحب کو شہرت ہے۔ اور یہ دونوں منشی ہادی علی صاحب کے شاگرد ہیں۔

ہندوستان میں خط نسخ جن باکمالوں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے اُن میں سب سے پہلے شخص یاقوت مستعصمی کے لقب سے مشہور ہیں جو یاقوت اول کہلاتے ہیں۔ ہمیں اس نام کا کوئی باکمال کاتب مستعصم باللہ کے عہد میں نہیں نظر آتا۔ کیا عجب کہ اس سے مراد عماد کاتب جوینی الملقب بہ "فخر الکتاب" المتوفی ۵۹۲ھ ہو۔ جس کی کتاب "خریدہ" مشہور ہے۔ اور جو پہلے ارض شام میں سلطان اتابک نورالدین زنگی کا اور اُس کے بعد مصر میں سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس

کا کاتب تھا۔ اس لیے کہ نسخ کا سب سے بڑا آخری خوشنویس وہی مانا جاتا ہے۔ اسکے بعد سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد مین محمد عارف نام خط نسخ کے ایک بڑے باکمال پیدا ہوے۔ جن کو یاقوت رقم ثانی کا خطاب دیا گیا۔ عموماً کہا جاتا ہو کہ اُنھون نے خط نسخ کی نئی شان ایجاد کی اور بہ مقابل سابق کے اُسے زیادہ خوبصورت بنا دیا۔ یہان تک کہ نسخ کے اساتذہ لکھنؤ دعوی کرتے ہین کہ اُنکے کمال کا ساری دنیاے اسلام نے اعتراف کرلیا۔ مین اس کے ماننے کے لیے تیار نہین ہون۔ یاقوت رقم ثانی کو ہندوستان مین چاہے جیسی فوقیت حاصل ہو گئی ہو مگر اُن ممالک مین جہان کا قومی خط خطِ نسخ اور قومی مادری زبان زبان عرب ہے لوگ یاقوت رقم کا نام بھی نہین جانتے۔ اور نہ اُن کی شان کے پیرو ہین۔

محمد عارف یاقوت رقم کے زمانے مین عبدالباقی نام ایک شخص تھے جن کا پیشہ حدادی یعنی لوہاری تھا۔ اُنھین یاقوت رقم کی مرجعیت عامہ دیکھ کے شوق ہوا کہ خود بھی اس فن مین کمال پیدا کرین۔ اتفاقاً عبداللہ طباخ نام نسخ کے ایک اور خوش نویس اُن دونون مشہور تھے۔ حداد جاکے اُن کے شاگرد ہوے۔ اور ایسی محنت کی کہ اُستاد کامل مشہور ہوگئے۔ جب ان دونون کا زمانہ گذر گیا تو یاقوت رقم کی جگہ اُن کے بھتیجے قاضی عصمت اللہ نے لی۔ اور حداد کی یادگار اُن کے دو فرزند علی اکبر اور علی اصغر تسلیم کیے گئے۔

اس کے بعد ہندوستان مین بڑے بڑے خوش نویس پیدا ہوے۔ اور برابر نسخ کی کتابت ہندوستان مین ترقی کرتی رہی۔ آخر مین شاہ غلام علی صاحب کو شہرت ہوئی جو نسخ کے باکمال خوش نویس تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ مین ایک طرف مولوی ہادی علی صاحب کی شہرت ہوئی جن کا خاندان دہلی سے آیا تھا۔ اور کاکوری کے ایک خوشنویس میر اکبر علی کے وہ شاگرد تھے۔ مولوی ہادی علی صاحب کو طغرا نگاری مین بڑا کمال حاصل تھا۔

منشی ہادی علی کے ہم عصر نسخ کے ایک مشہور خوش نویس میر بندہ علی مرتعش تھے اُنکے اُستاد نواب احمد علی نام ایک پُرانے وقت کے رئیس اور نسخ کے باکمال اُستاد تھے

میر بندہ علی کے ہاتھ مین رعشہ تھا۔ مگر قلم جیسے ہی کاغذ پر لگتا معلوم ہوتا کہ لوہے کا ہاتھ ہے۔ کیا مجال کہ قابو سے باہر ہو۔ اُن کی نظر خط کے پہچاننے مین ایسا کمال رکھتی تھی کہ بڑے بڑے لوگ لوہا مان گئے۔

منشی حامد علی صاحب فرماتے ہین ایک موقع پر منشی ہادی علی۔ منشی محمد یحییٰ (یہ بھی نسخ کے بڑے اُستاد تھے جنھون نے طبع ہونے کے لیے لکھنؤ مین پہلا قرآن لکھا) منشی عبدالحی سندیلوی۔ اور میر بندہ علی مرتعش ایک صحبت مین جمع تھے۔ یہ نسخ کے تمام باکمالون کی صحبت تھی۔ کسی نے ایک قطعۂ نسخ فروخت کے لیے لا کے پیش کیا۔ گو اُس مین کاتب کا نام نہین لکھا تھا مگر اُن باکمالون نے بالاتفاق پہچان لیا کہ خاص یاقوت کے ہاتھ کا ہے۔ اور سب کو شوق ہوا کہ اُسے اپنے قبضے مین کرین۔ مگر منشی ہادی علی صاحب نے کہا "یہ ایک دن میرے پاس رہے تو مجھے غور کرنے کے بعد اطمینان ہوگا کہ درحقیقت یہ یاقوت کے ہاتھ کا ہے یا نہین"۔ مالک نے دے دیا اور وہ اُسے گھر لائے۔ دوسرے دن لے جا کے پیش کیا۔ اور کہا "واقعی یہ یاقوت ہی کے ہاتھ کا ہے۔ اسی کے ساتھ کا یاقوت کا ایک قطعہ میرے پاس بھی پڑا ہوا تھا۔ مین نے اِسے لیجا کے اُس سے ملایا تو بعینہ وہی پایا۔ اور مجھے یقین آگیا کہ واقعی یاقوت کا ہے۔ اور دونون قطعے سب کے سامنے رکھ دیے۔ سب نے بلا تامل تسلیم کرلیا کہ دونون یاقوت ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوے ہین۔ مگر میر بندہ علی نے منشی ہادی علی والے قطعے کو غور سے دیکھا۔ پھر مسکرائے۔ اور اُس کے نیچے لکھ دیا "این کار از تو آید و مردان چنین کنند"۔ یہ تحریر دیکھ کے منشی عبدالحی صاحب بگڑے اور کہا "کیا آپ کو اس مین کچھ شک ہے؟" میر بندہ علی نے کہا "یہ قطعہ تو یاقوت کے ہاتھ کا نہین ہو سکتا"۔ منشی عبدالحی اور دیگر حریفان صحبت نے دعویٰ کیا کہ "یہ خاص یاقوت کے ہاتھ کا ہے"۔ میر بندہ علی نے اُس مین ایک واو کا سرا دکھایا اور کہا "یہ یاقوت کا نہین ہو سکتا"۔ اب سب لوگ گومگو مین پڑے ہوے تھے کہ منشی ہادی علی نے اُس وصلی کا ایک کونا پھاڑ کے کاغذ کی تہ کے اندر سے نکال کے اپنا نام دکھا دیا اور سب کو یقین آگیا کہ یہ کارستانی منشی ہادی علی صاحب کی تھی۔ سب نے

اُن کی بجد تعریف کی۔ اور اُنھوں نے کہا "مگر ہین تو میر بندہ علی صاحب کی نظر کا قائل ہو گیا۔"

خوش نویسون کے عام مذاق کے مطابق میر بندہ علی صاحب سے بھی قطعہ نویسی کے سوا کتابت غیر ممکن تھی۔ زندگی بھر کبھی کوئی چھوٹی کتاب بھی نہ لکھی گئی۔ حاجی حرمین شریفین نے جب مطبع جاری کیا تو بہزار منت و سماجت میر بندہ علی کو اس پر راضی کیا کہ انھیں ایک پنجسورہ لکھ دین۔ میر بندہ علی نے بڑی محنت سے اور خدا جانے کتنے دنون مین لکھا۔ اور دے گئے۔ مگر حاجی صاحب کے سامنے جب اُس پر آخری نظر ڈالی تو کچھ ایسا ناپسند ہوا کہ بجائے حاجی صاحب کے حوالے کرنے کے پھاڑ ڈالا۔ اور کہا "یہ بھی مجھ سے نہین ہو سکتا۔"

ان بزرگون کے تذکرے سے میرا یہ مقصد نہین ہے کہ خوش نویسی مین لکھنؤ کو کوئی ایسا امتیاز حاصل ہو گیا تھا جو ہندوستان مین عدیم النظیر ہو۔ بخلاف اسکے میرا خیال ہے کہ نسخ کے جیسے جیسے باکمال دولت مغلیہ سے پہلے ہندوستان مین گذر چکے ہین اُن کے عشر عشیر درجے کو بھی یہ لوگ نہین پا سکتے۔ بلکہ نسخ کا کمال ان دنون مٹ چکا تھا۔ نستعلیق کے متعلق اس قدر البتہ کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نور اللہ اور حافظ ابراہیم کے ہاتھ کے قطعات جس ذوق و شوق سے سارے ہندوستان مین مقبول ہوے اور کسی خوش نویس کے شاید نہ ہو سکے ہونگے۔ لیکن اس پر بھی خطاطی کے فن مین لکھنؤ کا درجہ قریب قریب وہی تھا جو دیگر متمدن شہرون کا ہو سکتا ہے۔

مگر لکھنؤ کی خوشنویسی نے مطبع کی ترقی مین جو کام کیا شاید کہین کی خوشنویسی نہ کر سکی ہوگی۔ مجھے اس کی تحقیق نہین ہے کہ ہندوستان مین سب سے پہلے مطبع کہان سے جاری ہوا۔ کلکتے مین اُردو لٹریچر کی ترقی اور نیز عام مشرقی علوم کی تقویت مین بہت کچھ اہتمام کیا گیا۔ مگر وہان ٹائپ کے سوا پتھر کے چھاپے کی پُرانی کتابین مین نے نہین دیکھین۔

لکھنؤ مین بہ عہد غازی الدین حیدر (۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۴ء تا ۱۲۴۳ھ محمدی مطابق ۱۸۲۷ء) آرچر نامی ایک یوروپین نے آکے لوگون کو مطبع کا خیال دلایا۔ اور

جب اہل علم مشتاق ہوے تو اُس نے پہلا مطبع لکھنؤ مین کھولا۔ اس نے پریس اور تمام سامان یہین تیار کرا کے چھاپنا شروع کیا۔ اور زاد المعاد۔ ہفت قلزم اور تاج اللغات (جو بہت سی جلدون مین تھی) چھاپ کے پبلک کے سامنے پیش کین۔ اس سے سیکھ کے اور لوگون نے بھی مطبع جاری کرنا شروع کیے۔ جن مین سب سے پہلا مطبع غالباً حاجی حرمین شریفین کا تھا۔ اُنھین دنون مصطفےٰ خان شیشہ آلات کے ایک دولتمند تاجر کچھ چھاپنے کے لیے حاجی حرمین کے پاس لے گئے اور حاجی صاحب کی زبان سے کوئی ایسا سخت کلمہ نکل گیا کہ مصطفےٰ خان نے گھر آ کے خود اپنا مصطفائی مطبع جاری کر دیا۔ جسے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ تھوڑے دنون بعد علی بخش خان نے علوی مطبع جاری کیا۔ اور لکھنؤ مین کثرت سے چھاپے خانے کھلنے لگے۔

ابتدائے طبع کا کام یہان تاجرانہ اصول پر نہین بلکہ شوقینی کی شان سے جاری ہوا۔ عمدہ سے عمدہ آروی کاغذ لگایا جاتا جو پتھر کے چھاپے کے لیے نہایت ہی موزون تھا۔ بڑے بڑے خوشنویسون کو مجبور کر کے اور بڑی بڑی تنخواہین دے کے اُن سے کتابت کا کام لیا جاتا۔ اور بغیر اس کے کہ کارگزاری کی کچھ بھی شرط ہو یا اس کا ذرا بھی خیال کیا جاتا ہو کہ وہ دن بھر مین کتنا لکھتے ہین۔ یا لکھتے بھی ہین یا نہین۔ اُن کی خاطر داشت کی جاتی۔ اسی طرح پریس مینون سے بھی نہ پوچھا جاتا کہ دن بھر مین کتنے کاغذ چھاپے۔ روشنائی کے لیے کڑوے تیل کے ہزارون چراغ روشن کر کے اول درجے کا کاجل تیار کیا جاتا۔ کھٹائی کے عوض لیمون کاغذی صرف ہوتے اور کپڑے کی جگہ اصلی اسفنج کام مین لایا جاتا۔ غرض ہر چیز اول درجے کی کام مین لائی جاتی۔ اس اہتمام کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہی کے زمانے مین فارسی و عربی کی درسی و دینی کتابین جیسی لکھنؤ مین چھپ کے تیار ہوئین اہل بصیرت کے نزدیک کہین نہ چھپ سکی ہون گی۔ اُسوقت کی چھپی ہوئی کتابین جس کسی کے پاس موجود ہین ایک دولت ہین اور لوگ ڈھونڈھتے ہین اور نہین پاتے۔

میرے والد کے حقیقی چچا مولوی احمد صاحب کو سفر اور تجارت کا بڑا شوق تھا اور اُس زمانے مین جبکہ لوگ گھر سے باہر قدم نکالتے ڈرتے تھے اُنھون نے حاجی

حرمین شریفین کے ایجنٹ کی حیثیت سے رتھوں اور ریل گاڑیوں پر سوار ہو کے اور ہزاروں کتابیں ساتھ لے کے لکھنؤ سے راولپنڈی تک سفر کیا تھا۔ اُن کا بیان تھا کہ کتابیں اُن دنوں عنقا تھیں۔ یہاں کی مطبوعہ کتابوں کو دیکھ کے لوگوں کی آنکھیں کھُل جاتی تھیں اور پروانہ وار گرتے تھے۔ لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ ہم جس شہر یا گاؤں میں پہونچے ہم سے پہلے ہماری خبر پہونچ چکتی۔ اور ہمارا داخلہ عجب شان و شوکت سے ہوتا۔ ادھر ہم کسی بستی میں پہونچے اُدھر خلقت نے گھیر لیا بھیڑ لگ جاتی تھی۔ اور ہم جس کتاب کو جس قیمت پر دیتے لوگ بلے عذر لے کے آنکھوں سے لگاتے۔ ہم کریما۔ ماقیمان وغیرہ کو فی جلد ۶؍ یا ۸؍ کے حساب سے اور گلستان بوستان کو فی جلد تین روپیہ یا چار روپیہ کے نرخ سے بیچتے۔ اور اُس پر یہ حال تھا کہ ہم مانگ کو پورا نہ کر سکتے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہونچتے پہونچتے کتابوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور نئے مال کے انتظار میں مہینوں ٹھہر جانا پڑتا اُن دنوں مال کا پہونچنا دشوار تھا۔ مگر ہم نے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ برابر مال لکھنؤ سے آتا رہتا۔

شاہی کے آخر دور میں مصطفائی مطبع اپنی چھپائی کے لحاظ سے دنیا میں جواب نہ رکھتا تھا۔ انتزاع سلطنت کے بعد منشی نول کشور نے اپنا مطبع جاری کیا۔ گو وہ چھپائی کی خوبی میں مصطفائی مطبع کا مقابلہ نہیں کر سکا مگر تجارت کے اصول پر چل کے اُس نے فارسی و عربی کی اتنی اتنی بڑی ضخیم کتابیں چھاپ دیں کہ آج کسی مطبع کو اُن کے طبع کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ سچ یہ ہے کہ لکھنؤ میں اگلی شوقینی نے پریس کا ایسا مکمل سامان جمع کر رکھا تھا کہ اُس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے منشی نول کشور ہی کے لیسے بلند حوصلہ صاحب مطبع کی ضرورت تھی۔ آخر نول کشور پریس نے یہاں تک عروج پایا کہ سارے مشرقی لٹریچر کو اُس نے زندہ کر دیا۔ اور باعتبار وسعت طبع کے جو فوقیت لکھنؤ کو حاصل ہو گئی اور کسی شہر کو نہیں نصیب ہو سکتی۔ اور اسی کی برکت تھی کہ وسطِ ایشیا میں کاشغر و بخارا تک اور افغانستان و ایران کی ساری علمی مانگ لکھنؤ ہی پوری کر رہا تھا۔ چنانچہ آج تک نول کشور پریس علمی تجارت کی کنجی ہے جس سے کام لیے بغیر کوئی شخص علمی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

مگر افسوس اب لکھنؤ مین باوجود کثرت مطابع کے چھپائی کی حالت ایسی خراب ہو رہی ہے اور روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے کہ دوسرے شہر اُس پر فوقیت لے گئے ہین۔ اور ہماری نظر مین پریسمنون کی اخلاقی حالت خراب ہونے کی وجہ سے اب لکھنؤ مین اکثر شہرون کے مقابلے مین خراب چھپتا ہے۔ مگر ہمارے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے کہ کانپور مین منشی رحمت اللہ صاحب کی وجہ سے مطابع کی حالت اچھی ہے۔ اور کانپور دراصل لکھنؤ ہی ترقیون کا ایک ضمیمہ ہے۔

مطبع ہی کے ساتھ لکھنؤ مین مصلح سنگی کا فن ایجاد ہوا۔ پتھر پر جو کاپی جمائی جاتی ہے اُسے کسی حد تک چھیل کے اور قلم لگا کے درست کرنا غالباً یورپ ہی سے شروع ہوا ہوگا اور وہان اب بھی کیا عجب کہ اصلاح کا یہ عمل جاری ہو۔ مگر نسخ نستعلیق کے حرفون کو اس وضع سے درست کرنا کہ خوش نویس کی پوری شان باقی رہے اور کسی کو محسوس نہ ہو سکے کہ اس مین کسی اور کا بھی قلم لگا ہے خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ جہان ابتداءً یہ فن تو اسی حد پر محدود تھا کہ حروف اور نقش و نگار جا بے جس قدر اُڑ گئے یا کچل کے پھیل گئے ہون اُن کو درست کر دیا جائے۔ مگر چند روز بعد یہان کی جدت پسندی اس حد سے آگے بڑھی۔ اور ایسے باکمال مصلح سنگ پیدا ہونے لگے جو پتھر پر پوری پوری کتابین اُلٹی لکھ دیتے ہین اور خط اپنی حد و دپر اس قدر مکمل رہتا ہے کہ مجال کیا جو کوئی پہچان سکے کہ یہ پتھر پر اُلٹا لکھا گیا ہے ابتداءً اسکے صاحب کمال موجد ایک پرانے بزرگ تھے جو مصطفائی مطبع کی شہرت و ناموری کے باعث ہوے۔ اُن کے زمانے ہی مین اُن کے شاگردون کی کثرت نے یہان کے مطابع کو فائدہ پہونچایا۔ بہت سے لوگون نے ترقی کی۔ اور شہر سے مصلح سنگ بہم پہونچانے لگا۔ جب مصلح سنگی بہت عام ہو گئی تو منشی جعفر حسین نام ایک مشہور مصلح سنگ کو اُنکی اعلیٰ مشاقی نے آمادہ کیا کہ مطبع کو کاپی نویسی سے بے پروا کر دین۔ اُنھون نے پتھر پر اُلٹا لکھنا شروع کیا۔ یہ کام ابتداءً چھوٹے چھوٹے بازاری مطابع سے شروع ہوا۔ اور آخر مین اعلیٰ وادنیٰ سب مطبعون مین ایک حد تک اختیار کر لیا گیا۔ اب منشی سید علی حسین صاحب نے اس حد تک ترقی کی کہ اُن کے اُلٹے لکھے ہوے خط کو بہت سے مشہور خوش نویس بھی نہین پا سکتے۔ چنانچہ اُنکی

اُلٹی کتابت کا ایک معمولی نمونہ ہمارا دلگداز بھی ہے۔ جس کی کاپیان نہین لکھی جاتین بلکہ منشی علی حسین صاحب مضامین کو پتھر پر اُلٹا لکھ دیا کرتے ہین۔ ناظرین دلگداز کو پڑھ کے اور اسکے خط پر غور کرکے اندازہ فرما سکتے ہین کہ مصلح سنگی کا فن لکھنؤ مین کس درجۂ کمال کو پہونچ گیا ہے۔ گو کہ ہندوستان کے اکثر شہرون مین مصلح سنگ لکھنؤ ہی کے ہین لیکن اس وقت تک کسی اور شہر کے مطابع کو یہ بات نہین نصیب ہوئی کہ کاپیان جمانے کی عوض عبارت پتھرون پر اُلٹی لکھوا کے چھاپین۔ یہ فن آج تک لکھنؤ ہی تک محدود ہے۔ مگر افسوس پیشون کی حالت خراب ہو جانے کے باعث لکھنؤ مصلح سنگی کے اس کمال سے اس قدر فائدہ نہین اُٹھا سکتا جس قدر کہ ہونا چاہیے۔

(۱۷)

ابھی ہمین لکھنؤ کی بہت سی خصوصیتین بیان کرنی ہین جن کو زیادہ تر تعلق اخلاقی چیزون اور معاشرت کے امور سے ہے۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر کچھ کیفیت فنون جنگ کی بھی بیان کر دین۔

سچ یہ ہے کہ یہ آخری دربار مشرق اُس وقت قائم ہوا جب مسلمانون اور علی العموم ہندوستانیون کی سپہ گری کمزور پڑ چلی تھی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ پُرانی سپہگری کے فنون اتنے نہین مٹے تھے جس قدر کہ پُرانے فنون اور آلات جنگ نئے قواعد جنگ اور جدید آلات حرب کے مقابلے مین بیکار ہو گئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پُرانے فنون جنگ بجائے اسکے کہ مسلمانون یا اہل ہند سے نکل کے کسی نئی ترقی یافتہ بہادر قوم مین عروج پاتے دنیا ہی سے مٹ گئے۔ اور ایسے مٹے کہ موجودہ نسل اپنے آبا و اجداد کے شجاعانہ کارنامون اور اُنکے سپہگرانہ کامون سے بالکل ناآشنا ہے۔ اور آج جو اُن فنون کے تذکرے کے لیے ہم نے قلم اُٹھایا ہے تو کوئی ایسا شخص بھی نہین ملتا جس سے کچھ حالات معلوم ہون۔ ہم شاہزادہ مرزا مسعود قدر بہادر بی۔اے۔ اور لکھنؤ کے ایک بہت قدیم بزرگ سلیمان خان صاحب (جو حافظ رحمت خان صاحب قدیم نامور فرمانبردار بریلی کی نسل سے ہین) نہایت شکر گذار ہین کہ ان قدیم فنون جنگ کے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہین اُنھین کی مدد سے لکھ رہے ہین۔

سپہگری کے جن فنون کا نشو و نما دہلی میں اور دہلی کے بعد لکھنؤ میں ہوا وہ دراصل تین مختلف قوموں سے نکلے تھے اور تینوں کے امتزاج سے اُن میں مناسب ترقیاں ہوئی تھیں۔ اور حیرت کی یہ بات ہے کہ باوجود میل جول کے اُن میں آخر تک اصلی امتیاز باقی تھا۔ بعض فن آریہ قوم کے سپہگروں سے نکلے تھے۔ بعض کو ترک اور بہادران تاتار اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور بعض خاص عربوں کے فن تھے جو ایران میں ہوتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ لکھنؤ میں جن فنون کا رواج تھا اور جن کے باکمال اُستاد یہاں موجود تھے وہ حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں:

(۱) لکڑی۔ (۲) پٹہ ہلانا۔ (۳) بانک۔ (۴) بنوٹ۔ (۵) کشتی۔ (۶) برچھا (۷) بانا۔ (۸) تیراندازی۔ (۹) کٹار۔ (۱۰) جل بانک۔

(۱) لکڑی

یہ اصلی فن جسے پھنکیتی کہتے ہیں آریہ لوگوں کا تھا۔ جو ہندوستانی اور ایرانی دونوں ملکوں کے آریوں میں مروج تھا۔ عربی فتوحات کے بعد ایران کی پھنکیتی پر عربی جنگجوئی کا اثر پڑ گیا۔ اور وہاں کی پھنکیتی بمقابل ہندوستان کے زیادہ ترقی کر گئی۔ ہندوستان میں آخر تک یہ دونوں فن اپنی ممتاز وضعوں میں باقی رہے اور لکھنؤ میں دونوں اسکول قائم تھے۔ ایران کی عربی آمیز پھنکیتی یہاں علی مد کے نام سے مشہور تھی۔ اور خالص ہندی پھنکیتی رستم خانی کے لقب سے یاد کی جاتی۔ علی مد میں پھنکیت کا بایاں قدم ایک مقام پر جما رہتا اور صرف داہنے پاؤں کو آگے پیچھے ہٹا کے پینترے بدلے جاتے۔ برخلاف اس کے رستم خانی میں پھنکیت پینترے بدلتے وقت داہنے بائیں اور آگے پیچھے جس قدر چاہتا جگہ پاتا ہٹتا بڑھتا اور ناگہاں حریف پر آپڑتا۔ ایک یہ امتیاز بھی تھا کہ علی مد کا فن خاص رئیسوں اور شریفوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ اُس کے اُستاد کبھی کسی رذیل یا ادنیٰ طبقے کے آدمی کو اپنا شاگرد نہ بناتے اور نہ اپنے فن سے واقف ہونے دیتے۔ بخلاف اسکے رستم خانی کا فن اجلاف اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں میں عام تھا۔

علی مد کے ایک زبردست اُستاد فیض آباد میں شجاع الدولہ بہادر اور اُن کے بعد اُن کی بیوہ بہو بیگم صاحبہ کی سرکار سے وابستہ تھے۔ اُن کا ذکر تاریخ فیض آباد

میں ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کے سب سے پہلے اُستاد وہی تھے جو فیض آباد میں رہے۔ اور پھر وارد لکھنؤ ہوئے۔ دوسرے اُستاد اسی فن کے محمد علی خان تھے جو خاص ہمارے محلے کٹرہ بزن بیگ خان میں رہتے تھے۔ اور علی مد کے موجد مانے جاتے۔ تیسرے اُستاد میر نجم الدین تھے جو شاہزادگان دہلی کے ساتھ پہلے بنارس میں گئے اور پھر وہاں سے لکھنؤ میں آئے۔ اُن کا معمول تھا کہ صرف شریفوں کو شاگرد کرتے۔ اور شاگرد کرتے وقت شاہزادوں سے دولت اور شریفوں سے صرف مٹھائی لیتے۔ اور اُسے بجائے اس کے کہ اپنے کام میں لائیں خود لیجا کے سادات بنی فاطمہ کی نذر کردیتے۔ یہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں تھے۔ ایک بہت بڑے اُستاد میر عطا حسین تھے۔ جو حکیم مہدی کے مخصوصین میں تھے۔ ایک بہت بڑے اُستاد پٹے باز خان تھے جو اپنے کمال کے باعث غازی الدین حیدر کے زمانے میں علی مد کے موجد و بانی مشہور ہو گئے۔ اُن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ نو مسلم تھے۔ مگر وضع اُنکی بھی یہی تھی کہ سوا شریفوں کے اپنا فن کبھی کسی ادنیٰ طبقے کے آدمی کو نہیں بتایا۔ اُنھوں نے لکھنؤ میں اپنی یادگار ایک مسجد چھوڑی ہے جو دھنیا مہری کے پل سے آگے عالم نگر کے قریب آج تک موجود ہے۔

رستم خانی عوام میں رہی۔ اور اسی وجہ سے اس کو کوئی خصوصیت ہندو یا مسلمان کے ساتھ نہیں رہی۔ بلکہ اُسکے صدہا اُستاد اودھ کے تمام گاؤں اور قصبوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ تاہم لکھنؤ میں یحییٰ خان بن محمد صدیق خان نے جو کمال اور ناموری رستم خانی میں حاصل کی کسی کو نہ نصیب ہو سکی۔ نواب فتحیاب خان عالی مرتبہ رئیسوں میں ہونے کے باوجود بڑے خوش نویس بھی تھے۔ اور انھوں نے رستم خانی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اسی طرح لکھنؤ کے ایک مشہور بانکے پہلوان میر لنگر باز بھی رستم خانی کے اُستاد تھے۔ اور اب تک تھوڑا بہت رواج باقی ہے تو ادنیٰ لوگوں میں۔ علی مد کا فن شرفا کے ساتھ مخصوص تھا اور شرفا کو سپہگری سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ لہذا وہ فن بھی مٹ گیا۔ رستم خانی ادنیٰ لوگوں میں تھی اور وہ لوگ آج بھی لڑنے بھڑنے رہتے ہیں لہذا اُن میں رستم خانی کا رواج آج تک موجود ہے۔

علی مدکے دو ایک اُستادوں نے ٹیا برج میں دیکھے تھے۔ اور سب کے آخر میں میر تفضل علی تھے جو محلہ محمود نگر میں رہتے تھے۔

(۲) پٹہ ہلانا

اس فن کی اصلی غرض یہ تھی کہ انسان دشمنوں کے نرغے میں پڑ جائے تو لکڑی کے ہاتھ چاروں طرف پھینکتا ہوا سب کو ہٹا کے۔ سب سے بچ کے۔ اور سب کو مارتا ہوا نکل جائے۔ پیٹے کو ٹیک کے اُڑنا اس فن کا خاص کمال تھا اور سب سے بڑی تعریف اس بات کی تھی کہ انسان پر ایک ساتھ دس تیر بھی آ کے پڑیں تو اُن کو کاٹ دے۔ یہ فن دہلی میں تھا۔ لکھنؤ میں پورب سے آیا۔ اور جلاہوں میں زیادہ مروج تھا۔ اگرچہ آخر میں بہت سے شرفانے بھی خصوصاً قصبات کے شیخ زادوں نے اختیار کر لیا۔ غلام رسول خاں کا بیٹا گوری سپٹے باز لکھنؤ میں اس فن کا سب سے بڑا باکمال مانا جاتا تھا۔ جسکے صدہا واقعات عوام میں مشہور رہتے۔ مگر افسوس اب یہ افسانے بھی موجودہ نسل کو بھولتے جاتے ہیں۔

میر رستم علی کے سینے میں دونوں طرف باڑھ ہوتی اور اُسے ہلاتے ہوئے سیکڑوں حریفوں کو چیر کے نکل جاتے۔ آسیون کے ایک شیخ زادے شیخ محمد حسین دونوں ہاتھوں سے پٹہ ہلاتے۔ چنانچہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں ایک دن صاحب رزیڈنٹ بہادر اور بعض یوروپین مہمانوں نے اس فن کے کسی صاحبِ کمال کا کمال دیکھنا چاہا۔ شیخ محمد حسین آموجود ہوئے۔ چونکہ اُس وقت پٹہ اُنکے پاس نہ تھا شاہی اسلحہ خانے سے ایک پرتکلف مرصع و مکلل پٹہ دیا گیا۔ جسے لے کے اُنھوں نے ایسے ایسے کمالات دکھائے کہ ہر طرف سے تحسین کے نعرے بلند ہوئے۔ اور وہ اسی تحسین و مرحبا کے جوش میں پٹہ ہلاتے ہوئے مجمع سے نکل کے چلے گئے۔ اور اپنے گھر پہونچے۔ اہل فن میں مشہور تھا کہ جو شخص پٹہ ہلانا جانتا ہے وہ دس تلوار والوں کو بھی پاس نہ پہونچنے دے گا۔

اسی فن کے ایک صاحب کمال لکھنؤ میں میر ولایت علی ڈنڈا توڑ تھے۔ انکی نسبت شہرت تھی کہ حریف کے ہاتھ میں کتنا ہی زبردست ڈنڈا ہو اُسے توڑ ڈالتے۔

(۳) بانک

فنون جنگ مین یہ بہت ہی اہم اور نہایت بکار آمد فن تھا - اور اصولاً دوسرے فنون پر فوقیت رکھتا تھا - اور شریف زادے خاص کوشش اور خاص شوق سے اس فن کو سیکھتے - اصلی غرض اس فن کی چھریون سے حریف کا مقابلہ کرنا ہے - یہ فن قدیم الایام سے ہندوؤن مین بھی تھا اور عربون مین بھی - مگر چھریان دونون کی جدا گانہ ہوتی تھین - ہندوؤن کی چھری سیدھی ہوتی جس پہ دونون طرف باڑھ ہوتی - اور عربون کی چھری خمدار خنجر نما ہوتی جس پر ایک ہی طرف باڑھ ہوتی - مگر عربون کی آخری چھری جنبیہ ہے جس کی نوک سے کچھ دُور تک چارون طرف چار باڑھین ہوتی ہین - اور اُس سے ایسا چوپھانکا زخم پڑتا ہے کہ کہتے ہین کہ اس مین ٹانکا لگانا مشکل ہوتا ہے - غرض اس حربے سے لڑنے کے فن کا نام بانک ہے اس کی تعلیم یون ہوتی ہے کہ اُستاد شاگرد دونون آمنے سامنے دوزانو بیٹھتے ہین - مگر ہندوون والی سیدھی چھُری کی تعلیم مین قاعدہ تھا کہ دونون مقابل دوزانو بیٹھنے کے ساتھ ایک گھٹنا کھڑا رکھتے - اور عربون والی چھری کی تعلیم مین بالکل دوزانو بیٹھتے تھے - اور چوٹون کے ساتھ بڑے زبردست پیچ ہوتے جن کے آگے کُشتی کے پیچون کی کچھ حقیقت نہ تھی - یہ فرق بھی بتایا جاتا ہے کہ عربون کے فن مین اصلی سات چوٹین تھین اور ہندوون کے فن مین نو - عربون کی بانک مین پیچ پورا بندھ جاتا تو حریف کو زندہ چھوڑنا باندھنے والے کے اختیار سے باہر ہو جاتا - اور ہندوستان والون کے فن مین آخر تک اختیار مین رہتا کہ جب چاہین پیچ کھول کے حریف کو بچا دین -

اس فن مین صرف چوٹین ہی نہین ہین بلکہ بڑے بڑے زبردست پیچ ہین، جن مین دونون حریف گھُتھے رہتے - اور پے در پے پیچ کر کے ایک دوسرے کے باندھ کے زخمی کر دینے کی کوشش کرتے - اس فن کے پیچ اس قدر سچے اور علمی اور اصول کے ساتھ تھے کہ کہا جاتا کشتی اور لکڑی کے تمام پیچ بانک ہی سے نکلے ہین، بانک کے اُستادون مین مشہور تھا کہ بانک لیٹ کے پوری ہوتی ہے - بیٹھ کے آدھی رہتی اور کھڑے ہو کے صرف چوتھائی رہ جاتی ہے - یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ

بنکیت کا کام صرف یہ ہے کہ حریف کو چھُری سے زخمی کر دے۔ نہین۔ اُس کا اصلی کام یہ ہے کہ حریف کو زندہ باندھ لے۔ اور بے بس کر کے گرفتار کر لائے۔

ایک یہ خاص بات بھی تھی کہ بانک والا اپنے فن کو حتی الامکان مخفی رکھتا۔ اُس کی وضع قطع اور طور طریق کسی بات سے نہ پہچانا جاتا کہ وہ سپہگر ہے بنکیت عام ثقہ شریفون کی وضع رکھتے۔ کفشین پہنتے۔ کوئی ہتھیار نہ باندھتے۔ حتیٰ کہ اُن مین لوہے کے قلمتراش یا سوئی تک کے پاس رکھنے کی قسم تھی۔ صرف ایک رومال رکھتے۔ اور اُس کے ایک کونے مین ایک لوہے کا چھلا بندھا رہتا۔ بس یہی حربہ ضرورت کے وقت اُنھین کام دے جاتا۔ یا اس سے بھی زیادہ تہذیب برتتے تو ہاتھ مین تسبیح رکھتے۔ اور اُس مین لوہے کا بھدّا سا قبلہ نما لگا ہوتا۔ بس یہی حربہ اُن کے لیے کافی تھا۔

ہندوون مین قدیم الایام سے یہ فن خاص برہمنون مین تھا۔ راجپوت نہین جانتے تھے۔ نہ برہمن اُنھین سکھاتے اور نہ وہ اپنی وضع کے خلاف تصور کر کے اس کے سیکھنے کی کوشش کرتے۔ جس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ بنکیت ہونے کے لیے ثقاہت شرط تھی۔ اور راجپوت کھلے سپاہی تھے۔ برہمن بنکیت قبلہ نما یا لوہے کے چھلے کے عوض ایک کنجی رکھتے جو جنیو مین بندھی رہتی۔ اور اُسی سے کام لے کے نہایت ہی تہذیب و متانت کے ساتھ دشمن کا کام تمام کر دیتے۔ شاہزادہ مرزا ہمایون قدر بہادر فرماتے ہین کہ لکھنؤ مین یہ فن شاہ عالم کے زمانے مین اُس وقت آیا جب مرزا خرم بخت بہادر بنارس آئے اور اس فن کے دو ایک باکمال اپنے ساتھ لائے۔ لیکن ہمین معتبر ذریعے سے اور تاریخ فیض آباد کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس فن کے باکمال منصور علی خان بنکیت او شجاع الدولہ ہی کے زمانے مین فیض آباد مین آ گئے تھے۔

نواب آصف الدولہ کے عہد مین بانک کے اُستاد لکھنؤ مین شیخ نجم الدین تھے اُسی قریب زمانے مین بانک کے ایک دوسرے اُستاد لکھنؤ مین موجود تھے جو میر بہادر علی کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کو دعوے تھا کہ پلنگ کے نیچے جنگلی کبوتر

چھوڑ دیجیے۔ اور تماشا دیکھیے۔ کسی طرف سے نکل کے اُڑ جائیے تو جانیے کہ مین بنکیت نہین۔ اُنھین پر منحصر نہین بانک کی یہی تعریف ہے۔ اور ہر اُستاد اس کا دعوے کر سکتا تھا۔ لکھنؤ مین ایک تیسرے اُستاد ولی محمد خان تھے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے مین شیخ نجم الدین کے شاگرد کے شاگرد میر عباس کا نام مشہور تھا۔ اور اُنکے چار شاگرد نامور ہوے۔ جن مین سے ایک توڑا کو تھا۔ باقی تین مہذب شرفا تھے۔ اس فن کے آخری اُستاد میر جعفر علی تھے۔ جو لکھنؤ کی تباہی کے بعد واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج مین پہونچے۔ اُنھین مین نے دیکھا تھا۔ اور بچپن مین مین خود اُن کا شاگرد ہوا تھا۔ مگر دو ایک مہینے سیکھ کے چھوڑ دیا۔ اور جو کچھ سیکھا تھا خواب و خیال سا رہ گیا۔ اب نہین جانتا کہ کوئی جاننے والا بھی باقی ہے یا نہین۔

(۴) بنوٹ

اس فن کی اصلی غرض یہ ہے کہ حریف کے ہاتھ سے تلوار۔ لٹھ۔ یا کوئی حربہ ہو گرا دے۔ اور ایک رومال سے جس مین پیسہ بندھا ہوا کرتا ہے یا اپنے ہاتھ ہی سے حریف کو ایسا صدمہ پہونچائے کہ اُس کا کام تمام ہو جائے۔ اس فن کی نسبت لکھنؤ مین ابتدا سے مشہور تھا کہ اس کے بڑے بڑے زبردست اُستاد حیدرآباد دکن مین ہین۔ اور وہان جانے اور دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ واقعی وہان اب تک یہ فن ایک حد تک زندہ ہے۔ واقف کار لوگون کا بیان ہے کہ کھڑے ہوکے مقابلہ کرنے والا صاحب فن اگر نہتا ہے تو کشتی ہے۔ اُس کے ہاتھ مین چھری ہے تو بانک ہے۔ اور اگر کوئی دو گز کا لمبا سونٹا یا رومال اُسکے ہاتھ مین ہے تو بنوٹ ہے۔ بنوٹ والے بھی اپنے فن کو مخفی رکھتے ہین۔ اور باہمی عہد ہے کہ صرف شریف کو سکھائین گے۔ اور اُس سے عہد لیتے ہین کہ کبھی کسی زبردست یا بے آزار آدمی پر حربہ نہ کرین گے۔ بنوٹ والون کے پینترے جنھین وہ پاؤلے کہتے ہین بہت ہی اعلیٰ درجے کے پھرتیلے پن اور بے انتہا صفائی چاہتے ہین جو زیادہ عمر والون کو نہین حاصل ہو سکتے۔ اسکے علاوہ بنوٹ والون کو جسم انسانی کے تمام رگ پٹھون کا پورا علم ہوتا ہے۔ اور خوب واقف ہوتے ہین کہ کس مقام پر صرف اُنگلی سے دبا دینا یا ایک معمولی چوٹ انسان کو بیتاب و بیدم کر دیگی۔ اگرچہ اس فن کے

سیلے حیدر آباد مشہور تھا مگر لکھنؤ مین بھی اس کے بہت سے باکمال موجود تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہان سب سے پہلے محمد ابراہیم خان رام پور سے لائے تھے۔ طالب شیر خان یہان ایک بڑے زبردست بانکے تھے اور تلوار کے دھنی۔ اُنھون نے جو ابراہیم خان کا دعویٰ سُنا تو تلوار لے کے مقابلے کو تیار ہو گئے۔ محمد ابراہیم خان نے بھی مقابلہ منظور کر لیا۔ طالب شیر خان نے جیسے ہی تلوار ماری محمد ابراہیم خان نے اپنا رومال جس کے کونے مین پیسہ بندھا ہوا تھا کچھ ایسی خوبی سے مارا کہ طالب شیر خان کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کے جھٹکے سے دُور جا گری۔ مُنہ دیکھ کے رہ گئے۔ اور سب نے محمد ابراہیم خان کی اُستادی کا اعتراف کر لیا۔

اس کے بعد لکھنؤ مین آخر تک یہ فن رہا۔ یہان تک کہ مٹیا برج مین بھی محمد مہدی نام ایک شخص جو نواب معشوق محل کے وہان کے داروغہ تھے بنوٹے کے باکمال اُستاد مانے جاتے تھے۔

(۵) کُشتی

یہ فن خاص آریون کا تھا۔ ہندوستان مین بھی اور ایران مین بھی۔ عرب اور تُرک اس سے بالکل ناآشنا تھے۔ ہندوستان کے قدیم باشندون مین بھی جو آریہ لوگون سے پہلے تھے اس فن کا پتہ نہین چلتا۔ لکھنؤ مین پیچون اور حریف کے زیر کرنے کے طریقون کا بہت نشوونما ہوا۔ مگر کشتی کا اصلی دارومدار جسمانی قوت پر ہے۔ اور قوت مین لکھنؤ والے لاکھ کوشش کرین مشرقی ممالک خاصۃً پنجاب کے لوگون کا ہرگز مقابلہ نہین کر سکتے۔ لکھنؤ کی آب و ہوا کو قدرت نے یہ صلاحیت ہی نہین دی ہے کہ اسکی خاک سے غلام وغیرہ کے ایسے ہیلتن پہلوان پیدا ہون۔ اس لیے لکھنؤ کا کشتی کا فن صرف پیچپیچ کا کمال دکھاتا تھا جس مین زیادہ سے زیادہ اپنے سے دُونے پر غلبہ حاصل ہو جاتا۔ مگر اس سے زیادہ طاقت والے کو زیر کرنا غیر ممکن تھا۔ لکھنؤ کے اکھاڑون اور اگلے پہلوانون کے قصے بہت مشہور ہین۔ مگر سب پیچپیچ کے لحاظ سے نہ زور آوری کے اعتبار سے۔ ایک بار مین نے یہان کے ایک مشہور پہلوان سیّد کی لڑائی ایک دُونے قد کے پنجابی پہلوان سے دیکھی۔ اس مین شک نہین کہ سیّد کی لڑائی ابتدا سے نہایت خوبصورت تھی۔ اُسکی پھلت پھرت

اور اُس کا پھرتیلا پن قابل تعریف تھا - مگر انجام یہ ہوا کہ گھنٹہ بھر مین سید پسینے مین ڈوبا ہوا تھا - طاقت جواب دے چکی تھی اور دم پھول گیا تھا - اور پنجابی پہلوان پر جو اُسے کھلا رہا تھا کچھ اثر نہ ہوا تھا - آخر سید خود ہی میدان چھوڑ کے بھاگ گیا اور بے لڑے ہار ہی مان لی -

(۶) برچھا

جنگجوئی کا یہ پرانا فن ہے جو آریون - ترکون - اور عربون سب مین تھا - عربون کا برچھا لمبا ہوتا - اور اُس کا پھل تکونا - ترکون کا برچھا چھوٹا ہوتا اور پھل گول نوکدار یعنی مخروطی - اور ہندوستان کے آریون کا برچھا لمبا ہوتا مگر اُس کا پھل چپٹا باڑھ دار پان کی قطع کا - اور تعجب یہ ہے کہ تینون طرح کے نیزے لکھنؤ مین موجود تھے - بڑے برچھے پانچ گز کے لمبے ہوتے اور چھوٹے برچھے تین گز کے - بڑے برچھے کی یہ تعریف تھی کہ خوب لچکے یہان تک کہ دُہرا ہو جائے - اور چھوٹے کی یہ تعریف تھی کہ اُس مین نام کو بھی لچک نہ ہو - اور اسی مناسبت سے دونو کے چلانے کے فن جدا جدا تھے - لکھنؤ کے مشہور اور اصلی برچھیت میر کلو تھے - جن کا نام برہان الملک کے زمانے ہی مین چمک گیا تھا - اُن کے بعد میر اکبر علی برچھیت مشہور ہوے - پھر بریلی اور رامپور سے اکثر برچھیت آنا شروع ہو گئے - غازی الدین حیدر کے زمانے مین بادشاہ کو ہاتھیون کے شکار کا شوق ہوا تو برچھے کا فن جاننے والون کی بڑی قدر ہوئی - اور لڑائیون مین یہی حربہ زیادہ کام دینے لگا - افسوس یہ قدیم حربہ جس سے بڑی بڑی پرانی قومون نے ناموری پیدا کی تھی لکھنؤ مین اصلی یا نقلی طور پر آج بھی کثرت سے باقی ہے - مگر صرف براون کے جلوس کا کام دیتا ہے -

(۷) بانا

یہ فن بھی ادنیٰ درجے کے لوگون مین تھا اور کسی حد تک اب بھی باقی ہے - لٹھ کی لڑائی کے ہاتھ اور زدین اسی سے نکلی ہین - غرض اور غایت بانے کی بھی یہی ہے کہ بانا یا لٹھ چلاتا ہوا انسان دشمنون کے نرغے مین سے نکل جائے - بانا ایک لمبی لکڑی کا نام تھا جس کے ایک طرف لٹو ہوتا - اور بعض دونون طرف

لٹھ رکھتے۔ اور اس طرح ہلاتے کہ کوئی قریب نہ آسکتا۔ بعض لوگ لٹھون مین
کپڑا باندھ کے اور تیل مین ڈبو کے اُنھین روشن کرتے۔ اور اس طرح ہلاتے کہ
اپنے اوپر آگ کا مطلق اثر نہ ہو اور دشمن آگ کی وجہ سے دُور ہی دُور رہے۔

(۸) تیراندازی

یہ دنیا کی تمام جنگجو قومون کا پُرانا حربہ اور عہد قدیم کی بندوق ہے جس مین
بڑے بڑے کمالات دکھائے جاتے۔ اور شریف و رذیل سب اس کی تعلیم لازمی
سمجھتے۔ یہی حربہ ہے جس سے راجہ رامچندر جی اور اُن کے بھائی لچھمن جی نے
راون اور اُس کے ایسے کوہ پیکر حریفون کو مار کے گرا دیا۔ اگرچہ بندوق
کی ایجاد نے اُس کا زور کم کر دیا تھا مگر پھر بھی سپہگری کا اعلیٰ جوہر تیراندازی سمجھی
جاتی۔ کمانین اتنی کڑی رکھی جاتین کہ اُن کا چلّہ کھینچنا ہر ایک کے لیے
آسان نہ تھا بلکہ جس کی کمان جتنی زیادہ کڑی ہوتی اُسی قدر زیادہ اُس کا
تیر دُور جاتا۔ اور کاری ہوتا۔ عربون نے اپنی فتوحات کے زمانے مین تیراندازی
کے ایسے ایسے کمالات دکھائے ہین جو حیرت انگیز ہین۔ اُمِ ابان نام دس پانچ
ہی روز کی بیاہی ہوئی ایک عربیہ دولھن نے فتح دمشق کے موقع پر اپنے شہید
دولھا کے انتقام مین ایسے زبردست تیر برسائے کہ پہلے نے دشمنون کے علمبردار
کو مار کے گرا دیا۔ اور دوسرا دشمنون کے بہادر سردار ٹامس کی آنکھ مین اس طرح
پیوست ہو گیا کہ کسی کے نکالے نہ نکل سکا۔ اور آخر گانسی کاٹ کے آنکھ ہی
مین چھوڑ دی گئی۔

اودھ کے پاسی اور بھر اس فن کو پہلے ہی بخوبی جانتے تھے۔ پھر نئے
نئے اُستاد دہلی سے آئے۔ اور آصف الدولہ کے عہد مین اُستاد نفیس بخش نے
بادشاہ کے اشارے سے مرزا حیدر کے والد کو جو ہاتھی پر سوار آ رہے تھے
ایسی پھرتی سے تیر مارا کہ نہ کسی نے اُن کو نشانہ بازی کرتے دیکھا اور نہ انھین خبر
ہوئی۔ حالانکہ تیر چلتے کو توڑ کے نکل گیا تھا۔ وہ آخر تک بےخبر رہے۔ گھر پہونچ کے
چلتہ کھولا تو وہ خون آلود تھا۔ اور ساتھ ہی زخم سے خون کا فوارہ چھوٹا اور
دم بھر مین مر گئے۔

اس کی تعلیم کا طریقہ بھی مشکل تھا - مگر اب یہ فن دنیا کی تمام متمدن قوموں میں فنا ہو گیا - اس لیے کہ موجودہ آتشبار اسلحہ نے اسے بالکل بیکار کر دیا ہے - مگر ہندوستان کی وحشی قوموں میں آج تک باقی ہے جو شکار اور درندوں کے مارنے میں عموماً اور کبھی کبھی باہمی جنگ و پیکار میں بھی تیروں سے کام لیا کرتی ہیں۔

(۹) کٹار

یہ پُرانا خاص آریہ قوم کا حربہ تھا - اور آخر میں اُس سے زیادہ تر چور اور قزاق کام لیتے - اُس سے حریف پر ٹوک کے حملہ نہ کیا جاتا بلکہ اُسے غافل رکھ کے حملہ کیا جاتا - اسی وجہ سے غالباً دہلی میں بھی اور خاصۃً لکھنؤ میں شرفا نے اُس سے کام لینا بالکل چھوڑ دیا تھا - کٹار سب باندھتے مگر اس سے لڑنا اور حربہ کرنا کوئی نہ جانتا تھا - اُس سے حربہ کرنے کی تعریف یہ تھی کہ جب چاہیں تو حربہ کریں مگر دشمن کے جسم میں کہیں خراش بھی نہ آئے - اور جب چاہیں تو قبضے تک پار ہو جائے - اِس سے چور اکثر راتوں کو غافل اور سوتے حریف پر حملہ کرتے اور چھپ کے اُس کا کام تمام کر آتے -

(۱۰) جل بانک

یہ وہی بانک کا مذکورہ فن تھا جو پیراکی اور شناوری سے وابستہ کر دیا گیا تھا - مقصد یہ تھا کہ گہرے پانی میں دشمن پر قابو حاصل کریں - اور اُسے باندھ لائیں یا پانی ہی میں اُس کا کام تمام کر دیں - تاریخ میں اور کسی جگہ اس کا تذکرہ نہیں - مگر لکھنؤ میں پیرنے کے ایک اُستاد میرک جان نے اسے ایجاد کیا - اور سیکڑوں شاگردوں کو سکھایا - بادی النظر میں اس کی ایجاد لکھنؤ ہی میں ہوئی اور آج بھی پیراکی کے بعض بہیں کے اُستاد جانتے ہیں - اور کہیں اس فن کا نام ونشان بھی نہیں -

پیرائیوں میں لکھنؤ نے جو ترقی کی اُس کا تذکرہ ہم آیندہ کریں گے -

(۱۸)

اُردو میں مثل مشہور ہے کہ "بڑھاپے میں انسان کی قوت شہوانی زبان میں آجایا کرتی ہے" ویسے ہی بہادروں اور جانبازوں کی قوت شجاعت کی نسبت

اکثر تجربہ ہوا ہے کہ جب کمزوری آتی ہے یا ہاتھ پیرون کی طاقت جواب دیتی ہے تو ساری بہادری اور شجاعت دست و بازو سے نکل کے زبان اور آنکھون مین جمع ہو جاتی ہے۔ اب وہ اپنی گذشتہ شجاعت و ناموری کے افسانے بیان کرتے اور شجاعت کے کارنامے اپنی ذات سے نہین دکھاتے بلکہ اُن کا تماشا لڑنے والے جانورون کے ذریعے سے دیکھتے اور دوسرون کو دکھا دکھا کے داد طلب ہوتے ہین۔

یہی حال لکھنؤ کا ہوا۔ جب لوگون کو ملک گیری وصف آرائی سے فرصت ملی اور میدان جنگ مین کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگجوئی کے جذبات نے جانورون کو لڑا لڑا کے جانبازی و خون ریزی کا تماشا دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا۔ یہ شوق یون تو تھوڑا بہت سب جگہ ہے مگر اس مین جس قدر انہماک اہل لکھنؤ کو ہوا اور ان بے نتیجہ بلکہ سنگدلی کی دلچسپیون کو ان لوگون نے جس درجۂ کمال کو پہونچا دیا اور مقامات کے لوگون کے خواب و خیال مین بھی نہ گذرا تھا۔ اور اگر غور سے دیکھیے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس شوق اور ان مشاغل کے جیسے کرشمے اور دلکش تماشے سواد لکھنؤ مین دیکھے گئے دہلی یا ہندوستان کا کوئی دربار درکنار غالباً ساری دنیا کے کسی شہر مین نہ دیکھے گئے ہون گے۔

لکھنؤ مین غیر کی شجاعت سے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ شوق تین طریقون سے پورا کیا گیا۔ (الف) درندون اور چوپاؤن کو لڑا کے (ب) طیور کو لڑا کے۔ (ج) تکلین اور کنکوے لڑا کے یعنی پتنگ بازی کے ذریعے سے۔ ان تینون قسمون کو ہم بقدر اپنی جستجو اور معلومات کے جدا جدا تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہین۔

قسم اول یعنی درندون اور چوپاؤن کی لڑائی کا تماشا یہان مندرجۂ ذیل جانورون کو لڑا کے دیکھا گیا (۱) شیر۔ (۲) چیتے۔ (۳) تیندوے (۴) ہاتھی۔ (۵) اونٹ۔ (۶) گینڈے۔ (۷) بارہ سنگھے۔ (۸) مینڈھے۔ درندون کے لڑانے کا مذاق قدیم ہندوستان مین کہین یا کبھی نہین سنا گیا تھا۔ یہ اصلی مذاق پُرانے رومیون کا تھا جہان انسان اور درندے کبھی باہم اور کبھی ایک دوسرے سے لڑائے جاتے تھے۔ مسیحیت کے عروج پاتے ہی وہان بھی یہ مذاق چھوٹ گیا تھا۔ مگر اب تک اسپین مین اور بعض دیگر ممالک یورپ مین وحشی سانڈ باہم اور کبھی کبھی انسانون

سے لڑائے جاتے ہین - لکھنؤ مین غازی الدین حیدر بادشاہ کو غالباً اُنکے یوروپین دوستون نے درندون کی لڑائی دیکھنے کا شوق دلایا - بادشاہ فوراً آمادہ ہوگئے - اور چند ہی روز مین شاہی دلچسپی ان خوفناک اور وحشیانہ لڑائیون مین ایسی بڑھی کہ کوئی امکانی کوشش نہین اُٹھا رکھی گئی - موتی محل مین عین لب دریا دو نئی کوٹھیان مبارک منزل اور شاہ منزل تعمیر کی گئین - اُنکے مقابل دریا پار کوسون تک ایک فرحت بخش سبزہ زار چلا گیا تھا - جس مین آہنی کٹہرے سے گھیر کے ایک وسیع رمنہ بنایا گیا تھا - اُس مین قسم قسم کے ہزارہا جانور لا کے چھوڑے گئے تھے - اور درندے کٹہرون مین بند کر کے رکھے گئے تھے - اسی رمنے کے سلسلے مین دریا کنارے ہی وحشی جانورون کے لڑانے کے لیے بڑے بڑے میدان بانس کے ٹھاٹھرون یا آہنی حصار سے محفوظ کیے جاتے جو شاہ منزل کے عین محاذی دریا کے اُس پار ہوتے - دریا کا پاٹ وہان بہت کم ہے - بادشاہ اور اُنکے مہمان و مصاحبین شاہ منزل کے بالائی صحن پر گنگا جمنی شامیانون کے سائے مین بیٹھ کے اطمینان اور آرام سے سیر دیکھتے اور پار کے محصور میدان مین درندون کی قیامت خیز لڑائی کا محشر بپا ہوتا - درندون اور مست ہاتھیون کا لڑانا تو آسان ہے مگر اسکی سنبھال نہایت ہی مشکل ہے - ایک مست ہاتھی یا شیر کٹہرے سے چھوٹ جاتا ہے تو شہرون مین بھگدڑ پڑ جاتی ہے اور بہت سی جانین ضائع ہو جاتی ہین - مگر یہان لوگ اس خوفناک کام مین اسقدر ہوشیار ہو گئے تھے کہ اُس وقت جو یورپین سیاح دربار مین موجود تھے - خود اپنی تحریرون مین اقرار کرتے ہین کہ وحشی جانورون کے پالنے - سدھانے - اور اُن کی داشت اور سنبھال کرنے والے آدمی لکھنؤ سے بہتر دنیا بھر مین کہین نہین ہین یہی لوگ ہاتھیون اور درندون کو لا کے چھوڑتے - اُن کو اپنے بس مین رکھتے - اُن کے ہارتے وقت غالب و مغلوب دونون درندون کو اپنے قابو مین کرتے - اس کام کے لیے سیکڑون سانٹے مار اور بلم بردار مقرر تھے جو اُنھین مارتے اور اپنے آپ کو اُن کے حملون سے بچاتے - لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخون اور آتشبازیون سے اُنکو جدھر چاہتے موڑتے اور جہان چاہتے ہنکا لیجاتے - شیرون اور تیندوون کو کٹہرون مین بند کرتے - غرض اُن لوگون کی پھرتی - چالاکی - اور جلیت پھرت اور ہوشیاری

خود جانورون کی لڑائی سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز تھی۔ جن باتون کو دیکھ کے دم بھر مین نظر آ جاتا کہ ان بڑے بڑے دیوہیکل جانورون اور مہیب وحشی درندون پر انسان دنیا مین کن اسباب سے غالب آ گیا ہے۔ اب ان جانورون مین سے ہر ایک کی لڑائی کا جداگانہ حال سُنیے جو غالباً لطف سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) شیر

بادشاہ نے بہت سے شیر جمع کر رکھے تھے۔ جو نیپال کی ترائی سے پکڑ پکڑ کے لائے جاتے۔ ان مین سے بعض بہت بڑے تھے۔ بعض مختلف لڑائیون مین غالب آ کے بادشاہ کو بہت عزیز ہو گئے تھے۔ لڑائی کے لیے اُن کے کٹہرے میدان کے حصار کے پاس لا کے کھول دیے جاتے۔ دونون حریف چھوٹتے ہی غرا کے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے۔ اور دانتون اور پنجون سے ایک دوسرے کو زخمی کرتے۔ باہم گتھ جاتے۔ کبھی یہ اُس کو گرا کے اوپر چڑھ بیٹھتا کبھی وہ اس کو زیر کرتا۔ دیر تک ایک نہایت ہولناک لڑائی ہوتی رہتی۔ جس مین کبھی تو ایک حریف جان سے مارا جاتا اور کبھی سخت زخمی ہو کے ہمت ہارتا۔ کثرت سے خون نکل جانے کے باعث کمزور ہو کے بھاگتا۔ اور حریف غصے سے اُس کا تعاقب کرتا۔ اُس وقت اُن دونون کے سنبھالنے اور قابو مین لانے کے لیے لڑانے والون کا کمال اور اُنکی دوڑ دھوپ اور کارستانیان دیکھنے کے قابل ہوتین۔

شیر اکثر تینددون سے لڑائے جاتے۔ مگر یہان ایسے ایسے زبردست تیندوے تھے جن سے شیر بہت ہی کم جیت سکتا۔ اُن کی لڑائی کی شان بھی وہی ہوتی جو شیرون کے باہم لڑنے کی ہے۔ کبھی کبھی شیر اور ہاتھی بھی لڑا دیے جاتے۔ مگر اُنکی لڑائی جوڑ کی نہ ہوتی۔ اور اُسکے نتیجے بھی خلاف اُمید مختلف قسم کے ہوتے۔ اگر ہاتھی خوب جیالا ہوا تو شیر بہت کم اُس سے پیش پا سکتا تھا۔ سب سے زیادہ پُرلطف لڑائی شیر اور گینڈے کی ہوتی۔ گینڈا سوا پیٹ کے حصۂ زیرین کے روئین تن واقع ہوا ہے۔ اُس پر نہ شیر کے دانت اثر کرتے ہین نہ پنجے۔ اسی قدرتی مضبوطی کے زعم مین وہ کسی زبردست سے زبردست حریف کی پروا نہین کرتا۔ اور خود جب سر جھکا کے حریف کے پیٹ کے نیچے گھستا ہے تو اپنے بانسے کے اوپر والی ہولناک

سینگ پیٹ مین اس طرح پیوست کردیتا ہے کہ آنتین باہر نکل پڑتی ہین۔ اور
حریف کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ شاذ و نادر ہی کبھی ایسا ہوا کہ شیر نے گینڈے کو
چارون شانے چت گرا کے اپنے ناخنون اور دانتون سے اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالا
ہو۔ ورنہ اکثر یہی ہوتا کہ گینڈا اپنا سینگ بھونک کے شیر کو مار ڈالتا۔

مگر سب سے زیادہ حیرتناک یہ چیز ہے کہ نصیرالدین حیدر بادشاہ کے زمانے
مین ایک مرتبہ ایک گھوڑے کے مقابلے مین شیرون کو بڑی زک اُٹھانا پڑی۔
یہ عجیب و غریب گھوڑا تھا جو مردم آزاری مین درندون سے بھی بڑھ گیا تھا۔
مجال نہ تھی کہ کوئی آدمی اُس کے پاس جائے۔ دانہ دُور سے اُس کی طرف
بڑھا دیا جاتا۔ اور جب چھوٹ جاتا بہت سے آدمیون کو ہلاک کر ڈالتا۔
جو سامنے آتا اُسے مار کے ہڈیان پسلیان چبا ڈالتا۔ اور لاش ایسی بگاڑ دیتا کہ
پہچانی نہ جاتی۔ مجبوراً تجویز ہوئی کہ اُس پر شیر چھوڑ دیے جائین۔ چنانچہ بھورا
نام شیر جو بادشاہ کو عزیز تھا اور اکثر بازیان لے جاچکا تھا اُس پر چھوڑا گیا۔
گھوڑا بجائے اسکے کہ شیر سے خوف کھائے لڑنے کو تیار ہوگیا۔ اور جیسے ہی شیر
جست کرکے اُس پر آیا اُس نے اس طرح اگلا جسم جھکایا کہ شیر پشت پر گرا اور
اُسکے پٹھون مین ناخنون کے خنجر پیوست کردیے۔ ساتھ ہی گھوڑے نے اِس زور
سے دولتی ماری کہ شیر قلابازیان کھاتا ہوا دُور جا گرا۔ مگر پھر سنبھلا اور چند منٹ
اِدھر اُدھر تاؤ دے لگاکے پھر جست کرکے گھوڑے پر جا رہا۔ گھوڑے نے پھر
وہی حرکت کی کہ اگلا جسم جھکا دیا۔ شیر پٹھون پر جا پڑا اور ارادہ کیا کہ اُسے پنجون
سے گرا کے مار ڈالے مگر گھوڑے نے اب کی اس زور سے دولتی جھاڑی کہ شیر کے
جبڑے ٹوٹ گئے۔ اور چارون شانے چت دُور جا گرا۔ لیکن اس چوٹ نے شیر
نے ایسی ہمت ہاردی تھی کہ گھوڑے کی طرف پیٹھ پھیر کے بھاگنے لگا۔ اور تماشائی
حیران رہ گئے۔ تب دوسرا اُس سے بڑا شیر چھوڑا گیا۔ اُس نے رُخ ہی نہ کیا۔
مجبوراً وہ شیر بھی ہٹا لیا گیا۔ اور تین آرنے بھینسے چھوڑے گئے۔ وہ بھی گھوڑے
سے نہ بولے۔ اور گھوڑے نے بڑھ کے بے چھیڑے ایک بھینسے پر اس زور سے
دولتی جھاڑی کہ وہ بھینسا تیورا گیا۔ اور اُس کے دونون ساتھی اس طرح

سر ہلانے لگے گویا داد دے رہے ہین کہ "ہان! یہ ہوئی نا" آخر گھوڑے کی جان بخشی کی گئی۔ اور نصیرالدین حیدر نے کہا "مین اس کے واسطے ایک آہنی کٹہرا بنوا دون گا۔ اور اس کی پرورش کا بھی سامان کر دون گا۔ ابا جانی کے سر کی قسم یہ بڑا بہادر ہے"

(۲) چیتا

سب ہی درندے لڑائی کے لیے دو ایک دن پیشتر سے بھوکے رکھے جاتے ہین مگر چیتے کے بارے مین اس کا خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ چیتا جس قدر زیادہ ظالم و خونخوار ہے اُسی قدر بعض وقت بزدل بھی ثابت ہوتا ہے علی العموم بگڑے امیرزادون کی طرح وہ خوشامد طلب خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میدان مین جب اُس کا جی چاہے لڑتا ہے اور جب نہ جی چاہے لاکھ جتن کرو نہین لڑتا۔ لڑائی مین وہ کتراتا اور کنیاتا ہوا حریف پر جاتا ہے۔ پہلے جست کرکے ایک دوسرے کو زخمی کرنا چاہتا ہے۔ ایسی دو ایک جستون کے بعد دونون پچھلے پانوٗن پر کھڑے ہوکے پنجون سے لڑنے لگتے ہین۔ یہ بڑی خونریز لڑائی ہوتی ہے۔ جس مین دونون غراتے جاتے ہین اور حریف پر پنجے مارتے جاتے ہین آخر زبردست کمزور کو گراکے چلکتین مار مار کے حریف کا کام تمام کردیتا ہے۔ مگر خود بھی سر سے پانوٗن تک زخمی ہوجاتا ہے۔

(۳) تیندوا

تیندوا چھوٹے پیمانے کا شیر ہوتا ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ مین شیرون سے اکثر لڑنے والے تیندوے تھے جو قیامت کی لڑائی لڑتے۔ اور اکثر شیرون پر غالب آجاتے۔ تیندوے کی لڑائی بالکل شیرون کی سی ہوتی ہے۔ لڑتے لڑتے دونون حریف سخت زخمی ہوجاتے ہین۔ اور مغلوب حریف کبھی تو وہین میدان مین گرکے مرجاتا ہے اور کبھی دشمن سے ہار کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے

(۴) ہاتھی

لکھنؤ مین ہاتھیون کی لڑائی بہت پسند کی جاتی تھی اور نہایت ہی دلچسپ سمجھی جاتی۔ اور یہ شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ نصیرالدین حیدر بادشاہ کے

زمانے مین ڈیڑھ سو لڑائی کے ہاتھی تھے جن کو سواری سے تعلق نہ تھا۔ ہاتھیون کی لڑائی کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مست ہو گئے ہون۔ اس لیے کہ ہاتھی جب تک مست نہ ہون نہین لڑتے۔ اور لڑین بھی تو اُن مین فتحیابی اور حریف پر غالب آنے کا سچا جوش اور غصہ نہین ہوتا۔

لڑائی کے وقت اُن کی گردن سے دُم تک ایک رسّا بندھا ہوتا ہے۔ حریف کا سامنا ہوتے ہی دونون حریف سونڈین اور دُمین اُٹھا کے زور سے چنگھاڑتے ہوے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے ہین۔ اور بڑی زبردست ٹکر ہوتی ہے۔ اسکے بعد برابر ٹکرون پر ٹکرین ہوتی رہتی ہین جن کی آواز بڑی دُور تک جاتی ہے۔ پھر دونون ایک دوسرے سے منھ ملاکے اور دانتون کو اَڑاکے ایک دوسرے کو ریلنا اور ڈھکیلنا شروع کرتے ہین جس مین اُن کے جسم کے پیچ و تاب کھانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیسا زور لگا رہے ہین۔ فیلبان آنکس مار مار کے زور لگانے پر اُکسین اور زیادہ اُبھارتے رہتے ہین۔ آخر دونون مین سے ایک ہاتھی کمزور پڑتا اور ریلے کی تاب نہ لاکے زمین پر گرتا ہے۔ غالب ہاتھی اُس وقت اکثر دانت سے اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالتا اور کام تمام کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر ہاتھیون کا معمول ہے کہ کمزور پڑتے ہی دانت چھُڑا کے بھاگتے ہین اور غالب آنے والا تعاقب کرتا ہے۔ پا گیا تو ٹکرین مار کے گراتا اور اکثر دانتون سے پیٹ پھاڑ کے مار ڈالتا ہے اور اگر وہ نکل گیا تو جان بچ جاتی ہے۔

لکھنؤ مین ہاتھیون سے اکثر گینڈے بھی لڑائے جاتے تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ دونون جانور باہم لڑتے ہی نہ تھے۔ اور اگر کبھی لڑ گئے تو بلے تک سخت لڑائی ہوتی۔ اگر کبھی ہاتھی نے گینڈے کو ڈھکیل کے اُلٹ دیا تو اُس کے دانت پیٹ مین پیوست ہو کے اُس کا کام تمام کر دیتے۔ اور اگر گینڈے نے موقع پا کے اپنا بالائی سینگ ہاتھی کے پیٹ مین اُتار دیا تو کھال دُور تک پھٹ جاتی۔ مگر ہاتھی سونڈ کی مدد سے گینڈے کے سینگ کو اپنے جسم مین زیادہ دُور تک نہ گھُسنے دیتا۔ اور کاری زخم سے بچ جاتا۔

(۵) اونٹ

یون تو دنیا مین ہر ذی روح لڑ سکتا ہے لیکن اونٹ سے زیادہ غیر موزون لڑائی کے لیے کوئی جانور نہین ہو سکتا۔ مگر لکھنؤ مین اونٹ بھی مست اور پُرجوش بنا کے لڑائے جاتے۔ اونٹ کی پکڑ مشہور ہے۔ اور اُس کا بے طریقے گرنا اُس کے حق مین نہایت ہی خطرناک ہے۔ اونٹون کا جوش کف نکالنے اور جھاگ اُڑانے سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کف اُڑاتے ہوے دوڑتے ہین۔ اور گالیان دینے اور ایک دوسرے کے منہ پر تھوکنے یعنی بلبلانے اور جھاگ اُڑانے سے لڑائی شروع ہوتی ہے۔ جسے موقع مل گیا حریف کا لٹکتا ہوا ہونٹھ دانتون سے پکڑ لیتا ہے اور کھینچنا شروع کرتا ہے۔ جس اونٹ کا ہونٹھ حریف کے دانتون مین آ گیا وہ اکثر گر پڑتا اور ہارتا ہے۔ اور اسی پر لڑائی ختم ہو جاتی ہے۔

(۶) گینڈا

گینڈے سے زیادہ مضبوط جانور کوئی نہین پیدا کیا گیا ہے۔ وہ قد و قامت مین شیر اور ہاتھی سے چھوٹا ہی کر ایسا روئین تن پیدا کیا گیا ہے کہ نہ اُس پر ہاتھی کے دانت کارگر ہوتے ہین نہ شیر کے پنجے اور ناخن۔ صرف پیٹ کی کھال نرم ہوتی ہے۔ اگر کوئی جانور اُس پر حربہ کر سکا تو مار لیتا ہے ورنہ ہر جانور اپنا زور صرف کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور آخر مین گینڈا اپنا بانسے پر کا زبردست سینگ اُس کے پیٹ مین بھونک کے مار ڈالتا ہے۔

لکھنؤ مین گینڈے ہاتھیون سے۔ شیرون سے۔ تیندوون سے اور خود گینڈون سے لڑائے جاتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ کے زمانے مین لڑانے کے علاوہ بعضے گینڈے اس خوبی سے سدھائے گئے تھے کہ گاڑی مین جوتے جاتے۔ اور ہاتھی کی طرح اُنکی پیٹھ پر ہودہ کس کے سواری لی جاتی۔ گینڈا بالطبع لڑنے والا جانور نہین ہے۔ بلکہ جہان تک ممکن ہوتا ہے لڑائی کو طرح دیتا ہے۔ لیکن ہان اگر اُسے چھیڑا جائے تو مقابلے کے لیے تیار ہو کے نہایت ہی موذی بن جاتا ہے نصیر الدین حیدر کے زمانے مین لڑائی کے پندرہ بیس گینڈے موجود تھے جو چاند گنج مین رہا کرتے جب سوار اُنھین رگید کے ایک دوسرے کے مقابل کر دیتے تو وہ سر جھکا کے ایک دوسرے کی طرف دوڑتے اور ٹکرین ہونے لگتین۔ دونون کی یہ کوشش ہوتی کہ حریف کے پیٹ کو اپنے سینگ سے پھاڑ ڈالین۔ اور اسی کوشش مین

وہ دیر تک ایک دوسرے کو ریلتے پیلتے اور ڈھکیلتے رہتے۔ بڑے زور زور سے غراتے۔ سینگ کو سینگ سے ٹکراتے۔ اور آخر مین لڑتے لڑتے سر جوڑ کے گتھ جاتے۔ اور حریف کو ڈھکیلتے رہتے۔ یہان تک کہ جو حریف کمزور پڑتا ہے وہ آہستہ آہستہ ہٹنے اور جگہ چھوڑنے لگتا ہے۔ اور اس پر بھی جان نہین چھوٹتی تو بھاگتا ہے۔ مگر غالب رگید رگید کے مارتا ہے۔ آخر کمزور اپنا سینگ الگ کرکے مقابلے سے منہ موڑتا اور بڑے زور سے بھاگتا ہے۔ اگر محصور میدان ہوا تو غالب حریف بھاگتے مین اُس پر حملہ کرکے اُسے گراتا اور پیٹ مین سینگ بھونک کے کام تمام کر دیتا ہے۔ اور اگر وسیع کھلا میدان ہو۔ اور شکست خوردہ گینڈا بھاگ سکا تو بھاگ کے اپنی جان بچا لیتا ہے۔ اُسوقت سوار رگید رگید کے اور گرم سلاخون سے مار مار کے غالب کو مغلوب کے تعاقب سے روکتے اور ہٹا لے جاتے ہین۔ گینڈون کی لڑائی کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ سر جھکائے اور اپنے پیٹ کو بچائے رہین۔ اگر دھوکے مین بھی کسی کا سر اُٹھ گیا تو مقابل حریف اپنا کام کر گذرتا ہے۔ چنانچہ ایک گینڈا غالب آ گیا اور اُس کا حریف بھاگنے لگا۔ اُسے بھاگتے دیکھ کے غالب نے سر اونچا کر دیا۔ اور ساتھ ہی اُسی شکست خوردہ گینڈے نے بجلی کی طرح دوڑ کے اُسکے پیٹ مین سر ڈال دیا اور پیٹ پھاڑ ڈالا۔

(۷) بارہ سنگھا

یہ چھوٹا نازک اور خوبصورت جانور ہے۔ اور شاید لکھنؤ کے سوا اور کسی جگہ تفنن طبع کے طور پر نہ لڑایا گیا ہوگا۔ مگر اس کی لڑائی بڑی خوبصورت ہوتی ہے۔ ہرن شعرا کے معشوق کا ہمشکل ہے۔ اس لیے اُس کی لڑائی مین بھی معشوقانہ ادائین ظاہر ہوتی ہین۔ مقابلے کے وقت پہلے بڑی خوبصورتی کے ساتھ دونون حریف پینترے بدلتے رہتے ہین۔ اور آخر ٹکرین ہونے لگتی ہین۔ جن مین سینگون سے وہ تلوار کا بھی کام لیتے ہین اور سپر کا بھی۔ آخر دیر تک کی ٹکرون کے بعد دونون کے سینگ آپس مین اس طرح اُلجھ جاتے ہین کہ معلوم ہوتا ہے قفلی پڑ گئی۔ اب ایک دوسرے

۱ ؎ مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی نے بتایا اور ہمین بھی بعد کو تاریخون مین نظر آیا کہ دنبے اور ہاتھی دہلی مین بھی لڑائے جاتے تھے۔

کو ریلتے اور ڈھکیلتے رہتے ہین - اسی ریلا پیلی مین ایک کمزور پڑ جاتا ہے - اور اُسپر مغلوبی کی ایسی ہیبت طاری ہو جاتی ہے کہ نازک پاؤن تھرتھرانے لگتے ہین - اور سارے تن بدن مین رعشہ پڑ جاتا ہے - مگر حریف ترس کھانے کے عوض زور مین آکے اور ڈھکیلتا ہے - اور ڈھکیلتا ہوا میدان کے خاتمے یعنی ٹھاٹھر تک پہونچا دیتا ہے - اب مغلوب کو بالکل نا امیدی ہوتی ہے - آنکھون سے موٹے موٹے آنسو اور سینگون سے خون کے قطرے ٹپکنے لگتے ہین اور وہ سینگ چھڑا کے لڑائی سے مُنہ پھیر لیتا ہے - اُس وقت حریف سینگون سے اُسکے جسم کو زخمی کرنا شروع کرتا ہے اور مغلوب بارہ سنگھا زور سے بھاگتا ہے - جس پُھرتی سے وہ بھاگتا ہے اُسی تیزی سے غالب حریف اُس کا تعاقب کرتا ہے - یہ دوڑ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے دونون ہوا سے باتین کرنے لگتے ہین اور اُن پر نگاہ نہین ٹھہرتی ہے - مگر بے رحم دشمن مغلوب کا پیچھا نہین چھوڑتا - جہان پاتا ہے زخمی کرتا ہے - آخر زخمون سے چور کرتے کرتے مار ڈالتا ہے - اور مرنے کے بعد اُس کی لاش کو اپنے سینگون سے جھنجھوڑ کے ہٹتا اور اپنی فتح پر نازان ہوتا ہے -

(۸) مینڈھا

یہ نہایت ہی غریب اور بے آزار جانور ہے مگر اُس کی ٹکر بڑی زبردست ہوتی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دو پہاڑ لڑ گئے - چنانچہ انھین ٹکرون کا تماشا دیکھنے کے لیے لوگ اُنھین لڑاتے ہین - اور آج ہی نہین قدیم الایام سے ان کی لڑائی دیکھی جاتی رہی - ان کے لڑانے کا آغاز ہندوستان مین بلوچی لوگون سے ہوا - اور اُنھین سے دوسرے مقامون مین شوق پیدا ہوا - مگر لڑائی کے لیے اُن کے پالنے اور تیار کرنے کا کام اکثر قسائیون اور ادنیٰ طبقے کے لوگون سے متعلق رہا - امرا و شرفا اُنھین سامنے بلوا کے لڑائی کا تماشا دیکھ لیا کرتے تھے - سُنا جاتا ہے کہ نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خان کو مینڈھون کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا - غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے سامنے بھی اکثر مینڈھے لڑائے گئے - واجد علی شاہ کو کلکتے کے قیام مین بھی کسی حد تک شوق تھا - منشی السُّلطان بہادر اُن کی دلچسپی کے لیے اکثر قسائیون کے زیر اہتمام بہت سی جوڑین

تیار رکھتے تھے۔ اور مین نے کئی بار دیکھا کہ کسی زبردست مینڈھے کی ایسی ٹکر پڑی کہ
دوسرے حریف کا سر پھٹ گیا۔ مینڈھا جب ہارتا ہے اور مقابل حریف کی ٹکر کی
تاب نہین لا سکتا تو اُس کی ٹکر خالی دے کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ
ایک بار بادشاہ کا رمنہ دیکھنے کے لیے مقررہ سالانہ تاریخ کو کلکتے کے صدہا انگریز
جمع تھے۔ بادشاہ سلامت اپنی وضع کے خلاف بوچے پر سوار نکل آئے۔ اور اُن
مہمانون کے خوش کرنے کے لیے حکم دیا کہ مینڈھے لاکے لڑائے جائین۔ چنانچہ
اُن کی ٹکرون کا ہنگامہ بلند ہوا۔ اور اُس سے زیادہ شور یوروپین لوگون نے
"ہُرّے" اور خوشی کے نعرے بلند کرکے مچایا۔ اور عجیب جوش و خروش کا عالم
نظر آتا تھا۔ لکھنؤ مین انتزاع سلطنت کے بعد بھی نواب محسن الدولہ بہادر کو مینڈھون
کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اب شرفا اور امرا سے یہ مشغلہ چھوٹ گیا ہے۔ ادنی
لوگون مین معمولی حد تک باقی ہے۔

(۱۹)

درندون کی لڑائی لکھنؤ مین صرف سلطنت اور امرائے دربار تک محدود تھی۔ اس
لیے کہ اُن کی داشت۔ تیاری۔ لڑائی کے وقت اُن کو سنبھالنا۔ اور تماشائیون
کو اُن کی مضرت سے بچانا ایسی چیزین ہین جو غربا درکنار بڑے بڑے امیرون کے
امکان سے بھی باہر ہین۔ اور اسی لیے درندون کی لڑائی سواد لکھنؤ مین اُسی وقت
تک دیکھی گئی جب تک اگلا دربار قائم تھا۔ ادھر وہ دربار برخاست ہوا اور
اُدھر وہ وحشت ناک دنگل بھی اُجڑ گئے۔

لیکن طیور کی لڑائی ایسی نہ تھی۔ اس کا شوق ہر امیر و غریب کر سکتا تھا۔ اور
ہر شوقین محنت کرکے لڑائی کے قابل مرغ یا بٹیر تیار کر سکتا تھا۔ جو طیور لکھنؤ مین
شوق اور دلچسپی کے ساتھ لڑائے گئے حسب ذیل ہین:۔ (۱) مرغ۔ (۲) بٹیر۔ (۳)
تیتر۔ (۴) لوے۔ (۵) گلدم۔ (۶) لال۔ (۷) کبوتر۔ (۸) توتے۔ ان مین سے ہر ایک
کھیل کے جدا جدا بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ لکھنؤ کی کبوتر بازی اور بٹیر بازی عام طور
پر مشہور ہے۔ جس پر آج کل کے تعلیم یافتہ اور موجودہ تہذیب کے دلدادہ اکثر تمسخر کیا
کرتے ہین۔ وہ اس سے مطلق واقف نہین کہ اُن شوقون اور کھیلون مین سے

ہر ایک کو اِن لوگون نے کس درجۂ کمال پر پہونچاکے ایک مستقل فن بنا دیا تھا لیکن جب وہ یورپ مین جاکے وہان بھی اسی قسم کے لغو شوق دیکھین گے تو کم سے کم اُنھین اپنے اُن الفاظ پر ندامت ضرور ہو گی جو اپنے وطن کے اِن شوقینون کی نسبت اکثر بے ساختہ کہہ بیٹھتے ہین -

(۱) مرغ بازی

لڑتے اگرچہ ہر قسم اور ہر قوم کے مرغ ہین مگر لڑائی کے لیے مخصوص اصیل مرغ ہے - اور سچ یہ ہے کہ دنیا مین اصیل مرغ سے زیادہ بہادر کوئی جانور نہین ہے - مرغ کی سی بہادری درحقیقت شیر مین بھی نہین ہے - وہ مرجاتا ہے مگر لڑائی سے مُنہ نہین موڑتا - اصیل مرغ کی نسبت یہان کے محققین کا خیال ہے کہ اُنکی نسل عرب سے لائی گئی ہے - اور یہ قرینِ قیاس بھی معلوم ہوتا ہے - اس لیے کہ فی زماننا اصیل کی جس قدر زیادہ اور اعلیٰ نسلین حیدرآباد دکن مین موجود ہین کہین نہین ہین - اور ہندوستان مین وہی ایک شہر ہے جہان اہل عرب سب جگہون سے زیادہ آباد اور مقیم ہین - لہٰذا ہند مین مرغون کی نسلین ایران ہوتی ہوئی آئین - لکھنؤ کے نامی مرغ بازون مین سے ایک صاحب کا بیان تھا کہ بازی مین اُن کا مرغ اتفاقاً ہار گیا تھا - دل شکستہ ہوکے وہ ارض عراق مین چلے گئے - نجف اشرف مین کئی مہینے تک مصروفِ عبادت رہے اور شب و روز دعا کرتے کہ خداوندا اپنے ائمۂ معصومین کا صدقہ مجھے ایسا مرغ دلوا جو لڑائی مین کسی سے نہ ہارے - ایک رات کو خواب مین بشارت ہوئی کہ "جنگل مین جاؤ" صبح آنکھ کھلتے ہی اُنھون نے کوہ و بیابان کا راستہ لیا - اور ایک مرغی ساتھ لیتے گئے یکایک ایک درۂ کوہ سے کُکڑون کون کی آواز آئی - اُنھون نے فوراً قریب جاکے مرغی چھوڑی جس کی آواز سنتے ہی مرغ نکل آیا - اور یہ فوراً کسی حکمت سے اُسے پکڑ لائے - اُس کی نسل ایسی تھی کہ پھر کبھی پالی مین اُنھین شرمندہ نہ ہونا پڑا -

مرغون کی لڑائی کا شوق یہان نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک برابر رہا - نواب آصف الدولہ کو بے انتہا شوق تھا - نواب سعادت علی خان باوجود

بیدار مغزی کے مرغ بازی کے دلدادہ تھے۔ اُن کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے اُمرائے دربار درکنار اُس زمانے میں جو اہلِ یورپ یہاں موجود تھے اُنھیں بھی یہی شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ جنرل مارٹن جن کی کوٹھی لکھنؤ کی ایک قابلِ دید عمارت اور یوروپین بچوں کی درسگاہ ہے اول درجے کے مرغ باز تھے۔ اور نواب سعادت علی خان اُن سے بازی بد کے مرغ لڑایا کرتے۔

لکھنؤ میں مرغوں کی لڑائی کا یہ طریقہ تھا کہ مرغ کے کانٹے باندھ دیے جاتے۔ تاکہ اُن سے ضرر نہ پہونچا سکے۔ چونچ چاقو سے چھیل کے تیز اور نوکیلی کی جاتی۔ اور جوڑ کے دونوں مرغ پالی میں چھوڑ دیے جاتے۔ مرغ باز اُن کے پیچھے پیچھے رہتے مرغ کو دوسرے مرغ کے مقابلے میں چھوڑنا بھی ایک فن تھا جس میں یہ کوشش ہوتی کہ ہمارا ہی مرغ پہلے چوٹ کرنے کا موقع پائے۔ اب دونوں مرغ چونچوں اور لاتوں سے لڑنا شروع کرتے۔ مرغباز اپنے اپنے مرغ کو اُبھارتے اور اشتعال دیتے۔ اور چلّا چلّا کے کہتے "ہاں بیٹا شاباش ہے!" "ہاں بیٹا کاٹ!" پھر ہیں یہ مرغ اُنکی للکاروں اور بڑھاوں پر اس طرح بڑھ بڑھ کے لاتیں اور چونچیں مارتے کہ معلوم ہوتا جیسے سمجھتے اور اُنکے کہنے پر عمل کرتے ہیں۔ جب لڑتے لڑتے زخمی اور چُور ہو جاتے تو باتفاقِ فریقین تھوڑی دیر کے لیے اُٹھا لیے جاتے۔ یہ اُٹھا لینا مرغ بازی کی اصطلاح میں "پانی" کہلاتا ہے۔ اُس وقت مرغ باز اُنکے زخمی سروں کو پونچھتے۔ اُن پر پانی کی پھوہاریں دیتے۔ زخموں کو اپنے مُنہ سے چوستے۔ اور ایسی ایسی تدبیریں کرتے کہ چند منٹ کے اندر مرغوں میں پھر نیا جوش پیدا ہو جاتا اور تازہ دم ہو کے دوبارہ پالی میں چھوڑے جاتے۔ اسی طرح برابر پانی ہوتے رہتے۔ اور لڑائی کا خاتمہ چار پانچ روز بعد اور کبھی آٹھ نو روز بعد ہوتا جب ایک مرغ اندھا ہو جاتا یا ایسی چوٹ کھا جاتا کہ اُٹھنے کے قابل نہ رہے۔ یا اور کسی وجہ سے لڑنے کے قابل نہ رہتا تو سمجھا جاتا کہ وہ ہار گیا۔ یا دیا یہ ہوتا کہ مرغ کی چونچ ٹوٹ جاتی۔ اس صورت میں بھی جہاں تک بنتا مرغ باز چونچ باندھ کے لڑاتے۔

حیدرآباد کا کھیل یہاں کے خلاف بہت سخت ہے۔ وہاں کانٹے نہیں باندھے

جاتے بلکہ بعوض باندھنے کے چاقو سے چھیل کے برچھی کی آنی بنا دیے جاتے ہین
اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑائی کا فیصلہ گھنٹہ ہی ڈیڑھ گھنٹے مین ہو جاتا ہے۔ لکھنؤ
مین خارون کے باندھنے کا طریقہ غالبًا اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ لڑائی طول
کھینچے۔ اور زیادہ زمانے تک لطف اُٹھایا جا سکے۔

لڑائی کے لیے مرغون کی تیاری مین مرغ بازون کے کمالات غذا اور رداشت
کے علاوہ اعضا کی مالش۔ پھولی یعنی پانی کی پھوہار دینے چونچ اور خار بنانے
یا خار کے باندھنے اور کوفت کے مٹانے مین نظر آتے ہین۔ اس اندیشے سے کہ
زمین پر دانہ چُگنے مین چونچ کو نقصان نہ پہونچ جائے۔ اکثر اُنھین دانہ ہاتھ پر
کھلایا جاتا ہے۔

یہ شوق واجد علی شاہ کے زمانے تک زورون پر تھا۔ مٹیا بُرج مین نواب
علی نقی خان کی کوٹھی مین مرغون کی پالی ہوتی تھی۔ اور کلکتے سے بعض انگریز
اپنے مرغ لڑانے کو لایا کرتے تھے۔ بادشاہون کے علاوہ اور بہت سے رئیسون کو
بھی مرغ بازی کا شوق تھا۔ مرزا حیدر۔ بہو بیگم صاحبہ کے بھائی نواب سالار جنگ
حیدر بیگ خان۔ میجر سوارس جو نصیر الدین حیدر کے زمانے مین تھے اور خود
بادشاہ سے مرغ لڑاتے تھے۔ آغا برہان الدین حیدر۔ بھی مرغ بازی کے
شائق تھے۔ آخر الذکر رئیس کے وہان آخر زمانے تک دو اڑھائی سو مرغ
رہتے۔ نہایت ہی صفائی اور نفاست سے رکھے جاتے۔ دس بارہ آدمی اُنکی
داشت پر مامور تھے۔ میان داراب علی خان کو بڑا شوق تھا۔ نواب گھسیٹا نے
بھی اس شوق کو آخر تک نباہا۔ ملیح آباد کے معزز پٹھانون کو بھی بہت شوق
تھا۔ اور اُنکے پاس اصیل مرغون کی بہت اچھی نسلین محفوظ تھین۔ یہان مشہور
مرغ باز جو اپنے فن مین اُستاد یگانہ مانے جاتے۔ بہت سے تھے۔ میر امداد علی۔
شیخ گھسیٹا۔ منور علی جن کو یہ کمال حاصل تھا کہ مرغ کی آواز سُن کے بتا دیتے کہ
بازی لے جائے گا۔ صفدر علی۔ اور ایک اول درجے کے وثیقہ دار سید میرن صاحب
بھی مشہور تھے۔ اس آخری زمانے مین مندرجہ ذیل لوگون کا نام مشہور ہوا۔ فضل علی
جمعدار۔ قادر۔ جیون خان۔ حسین علی۔ نوروز علی۔ نواب محمد تقی خان جو ہیبا نشہ

کے ایک عالی مرتبہ رئیس تھے - میان جان - دل - چھنگا - حسین علی بیگ - آغا حسین
ان مین سے اب کوئی زندہ موجود نہین ہے -

یہی لوگ ہین جنھون نے مرغ بازی کو یہان انتہائی کمال کے درجے پر پہونچا کے دکھا دیا - مگر میرا خیال ہے کہ فی الحال مرغ بازی کا شوق حیدرآباد دکن مین بڑھا ہوا ہے - وہان کے بہت سے امیرون جاگیردارون اور منصب دارون کو شوق ہے اور اُن کے پاس مرغون کی نسلین بھی بے مثل ہین - جن کی وہ بہت حفاظت کرتے ہین -

(۲) بٹیر بازی

بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ مین پنجاب سے آیا - پنجاب کے بعض کنچن لوگ جن کی عورتین عصمت فروشی کا پیشہ کرتی ہین نواب سعادت علی خان کے عہد مین وارد لکھنؤ ہوے - اور گھاگس بٹیر اپنے ساتھ لائے - جنکو وہ لڑاتے تھے - آجکل کی بعض نامور رنڈیان اُنھین لوگون کی نسل سے ہین - بٹیرون کی دو قسمین ہوتی ہین - ایک گھاگس اور دوسری چِننگ - پنجاب مین صرف گھاگس بٹیر ہوتا ہے - وہ چننگ سے بڑا زبردست اور طاقتور ہوتا ہے - لکھنؤ مین گھاگس اور چننگ دونون ہوتے ہین - چننگ گھاگس سے قد مین چھوٹا اور نازک ہوتا ہے مگر لڑنے مین زیادہ مضبوط اور بہت جیالا ہوا کرتا ہے - اور اُس کی لڑائی زیادہ شاندار اور خوبصورت ہوتی ہے - بہرحال اس بات کا پتہ لکھنؤ ہی مین لگا کہ لڑانے کے لیے چننگ بٹیر زیادہ موزون ہے -

بٹیر کی لڑائی کے لیے نہ کسی بڑے میدان کی ضرورت تھی نہ گھر سے باہر نکل کے صحن تک بھی آنے کی - بلکہ کمرے کے اندر ہی صاف ستھرے فرش پر تہذیب کے ساتھ بیٹھ کے اسکی لڑائی کی سیر دیکھی جا سکتی ہے - اس لیے لکھنؤ کی سوسائٹی نے اسی کو بہت پسند کیا - نہایت نفیس - خوبصورت - اور سبک کابکین بٹیرون کے لیے ایجاد کی گئین جو ہاتھی دانت کی ننھی ننھی گُلمزیون سے آراستہ کی جاتین اور اُن مین بٹیر رکھے جاتے -

اس کا کھیل یون ہے کہ پہلے مُوٹھ یعنی پانی مین بھگو بھگو کے گھنٹوں ہاتھون

بن دبائے رہنے سے اُس کی وحشت دُور ہو جاتی ہے - یہان تک کہ وہ بولنے اور چونچین مارنے لگتا ہے - اس کے بعد بھوک دے کے اور دست آور اجزا جن مین مصری بہت مخصوص ہے دے دے کے اُس کا جسم درست کیا جاتا ہے - پھر رات گئے یا آدھی رات کو اُن کے کان مین چلا کے "کو" کہا جاتا ہے - جسے کوکنا کہتے ہین غرض ان تدبیرون سے چربی چھنٹ جاتی ہے - بعدازین دُور ہو جاتا ہے - اور جسم نہایت ہی پھرتیلا اور قوی ہو جاتا ہے - یہی بٹیر کی تیاری ہے - اور ان باتون مین جس قدر زیادہ پورا ہے اُسی قدر سمجھیے کہ لڑائی کے لیے زیادہ موزون ہے -

لڑائی کے وقت فرش پر چارون طرف ہلکا ہلکا دانہ چھڑکا دیا جاتا ہے اور بٹیر کابک سے نکالے جاتے ہین - پہلے دونون بٹیرون کی چونچین چاقو سے بنا کے خوب تیز کر دی جاتی ہین - اسکے بعد ایک دوسرے کے مقابل چھوڑ دیے جاتے ہین - بٹیر کی لڑائی مرغ سے ملتی ہوئی ہے - چونچ سے کاٹتا اور پنجون سے لات مارتا ہے - چونچ سے حریف کے مُنہ کو زخمی اور اُتو کر دیتا ہے - اور پنجون سے بعض وقت حریف کا پوٹا تک پھاڑ دیتا ہے - لڑائی پندرہ بیس منٹ یا کبھی اس سے زیادہ دیر تک رہتی ہے - اور آخر مغلوب حریف بھاگ کھڑا ہوتا ہے - اور بھاگنے کے بعد پھر وہ کسی بٹیر کے سامنے لڑائی مین نہین ٹھہرتا -

بٹیر کی ترقی کے تین درجے ہین اور اُس کی ناموری کے تین دَور سمجھے جاتے ہین - اول نیا جو پکڑ کے اور پہلے پہل مانوس کر کے لڑایا جاتا ہے - اگر وہ بہت سی لڑائیون مین جیتا اور نہ بھاگا تو لڑائی کی فصل ختم ہوتے ہی معمولی پنجرون مین چھوڑ دیا جاتا ہے - یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب وہ پُرانے پر جھاڑ کے نئے نکال لاتا ہے - اسے کریز بٹھانا کہتے ہین - یہ زمانہ ختم ہوتے ہی دوسرے سال اُس کی ترقی کا دوسرا درجہ اور دَور ہوتا ہے - اور اُسے نوکار کہتے ہین - پھر اس کے بعد دوبارہ کریز بٹھا کے جب تیسرے سال وہ لڑائی کے لیے تیار کیا جاتا ہے تو کُریز کہلاتا ہے - اور یہ اُسکی ترقی کا تیسرا دور اعلیٰ درجہ ہے -

عموماً تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لڑائی مین نوکار نئے سے اور کُریز نوکار سے زبردست ہوتا ہے - نیا بٹیر کُریز سے دو چونچین بھی مشکل سے لڑ سکتا ہے - اعلیٰ درجے کے بٹیر باز

اور شوقین رئیس صرف کریزون کو لڑاتے ہین - اور نئے بٹیرون کا لڑانا بالکل معمولی کھیل ہے - لڑائی مین طرح طرح کے فریب وفن بھی کیے جاتے ہین - بعض لوگ اپنے بٹیر کے منہ پر کبھی کوئی ایسی کڑوی اور زہریلی چیز یا عطر لگا دیتے ہین کہ دوسرا بٹیر دو ایک چونچین مارتے ہی پیچھے ہٹنے اور لڑائی سے منہ موڑنے لگتا ہے - اور اگر اس پر بھی لڑتا رہا تو لڑائی کے بعد مر جاتا ہے - بعض لوگ کیف کا کھیل کھیلتے ہین - یعنی لڑائی سے ایک ساعت پہلے اپنے بٹیر کو کوئی ایسی تیز نشے والی چیز کھلا دیتے ہین کہ وہ لڑائی مین بیچین ہو کے بھاگنا بھول جاتا ہے - اور جب تک حریف کو پالی سے نہ بھگا دے بھنوؤن کی طرح لڑتا رہتا ہے -

لکھنؤ مین بٹیر بازی کے شوق نے ایسے ایسے باکمال بٹیر باز پیدا کر دیے جن کا کہین نظیر نہین مل سکتا - بعض لوگون نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کسی کے اچھے نامی بٹیر کو ایک نظر دیکھا اور کسی معمولی بٹیر کی ویسی ہی صورت بنا دی - اور کسی موقع پر باتون باتون مین بدل لیا - خیر یہ تو ایک بیہودہ چوری تھی مگر بعض اُستادون نے یہ کمال حاصل کیا کہ بھگنے بٹیرون کو تیار کر کے اچھے اچھے کریزون سے لڑا دیتے اور بازی لے جاتے - کیف کے کھیل والے اُستادون مین ایک صاحب کیف کی نہایت اعلیٰ درجے کی گولیان تیار کرتے جو سو روپئے کی دس گولیان بکتین - اور لوگ شوق سے لے جاتے -

ان لوگون کی سب سے بڑی اُستادی بٹیرون کے علاج مین نظر آتی ہے - اور ایسے ایسے بیمار اور از کار رفتہ بٹیرون کو درست کر لیتے ہین اور اس خوبی سے اُن کے مرض کی تشخیص کرتے اور مناسب اجزا استعمال کراتے ہین کہ اطبا اور ڈاکٹر حیرت مین رہ جائین - اس کی بہت کوشش کی گئی کہ بٹیرون کو پال کے انڈے سے بچے دلوائے جائین مگر اس مین کامیابی نہ ہوئی -

بٹیرون کے نام بھی بڑے بڑے شاندار رکھے گئے - جیسے رستم - سہراب - شہرۂ آفاق - پالیون مین بڑی سے بڑی بازیان بدی جاتی ہین - اور ایک ہزار روپیہ تک کی بازی مین نے خود دیکھی ہے - اس کا شوق بھی بعض بادشاہون کو رہا نصیرالدین حیدر اپنے سامنے میز پر بٹیرون کی لڑائی دیکھ کے خوش ہوتے تھے -

پرانے بٹیر بازون مین میر بچو - میر محمدو - خواجہ حسن - میر فدا علی - چھنگا - میر عابد اور سید ببرن کے نام یادگار ہین - آج سے چالیس سال پہلے مٹیا برج ہین مین داروغہ غلام عباس - چھوٹے خان - اور غلام محمد خان خالص پوربی کو جو بڑے معمر اور سن رسیدہ لوگ تھے اس فن مین نہایت باکمال پایا تھا - غالب علی بیگ - مرزا اسد علی بیگ - نواب مرزا - میا جان - شیخ مومن علی - اور غازی الدین خان نے بھی آخر عہد مین بہت ناموری حاصل کی تھی -

بٹیرون کا شکار بھی لکھنؤ والون کے لیے بڑی دلچسپی کی چیز ہے - پہلے اس مین صرف شوقینی تھی جس کی بدولت بہت سے مہین آدمی جنھون نے کبھی شہر سے باہر کی سواد نہین دیکھی تھی کھیتون اور جنگلون کی ہوا کھا آتے تھے - مگر اب اسی پر بہتون کی روٹیان چلتی ہین -

کہتے ہین کہ بٹیر پہاڑون سے رات کو نکلتے اور اوپر کی فضا مین اڑتے ہوے جاتے ہین - شکار کے شوقین بڑی آواز سے بولنے والے بٹیرون کو تیار کرتے ہین جو برابر رات بھر بولتے رہتے ہین - ایسے بٹیرون کو پھندیت کہتے ہین - کسی ارہر کے کھیت کے اطراف مین اکثر جال پھیلا دیا جاتا ہے - پھندیتون کی آواز سن کے بٹیر اوپر سے اترنا اور گرنا شروع ہوتے ہین - اور رات بھر مین بہت سے جمع ہو جاتے ہین - صبح ہوتے ہی وہ سب طرف سے ہنکا کے جال کی طرف بھگائے جاتے ہین - جس مین پھنستے ہی پکڑ پکڑ کے پٹکون مین بند کر لیے جاتے ہین -

(۴۰) تیترون کی لڑائی -

یہ بھی دلچسپ ہے - تیتر اور بٹیر کی بہ نسبت اچک اچک کے لڑتا ہے - مگر اس کا شوق سوا دیہاتی لوگون اور ادنے درجے والون کے امرا و شرفا کو کبھی نہین رہا - تیتر لوٹے سے اور دوڑا دوڑا کے تیار کیے جاتے ہین - ان مین جوش اور غصہ پیدا کرنے کے لیے ان کو دیمک کھلائی جاتی ہے - مگر یہ کوئی بڑا کھیل نہین ہے - اور نہ مہذب سوسائٹی مین اختیار کیا گیا - ہان لکھنؤ کے ادنیٰ طبقے والون مین کثرت سے رہا - اور ہے -

(۴۱) لووَن کی لڑائی

لوا چھوٹے قسم کا تیتر ہے جو بٹیر سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ بجائے دانے کے سدا یعنی مادہ پر لڑا کرتا ہے۔ اُسے لڑانا ہوتا ہے تو مادہ کا پنجرا لاکے سامنے رکھدیا جاتا ہے۔ اس کا شوق ریاست ریوان وغیرہ مین لوگون کو زیادہ تھا لکھنؤ مین بھی پسند کیا گیا اور ایک حد تک اختیار کیا گیا۔ لوے کی لڑائی سچ یہ ہی کہ بٹیر سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ وہ گُندے کھول کے لڑتا اور گُتھ جاتا ہی اور پھول کی طرح کِھل کِھل کے اُٹھتا اور گرتا ہے۔ لکھنؤ کے بعض امرا کو اس کا شوق ہو گیا تھا۔ مٹیا برج مین واجدعلی شاہ مرحوم کی سرکار مین ایک بڑے اُستاد لوے لڑانے والے تھے۔ جنھون نے بہت اچھی اچھی جوڑین تیار کی تھین۔ اور جب اُنھین سامنے لاکے لڑاتے تو بڑا لطف آتا۔ لوؤن کی تیاری بھی زیادہ تر لوٹ اور بھوک سے ہوتی ہے۔ اور اس کی لڑائی کا رواج بٹیر کے پیشتر سے تھا۔ مگر آخر مین بٹیربازی کا اس قدر رواج ہوا کہ لوے کا شوق پھیکا پڑ گیا۔ اس کا شکار بھی عجیب طریقے سے ہوتا ہے۔ یہ بھی بٹیر کی طرح اوپر کی فضا مین اُڑتا ہوا جاتا ہی۔ لوگ ببر کے پھندیتون کی سی چھر پر ایک گھڑا باندھ دیتے ہین۔ اس کے مونھ پر جھلی منڈھ کے ایک سینک مین ڈورا باندھ کے اُس سینک کو جھلی مین چبھو کے اندر لٹکا دیتے ہین۔ اور اُس ڈورے کو ہاتھ سے سُوتنا شروع کرتے ہین۔ جھلی سے ایک بے ہنگم بھون بھون کی آواز نکلنا شروع ہوتی ہے جو لوؤن کو اس قدر پسند ہے کہ اُڑتے اُڑتے نیچے اُتر پڑتے ہین۔ اور صبح کو جال مین پھنس کے بٹیرون ہی کی طرح پکڑ لیے جاتے ہین۔

(۵) گُلدم لڑانا

گُلدم کو عوام بُلبل کہتے ہین مگر یہ غلطی ہے۔ بلبل بدخشان و عجم کی ایک نغمہ سنج چڑیا ہے۔ اور اس چڑیا کی دُم کے نیچے ایک سرخ گُل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا نام گلدم رکھا گیا ہے۔ اسکی لڑائی بھی دیہاتیون اور بازاری لوگون مین زیادہ ہے۔ شایستہ سوسائٹی نے اُسے کبھی دلچسپی کی نظر سے نہین دیکھا۔ مگر اُسکی لڑائی لطف سے خالی نہین ہوتی۔ وہ اپنے پر لڑتے ہین۔ اور لڑائی مین دونون حریف کرتے ہوے اُوپر اُڑتے اور گُتھ کے گرتے ہین۔

(۶) لال لڑانا

لال صرف پنجروں میں رکھ کے پالنے کے لیے ہیں لڑائی کے لیے موزوں نہیں۔ مگر نفس پرست انسان نے انھیں بھی لڑا کے دو گھڑی دل بہلا لیا۔ لالوں کا پہلے تو اس حد تک مانوس بنانا مشکل ہوتا ہے کہ پنجڑے کے باہر نکال کے چھوڑے جائیں اور اُڑ نہ جائیں۔ دوسرے اُنھیں اس قدرمست بھی ہونا چاہیے کہ دوسرے لال سے لڑنے کو تیار ہو جائیں۔ چنانچہ اُن کا لڑ جانا ہی دشوار ہوتا ہے۔ مگر جب لڑ گئے تو خوب گتھم گتھا کے اور اُڑ اُڑ کے لڑتے ہیں اور بڑی دیر تک لڑتے رہتے ہیں۔ لالوں کی لڑائی دوسرے چھوٹے طیور کی لڑائی کی بہ نسبت دیرپا کم رہتی ہے۔ لالوں کی لڑائی کا شوق اہلِ لکھنؤ میں بہت کم رہا۔ صرف دو ہی ایک اُستاد پیدا ہوئے جنھوں نے لڑایا ورنہ عام رجحان اسکے خلاف تھا۔ اور اُس کے شوقین بھی عوام اور بازاری ہی تھے۔

(۷) کبوتر بازی

کبوتر اُن مانوس جانوروں میں ہیں جن کا شوق لوگوں کو قدیم زمانے سے لے کے آج تک ہر ملک اور ہر سرزمین میں کسی نہ کسی حد تک ضرور رہا۔ کبوتروں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں اُڑنے والے گرہ باز اور گولے ہوتے ہیں۔ اور جو محض خوبصورتی اور خوش رنگی کے لحاظ سے پالے جاتے ہیں۔ اُن میں شیرازی گلی۔ نساوری۔ گلوسے۔ لقے۔ لوٹن۔ اور چوا چندن وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ یاہو کبوتر رات دن کو بجنے اور "یا ہو" کا دم بھرنے کی وجہ سے عبادت گذاروں کو زیادہ پسند تھے۔ اور اکثر فقرا و مشائخ کو اُن کا شوق تھا۔

سنتے ہیں کہ گرہ باز پہلے پہل کابل سے لائے گئے۔ پہلے عموماً وہی اُڑائے جاتے تھے گولے بعد کو آئے جن کی نسل عرب و عجم اور ترکستان سے آئی۔ گرہ باز کی یہ شان ہے کہ صبح کو اُڑے تو گھنٹوں مکان کے عین محاذی آسمان پہ چکر لگاتے رہے۔ اس طرح کہ صحن کے اندر لگن میں پانی بھر کے رکھ دیجیے تو اُس میں ہمیشہ نظر آتے رہیں گے۔ بعض دن دن بھر اُڑتے رہتے ہیں۔ اور شام کو اُترتے ہیں۔ اپنے مکان کے پہچاننے اور وطن پرستی کے دلدادہ ہونے میں

گرہ باز اتنا کمال رکھتے ہیں کہ خود میرے یہاں کا ایک کبوتر کسی کے وہاں پھنس گیا تھا جس نے پر کاٹ دیے۔ تین سال کے بعد جب اُسے موقع ملا اور پر نکل آئے تو واپس آیا۔ اور اپنے خانے میں گھس کے اُس کبوتر سے لڑنے لگا جو اب اُس میں مقیم تھا۔

لیکن گرہ باز کی دس بارہ سے زیادہ کی ٹکڑی نہیں اُڑتی۔ لوگوں کو سَو سَو دو دو سو کبوتروں کی ٹکڑیاں اُڑانے کا شوق ہوا تو گولے اختیار کیے گئے۔ کبوتر بازی کا فن دہلی ہی میں اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ کہتے ہیں آخری وارث دولت مغلیہ بہادر شاہ کی سواری نکلتی تو دو سو کبوتروں کی ٹکڑی اوپر ہوا میں سواری کے ساتھ اُڑتی ہوئی جاتی اور جہاں پناہ پر سایہ کیے رہتی۔

کبوتر کو اپنے گھر سے بہت زیادہ اُنس ہوتا ہے۔ کابک کو ٹھیلے پر رکھ کے لیجاتے اور جہاں کہا جاتا روک کے اُڑاتے اور پھر کابک پر بُلا لینے کا کمال بھی دہلی ہی میں پہلے نظر آ چکا تھا۔

لکھنؤ میں کبوتر بازی اس خاندان فرماں روائی کے ابتدائی دَور ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ نواب شجاع الدولہ کو کبوتروں کا بڑا شوق تھا۔ سید یار علی نام ایک شخص نے جو بریلی کا رہنے والا تھا آپ کو ایک کامل کبوتر باز کی حیثیت سے دربار میں پیش کیا اور اُنکی بڑی قدر کی گئی۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں کو بھی شوق تھا۔ اور غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تو کبوتر بازی یہاں بہت اعلیٰ درجے پر پہونچ گئی تھی۔ میر عباس نام یہاں کے ایک کامل فن کبوتر باز نے یہ کمال دکھایا کہ جو کوئی پانچ روپئے نذر کرکے اُن کی دعوت کرنا چاہے وہ کہیں رہتا ہو کابک لے کے پہونچ جاتے اور اُسی کے گھر سے کبوتر اُڑا دیتے۔ اُڑاتے اور سیٹی پر بلا لیتے۔ مجال کیا کہ کوئی کبوتر کسی اور جگہ گر جائے۔ شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بعض امیروں کے ہاں صرف نو سو کبوتریاں ایک ساتھ اُڑتیں۔ اور بعض رئیس اتنے ہی یا اس سے زیادہ تعداد میں نر کبوتر اُڑاتے۔

خوست (علاقہ سرحدی افغانستان) سے "چپت" نام ایک خاص رنگ کے کبوتر آئے تھے۔ جو نہایت قیمتی تھے۔ اکثر رئیس ہزاروں روپیہ صرف کرکے اُنھیں کو اُڑاتے۔

ایک جدت پسند بزرگ نے لکھنؤ مین یہ کمال کیا کہ کبوتر کے دو بچون کو لے کے ایک کا داہنا اور ایک کا بایان بازو کاٹ دیا۔ اور کٹے ہوے بازوون کی جگہ اُن دونون مین ٹانکے لگا کے ایک دوہریا کبوتر بنا لیا۔ اور اسی درشت سے پالا کہ وہ بڑے ہوے اور اُڑنے لگے۔ ایسے بہت سے دوہریا کبوتر تیار کیے۔ اکثر معمول تھا کہ جب نصیر الدین حیدر چھتر منزل سے بجرے پر سوار ہو کے پار جاتے اور کوٹھی دلآرام مین بیٹھ کے دریا کی سیر دیکھتے وہ اس پار سے اپنے اُن عجیب الخلقت دوہریا کبوترون کو اُڑا دیتے جو پار جا کے بادشاہ کے قریب بیٹھ جاتے۔ بادشاہ اُنھین دیکھ کے بہت محظوظ ہوتے۔ اور انعام دیتے۔

میر امان علی نام ایک بزرگ نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کبوتر کو رنگ کے جیسا چاہتے بنا دیتے۔ اکثر جگہ پر اُکھاڑ کے دوسرے رنگ کا پر اُسی کے سوراخ مین رکھ کے اس طرح جما دیتے کہ وہ اصلی پرون کی طرح جم جاتا۔ اور بہت سے مقامات پر رنگ سے کام لیتے۔ مگر ایسا مضبوط اور پختہ رنگ کہ مجال کیا جو ذرا پھیکا بھی پڑ جائے۔ برس بھر تک رنگ قائم رہتا۔ مگر جب کُریز مین پر گر جاتے تو پھر اصلی رنگ نکل آتا۔ اُن کے ان کبوترون مین سے ہر ایک پندرہ بیس روپیے کو بکتا۔ اور امرا بڑے شوق سے لیتے۔ وہ پیا تیہ بھی بنا لیا کرتے جو لاکھون مین ایک نکلتا ہے۔ اور رنگ کے حدود اور گلُون کے اعتبار سے بے مثل ہوتا ہے۔

ایک بڑے کبوتر باز نواب پالے تھے جو گرہ باز کبوترون کو گولون کی طرح اُڑاتے کمال یہ تھا کہ جس جگہ اور جس مکان پر چاہتے چھیپی کے اشارے سے بازی کرا دیتے یعنی کبوتر ہوا مین قلابازیان کھانے لگتے۔

واجد علی شاہ نے مٹیا برج مین بہت سے نئے کبوتر جمع کیے تھے۔ کہتے ہین کہ ریشم پرے کبوترون کا جوڑا پچیس ہزار کو لیا تھا۔ اور ایک قسم کے سبز کبوترون کی نسل بڑھائی تھی۔ جب انتقال ہوا ہے تو چوبیس ہزار سے زیادہ کبوتر تھے۔ جن پر سیکڑون کبوتر باز نوکر تھے۔ اور اُن کے داروغہ غلام عباس کبوتر بازی کے فن مین جواب نہ رکھتے تھے۔

شوقین اور فن دانی نے پالنے کے رنگین کبوترون مین بھی بے مثل ترقی کی تھی

یہ صرف مشہور نہیں ہے بلکہ ایسا شیرازی جو گز بھر کے پنجرے کی وسعت کو بھرلے۔ اور
ایسا گلی جو ایک بارہ برس کی لڑکی کی چوڑی مین سے نکل جائے میں نے خود اپنی
آنکھ سے دیکھے ہین۔ (یہ ذکر ابھی ختم نہین ہوا۔ باقی آیندہ نمبر مین عرض کرون گا)

(۲۰)

طیور کو لڑا لڑا کے دلچسپی پیدا کرنا اور تفنن کے کمالات دکھانا لکھنو کے بیفکرون کا نہایت ہی عام مشغلہ ہوگیا تھا۔ کبوترون اور بٹیرون کے تیار کرنے اور لڑانے مین اُنھون نے اس قدر ترقی کی کہ اب ہندوستان کے جس شہر مین اور جہان کہین کسی رئیس کو ان چیزون کا شوق ہے (اور کمبخت شوق نا عاقبت اندیش دولتمندون مین اکثر ہوا کرتا ہے) وہان اُستاد لکھنؤ ہی سے بلائے جاتے ہین اور اِس مد کا سارا کارخانہ اُنھین کے زیر اہتمام ہوتا ہے۔

توتے

طیور لڑانے کے حد سے گذرے ہوے شوق نے اُس مین جدتین پیدا کرنا شروع کین۔ اور بعض شوقینون کا خیال اس جانب مبذول ہوا کہ جو کام کبوترون سے لیا جاتا ہے اور کن کن طیور سے لیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ میر محمد علی نام ایک بزرگ نے توتون سے کبوترون کا کام لینے مین نمایان کامیابی حاصل کی۔

توتا فطرۃً نہایت ہی بیوفا جانور ہے۔ زندگی بھر رکھیے اور پالیے لیکن پنجرے سے اُڑا تو پھر اُدھر کا رُخ نہین کرتا۔ توتا چشمی نام ہی بے وفائی کا ہو گیا ہے۔ وہ بولتا ہے۔ باتین کرتا ہے۔ جانورون کی بولیان اُڑا لیتا ہے۔ جو فقرے یاد کرا دیجیے اُن کی رٹ لگاتا ہے۔ مگر اُڑانے کے کام کا نہین۔ اس لیے کہ پنجرے سے چھوٹتے ہی پھر وہ کسی کے بس کا نہین ہوتا۔ مگر میر صاحب موصوف نے خدا جانے کس تدبیر سے اُس کی فطرت بدل دی تھی کہ دس بار توتون کی ٹکڑی اُڑاتے۔ اور مجال کیا کہ وہ سیٹی بجا کے "آ" کرین اور وہ آسمان سے اُتر کے سیدھے پنجرے مین نہ چلے آئین۔ وہ ان توتون کو روز حسین آباد مین لاکے اُڑاتے۔

طیور کی ان تیاریون کا حال بیان کرکے ہم یہ کہنے پر مجبور ہین کہ اہل لکھنؤ نے جتنی محنت طیور کی تیاری مین کی ہے کاش خود اپنی اور اپنے جسم کی تیاری مین کرتے

تو یہ انجام ہرگز نہ ہوتا جو ہوا۔

پتنگ بازی

کنکوے اُڑانے کا شوق کسی نہ کسی حد تک سارے ہندوستان میں ہے۔ اور آج کل عموماً لڑکوں اور نوجوانوں کا نہایت ہی دلچسپ کھیل ہے۔ اسکی کثرت اور تعمیم دیکھ کے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان کی بہت پُرانی چیز ہوگی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ فن ایک صدی پیشتر کا بھی مشکل سے کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کا مرکز ترقی لکھنؤ ہی ہے۔

یورپ میں لڑکے ایک قسم کے کپڑے کے کنکوے اُڑایا کرتے ہیں۔ جن کو جب تک ڈور پکڑکے بھاگتے رہو اُڑتے ہیں۔ اور ادھر قدم رُکا اور اُدھر وہ زمین پر آ رہے۔ اُن کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کب سے ہیں؟ اور کہاں سے لیے گئے؟

سُنا جاتا ہے کہ دہلی میں شاہ عالم بادشاہ اول کے عہد میں یہ شوق شروع ہوا ابتداءً بعض خاص خاص لوگ چنگ اُڑایا کرتے تھے۔ چنگ بڑے اہتمام سے بنایا جاتا تھا۔ اس میں دو تکلیں تھوڑے فصل سے آگے پیچھے برابر کھڑی کرکے جوڑ دی جاتیں۔ تکلوں کی شکل ( ) یہ ہوتی تھی جس میں تین طرف مدوّر کونے نکلتے۔ اُس میں ایک کھپاچ چھیل کے بیچ میں کھڑی لگائی جاتی جو ٹھڈا کہلاتی اور دو کھپاچیں خوب چھیل کے اور نرم کرکے اوپر نیچے لگائی جاتیں جو کانپیں کہلاتیں۔ اوپر کی کانپ کی وضع یوں ⌒ رہتی اور نیچے کی کانپ کی یوں ◡ ان کے درمیان میں ہلکا باریک کاغذ منڈھ دیا جاتا۔ یہ ایک تکل ہوئی۔ ایسی دو تکلوں کو آگے پیچھے رکھ کے اور درمیان میں جا بجا آڑی کھپچیاں لگا کے جوڑ دیا جاتا۔ اور چاروں طرف سے بھی کاغذ منڈھ کے ایک خاص وضع کی کُھلی قندیل بنا دی جاتی۔ جس کے اندر ایک کپڑے کا بنا ہوا تیل میں ڈوبا گیند تاروں میں باندھ کے لٹکا دیا جاتا۔ اور اُسے روشن کرکے رات کو لوگ مضبوط سوتی یا ریشمی ڈور پر اُڑاتے۔ چنگ کی شان یہ تھی کہ معلوم ہوتا ایک لالٹین آسمان پر اُڑ رہی ہے اور غبارے کے خلاف اُڑانے والے کے اختیار میں ہے۔ جب چاہیں اُڑائیں

اور جب چاہیں اُتار لیں۔ وہ ہوا میں قائم رہتا۔ کبھی اوندھا ہوتا تو پھر سیدھا ہو جاتا۔

اُسی زمانے میں بعض لوگ اسی وضع سے انسان کا ایک پُتلا بنا کے اُڑاتے بلکہ بعض قابل وثوق یادگاران سلف کا بیان ہے کہ سب کے پہلے وہ پُتلا ہی دہلی میں ایجاد ہوا تھا۔ پھر اُسی سے ترقی کرکے چنگ ایجاد ہوا۔ جس کا طول و عرض برابر ہونے کی وجہ سے اُڑانا اور ہوا میں ٹھہرانا زیادہ آسان تھا۔ اس کا شوق زیادہ تر ہندوون میں تھا۔ اور کیا عجب کہ اُنکے وہان کی قومی و مذہبی چیز ہوادان کاس دیا وغیرہ کے خیال سے ماخوذ ہو۔ پھر اُس چنگ کے کاٹنے کے لیے یا دن کو اُڑانے کے خیال سے تکل اُڑنے لگی۔ جو دراصل آدھا چنگ یا چنگ کی فقط ایک طرف کی دیوار تھی۔ تکل میں خوبی یہ تھی کہ بہ نسبت چنگ کے آسانی سے اُڑ سکتی تھی۔ اُس میں حلت پھرت تھی۔ آسمان پر ہوا میں ناچتی اور دُور ہوتی چلی جاتی تھی۔ چنگ ایک جگہ قائم رہتا۔ اور تکل ادھر اُدھر چلتی پھرتی تھی۔ اور اُس پر اتنا قابو تھا کہ جب چاہیں اُس کی ڈور سے رگڑا دیکے دوسرے کے چنگ کو کاٹ دین۔

تکل نے دراصل قندیل یا روشن پُتلا اُڑانے کا خیال بُھلا دیا۔ اور لوگون کو اس جانب متوجہ کیا کہ ہوا میں کوئی ایسی چیز اُڑائی جائے جو زیادہ قابو میں ہو۔ ادھر اُدھر آسمان پر دوڑے اور ناچے۔ تکل کا شوق مسلمان امیرون اور معزز ہندوون میں بڑھا۔ اُس پر دولت صرف ہونے لگی۔ اعلیٰ درجے کی تکل کا نام تُنکل مشہور ہوا۔ جس کا ٹھڈا مرشد آبادی بانس کا ہوتا۔ جس میں اسّی روپے لاگت آتی۔ بیس روپے کی جھل جھل ہوتی۔ دو روپے کا کاغذ لگتا۔ اور پانچ روپے بنوائی پڑتی۔ غرض ایک سو سات روپے میں ایک تُنکل تیار ہوتا۔

بہر حال دہلی میں تکل اور تُنکل ہی تک ترقی ہوئی تھی کہ قدردان دربار دہلی سے لکھنؤ میں منتقل ہوا۔ اور اُس کے ساتھ ہی زمانے کے شوقین بھی یہان چلے آئے۔ اب تُنکل اُڑانے سے تُنکل لڑانے کا شوق نکلا۔ ایسی زوردار تکلین بنائی جانے لگین جن کو معمولی قوت کا آدمی مشکل سے سنبھال سکتا۔ آٹھ آٹھ بل کی

مضبوط ڈور چرخیوں پر چڑھائی جاتی۔ اور اُنھیں چرخیوں کے ذریعے سے تکلّوں کا زور سنبھالا جاتا۔ لڑائی کی یہ شان تھی کہ وہ تکلّوں کی ڈور ایک دوسری میں ڈال کے دونوں طرف سے ڈھیل دی جاتی۔ وہ دونوں تکلیں چکر گھنی کھاتی ہوئی اوپر چڑھتی اور بلند ہوتی چلی جاتیں۔ اور دونوں طرف سے چرخیوں پر چرخیاں خالی ہوتی رہتیں۔ لکھنؤ کے شوق کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نواب آصف الدولہ کی تکل میں پانچ روپے کی مقیش کی جھلجھل ہوتی۔ جو لوٹ کے لاتا اُسے پانچ روپے دے کے تکل لے لی جاتی۔ اور نہ لاتا تو بھی جہاں چاہتا جھلجھل پانچ روپے کو بیچ لیتا۔

پتنگ بازی کے پُرانے نامی اُستاد لکھنؤ میں میر عمدو۔ خواجہ مٹھن۔ شیخ امداد تھے۔ ایک جولاہے نے بھی اُن دنوں اِس فن میں کمال حاصل کیا تھا جس کی وجہ سے امرا کی صحبتوں میں اُس کی بڑی قدر ہوتی۔

امجد علی شاہ کے زمانے میں یک بیک گُڈّی ایجاد ہوئی جس کی قطع لوزات کی سی ہوتی۔ وہ تکل کی بہ نسبت آسانی سے بنتی۔ تکل میں دو کانپیں اور ایک ٹھڈّا ہوتا تھا۔ گُڈّی میں صرف ایک ہی کانپ اور ایک ہی ٹھڈّا رہ گیا۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں ڈیڑھ کنّا کنکوا بن گیا۔ جس کی قطع موجودہ کنکوے کی تھی مگر نیچے تکل کی یادگار میں کاغذ کا چھوٹا سا پھُندنا ہوتا۔ اب نواب محمد حسین خان سالار جنگی۔ آغا ابو تراب خان اور دو ایک شوقین رئیسوں نے پھُندنے کی جگہ نیچے پتّہ لگا کے وہ کنکوا بنا دیا جو فی الحال مروج ہے۔ اور جس میں ابھی تک اور کسی ترقی کی گنجایش نہیں نظر آتی۔ فی الحال سارے ہندوستان میں پتنگ یا کنکوا یا پھُندنے دار کنکوا جو ڈیڑھ کنّا کہلاتا ہے اُڑتا ہے۔ مگر اس کی ایجاد لکھنؤ ہی میں ہوئی ہے۔ یہیں سے سب جگہ گیا اور مقبول عام ہوا۔

کنکوؤں کے لڑانے میں بھی پہلے تکل کی طرح ڈھیل کا رواج تھا۔ بڑے بڑے کنکوے بنتے اور سیروں ڈور پیٹے چلے جاتے۔ آخر شاہی اور آغاز انگریزی کے مشہور اُستاد ولایت علی جو ولایتی کہلاتے۔ الٰہی بخش ٹھڈّے جو مٹیا برج میں جا کے مشہور ہوے۔ اور لکھنؤ کے سیکڑوں باکمال اُستاد تھے جن کے نام سب مجھے

اس وقت نہین یاد آتے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ملڈورے پیچ لڑانے کے بادشاہ تھے۔
انگریزی کے آغاز مین کھینچ لڑانے کا رواج ہوا۔ اس کا آغاز نوا ُن چھوٹے لڑکون سے ہوا جن کے پاس تھوڑی سی ڈور ہوتی۔ اور دوسرے کے کنکوے مین پیچ ڈال کے اپنی بے ایگی سے بے تحاشا کھینچ جاتے اور کاٹ دیتے۔ پُرانے اُستاد اُن دنون ان لوگون کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اپنے کنکوون کو اُن سے الگ رکھتے۔ مگر آخر کار کھینچ ہی کنکوے بازی کا اعلیٰ ترین فن ہو گیا۔ جس مین بڑے بڑے اُستاد پیدا ہوے۔ اور آج لکھنؤ مین بیسیون اُستاد بیٹھے ہوے ہین جو اسی شوق مین لاکھون روپے اُڑا کے اُستاد بنے ہین۔ اور گھر بگاڑ کے اتنی فوقیت حاصل کی ہے کہ کنکوے کے میدانون مین بڑے شوق سے بُلائے اور ادب و تعظیم کے ہاتھون سے لے کے آنکھون پر بٹھائے جاتے ہین۔

(۲۱)

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہین کہ فن موسیقی کا اور اُسکے سلسلے مین ان لوگون کا جو اس فن سے وابستہ ہین لکھنؤ مین کیا حال رہا۔

گانا اُن چیزون مین سے ہے جن کو انسان کی فطرت نے سب سے پہلے ایجاد کیا۔ جن الفاظ کے ادا کرنے مین جوش ظاہر کرنے کو جی چاہا لوگ گانے لگے۔ اور جن حرکات و افعال مین جذبات نے اُبھارا ناچنا شروع کر دیا۔ اور چونکہ سب سے زیادہ جوش و شیفتگی انسان کی عبادت مین ہوتا ہے اور دنیوی امور مین سب سے زیادہ بے اختیاری کا ناقابل برداشت جوش عشق و محبت کے اظہار مین ہوتا ہے۔ اس لیے گانے کا آغاز بھی ابتداءً عبادت و عشق مین ہوا۔ ہندوستان مین گانے کا آغاز قطعاً عبادت سے ہوا۔ اس لیے کہ یہان کے پہلے گویّے خاص برہمن تھے۔ جو ابتداءً عبادت کرنے اور کراتے وقت اپنے معبودون کی تعریف کے بھجن گایا کرتے۔ کنھیا جی کی ولادت نے اُن کی محبت اور اُن کے عشق کو عبادت بنا کے عاشقہ موسیقی ایجاد کی۔

اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان مین شاعری اور موسیقی دونون کا اظہار عورت کی زبان سے ہوا کرتا ہے۔ ابتداءً برہمن فقط گیت اور سنگیت یعنی سیدھے سادے

گانے گایا کرتے تھے - جن مین فن کی ترقیون کا ذرا بھی شائبہ نہ تھا - مگر بعد کو مصریون یا بابلیون اور ایرانی محققون کے مذاق کی آمیزش سے ایک فن کی بنیاد پڑی - اور سب سے پہلے سات سُر ایجاد ہوے - اس لیے کہ ہر آواز پھیلنے مین ایک حد پر پہونچ کے بدل جاتی ہے - ان تبدیلیون کا صحیح اندازہ کر کے محققین نے سات سُر ایجاد کیے -

اس کے بعد ہندوستان مین موسیقی کی تقسیم اس حیثیت سے ہوئی کہ جو راگ عبادت مین گائے جاتے وہ یا تو برہما (پیدا کرنے والی قوت الٰہی) کی منقبت مین ہوتے یا بشن (چلانے اور پالنے والی قوت الٰہی) کی تعریف مین ہوتے - یا مہیش یعنی مہادیو (مارنے والی قوت الٰہی) کی مدح مین ہوتے - اسی لحاظ سے تین قسم کے راگ بن گئے - پہلی قسم کے راگون کی نسبت کہا جاتا ہے کہ برہمنون نے کسی کو نہ بتائے اور اپنے ساتھ لے کے مر گئے - جو راگ تمام مراحل زندگی زچہ خانے - شادی - اور دنیا بھر کے کاروبار کے متعلق تھے وہ دوسری قسم کے راگ قرار پائے - آخری قسم کے راگ مابعد الموت کی حالت اور ثواب وعقاب سے وابستہ تھے - وہ اکثر مہیب خوف دلانے والے اور دل پر عالم کے فانی ہونے کا اثر ڈالنے والے ہوتے - عاشقانہ راگ بھی محض اس لیے کہ عاشق مرگ کا خواہان ہوتا ہے اسی قسم مین شامل کر دیے گئے - خصوصاً اس لیے کہ کنھیا یا سری کرشن جی مہادیو ہی کا ایک اوتار تھے - اس قسم کے راگ عموماً "پروگ" کہلاتے - اُن کے راگ بھیرون - سرس راگ - اور راگنیان بھیروین - پرچ - کالنگڑا - سوہنی سندھ - پیلو وغیرہ ہین -

اس کے بعد جب برہمنون کو راجاؤن کے دربار مین اُن کی مدح کے قصائد گانا پڑے تو اُن کے مناسب رعب داب اور سطوت و شوکت کے راگ ایجاد ہوے - جیسے مالکوس - درباری - شاہانہ (اڈانہ) وغیرہ -

مسلمان اپنے ساتھ اپنا موسیقی لائے تھے - اُن کا موسیقی سب کے پہلے ابن مسجح نے مدوّن و مکمل کیا تھا - اُس کے بعد جب عراق مین عباسی دربار قائم ہوا تو عربی اور فارسی موسیقی سے مل کے ایک نیا اور نہایت مکمل فن غنا ایجاد ہوا

جو ساری دنیا مین پھیل گیا۔ اور وہی آخر مین عجمی موسیقی تھا۔ مسلمان اُسی فن کو ہندوستان مین لائے۔ اور جو گوئیے اُنکے ساتھ یہان آئے تھے اُنھین کی یادگار آج کل قوّال ہین۔ اُن کے آلات طرب سرود۔ چنگ۔ شہنائی (سینائی) بربط اور رباب ہین

ہندوستان مین ہر چیز پر مسلمانون نے اپنا اثر ڈالا۔ تمام علوم و فنون۔ اور معاشرت کی تمام باتون کو بدل دیا۔ مگر یہان موسیقی پر بہت کم اثر ڈال سکے جس کی وجہ عموماً یہ خیال کی جاتی ہے کہ خود یہان کا موسیقی اس قدر باضابطہ اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ اپنی مضبوطی و باقاعدگی کے باعث بیرونی اثر سے متاثر ہی نہ ہوسکا۔ لیکن حقیقت حال اور اُس کا اصلی باعث یہ ہے کہ کسی ملک اور زبان کی موسیقی کی طرف انسان اسوقت توجہ کرتا ہے جب اُس ملک کا باشندہ بن لے اور وہان کی زبان و معاشرت کا رنگ اُسپر چڑھ جائے لہذا یہان آنے کے بعد حملہ آور مسلمان جب تک عربی یا عجمی رہے یہان کے موسیقی کی طرف توجہ نہ کی۔ اور جب توجہ کی تو اُس وقت ہندوستانیت اُنکے رگ و پے مین سرایت کر چکی تھی۔ اپنے قومی راگون کو بھول چکے تھے۔ اور یہان کے نغمون کے دلدادہ تھے۔ اُسوقت وہ اس قابل ہی نہین رہے تھے کہ یہان کے موسیقی مین کسی قسم کا تصرف کرتے یا اُس مین کچھ نکتہ چینی کر سکتے۔

پھر بھی عجمی قوالون کے نغمون نے ہندوستان کے موسیقی پر تھوڑا بہت اثر ڈال ہی دیا۔ چنانچہ اُنکے متعدد راگ ہندی موسیقی مین شامل ہوگئے۔ ژنگولہ (جھنگلا) زیلف۔ شاہانہ۔ درباری۔ ضلع (کھماچ) وغیرہ کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ عجمی راگ ہین جو ہندوستانی فن غنا مین شامل ہوگئے ہین۔

امیر خسرو نے دونون فنون کو حاصل کیا۔ اور دونون کے ملانے کی بہت کچھ کوشش کی۔ کہتے ہین کہ ستار کو اُنھین نے ایجاد کیا۔ اور یقیناً بہت سی دھنین اُن کی ایجاد کی ہوئی ہین۔ لیکن اس کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ امیر خسرو نے یہان کی موسیقی مین کون کون خاص چیزین بڑھائین۔

مسلمانون مین معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہون سے پہلے مشائخ صوفیہ نے موسیقی کی

طرف توجہ کی۔ اور حال و قال کی جو صحبتیں عراق و عجم کے زہاد و سلف میں عبادت کی شان سے قائم تھیں ہندوستان میں بھی قائم ہو گئیں۔ اور جو گوئیے اس سے پیشتر بتخانوں میں بھجن گایا کرتے تھے۔ مسلمان زہاد و صوفیہ کے حلقے میں بیٹھ کے معرفت کی غزلیں گانے لگے۔

بادشاہوں کے دربار میں بھی یہاں کے گوئیے اور گانے ناچنے والی رنڈیاں موجود رہا کرتیں۔ مگر ان کا افسر اعلیٰ کوئی عجمی گویا ہوا کرتا جو اُنکے موسیقی پر اپنا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ڈالتا۔ محمد تغلق کے عہد میں دربار کا سب سے بڑا گویا امیر شمس الدین تبریزی تھا اور کل زن و مرد ارباب نشاط اُس کے زیر حکم تھے۔ اُنھیں دنوں دیوگڑھ یعنی دولت آباد کے متصل ارباب نشاط کی ایک پوری بستی آباد تھی جو "طرب آباد" کہلاتی۔ اُس کے چوڑے بازار کے بیچوں بیچ میں ایک بُرج تھا جس میں روز بعد عصر ارباب نشاط کا چودھری آکے بیٹھتا اور اسکے سامنے تمام گوئیوں اور رنڈیوں کے طائفے باری باری آکے گاتے۔ اُن میں سے اکثر مسلمان تھے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند۔ اس بستی میں جابجا مسجدیں تھیں جن میں ماہ مبارک رمضان میں تراویح پڑھی جاتی۔ بڑے بڑے راجہ یہاں آکے گانا سنتے۔ کئی مسلمان تاجداروں نے بھی یہاں آکے گانا سنا تھا۔ اہل طرب کے سرگروہ اور چودھری چونکہ عموماً مسلمان تھے اس لیے ظاہر ہے کہ عربی و عجمی اور ہندوستانی فنون غنا کس قدر جلد مل جل گئے ہوں گے۔

ہندو موسیقی کے مرکز شمالی ہند میں متھرا۔ اجودھیا اور بنارس تھے۔ جہاں مذہبی عنصر اعظم ہونے کی وجہ سے موسیقی کا فن ہمیشہ پرورش پاتا رہتا تھا۔ جونپور کے سلاطین شرقی میں سے سلطان حسین شرقی کو موسیقی کا شوق بہت تھا۔ وہ خود ایک بڑا گویا تسلیم کیا جاتا۔ اور چونکہ اجودھیا اور بنارس دونوں اُسکی قلمرو میں تھے اس لیے یقیناً اُس نے ہندوستان کے اس شریف فن کو بڑا فائدہ پہونچایا ہوگا۔

اکبر نے اس فن کی یہاں تک قدر کی کہ اُسکے عہد کا سب سے بڑا نامور گویا تانسین اُس کے "نورتن" میں شامل ہوا۔ ایک مسلمان شہنشاہ کی یہ توجہ و عنایت دیکھ کے وہ خود یا اُس کا بیٹا بلاس خاں مسلمان ہو گیا۔ اس خاندان میں دربار کی

قدردانی سے ہندی موسیقی کو روز بروز عروج حاصل ہوتا رہا۔ بعد کے درباروں مین اسی نسل کے گوئیے سرفراز ہوتے رہے۔ چنانچہ آج تک اس خاندان کے لوگ اپنے آپ کو دربار مغلیہ ہی سے وابستہ خیال کرتے ہین۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ اسی نسل کے ذریعے سے ہندوون کا یہ فن مسلمانون مین آیا۔ مگر جن واقعات کو ہم بیان کر چکے ہین اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اس خاندان سے بہت پہلے مسلمانون نے اس ہندی کمال کو حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ فی الحال ہندی موسیقی کے تمام باکمال اور کل نامی گوئیے مسلمان ہی ہین۔

دہلی مین اس فن پر سب سے پہلے شاہجہان بادشاہ کے عہد مین کتاب "شمس الاصوات" لکھی گئی جو اب کہین نہین ملتی۔ پھر اکبر ثانی کے عہد مین میرزا خان نام ایک بزرگ نے پنڈتون اور علمائے سنگیت کی مدد سے کتاب "تحفۃ الہند" تصنیف کی جس کے دو ہی ایک نسخے بعض لوگون کے پاس رہ گئے ہین۔ اس مین بہت سے ہندی فنون کو جمع کیا ہے۔ جہان جوتش۔ سرودعا۔ سامدرک۔ کوک ناٹک بھید۔ اندر جال وغیرہ مختلف فنون پر بحث کی ہے وہان ہندی موسیقی کو بھی بتایا ہے۔

دہلی مین اسی حد تک ترقی ہونے پائی تھی کہ یہ دلچسپ فن دربار لکھنؤ مین منتقل ہو آیا۔ اور نواب شجاع الدولہ کی قدردانی و فیاضی نے سارے ہندوستان کے موسیقی دانون کو اودھ کی سرزمین پر لا کے اکٹھا کر دیا۔ یہان اجودھیا اور بنارس کے موسیقی کے پرانے اسکول قائم ہی تھے۔ جونپور کے شرقی سلاطین کی قدردانی کی کچھ نہ کچھ یادگارین بھی باقی تھین۔ اُن مین جب دہلی کے باکمال گوئیے اور تانسین خان کے مستند اسکول کے اُستادان موسیقی بھی آ کے مل گئے تو خاص شان پیدا ہو گئی۔ اور موسیقی کا در اصل ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

شجاع الدولہ کی نسبت مصنف تاریخ فیض آباد لکھتے ہین کہ ارباب نشاط کا بڑا شوق تھا۔ ہزارہا گانے والی رنڈیان عموماً دہلی سے اور دیگر بلاد دور دور سے یہان آ کے جمع ہو گئی تھین۔ عام رواج پڑ گیا تھا کہ نواب وزیر کے علاوہ اور تمام اُمرا و سرداران فوج بھی کسی طرف کوچ کرتے تو ارباب نشاط اور رنڈ

کے ڈیرے اُن کے ساتھ ساتھ جاتے -

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد مین فارسی زبان مین کتاب "اصول النغمات الآصفیہ" لکھی گئی - ہندوستان کے فن موسیقی پر اس سے بہتر کوئی کتاب آج تک تصنیف نہین ہو سکی - اگرچہ اس کتاب کے بھی بہت ہی کم نسخے دستیاب ہوتے ہین میرے پاس موجود ہے - اور مین نے اسے پڑھا ہے - مصنف پختہ مغز - صاحب علم وفضل ہے - عربی فارسی اور سنسکرت تینون زبانون مین پوری دستگاہ رکھنے والا معلوم ہوتا ہے - جس نے اس امر مین بڑی کامیاب کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی موسیقی کو بہت ہی وضاحت کے ساتھ ہر شخص کے ذہن نشین کر دے - اسد اللہ خان کوکب مرحوم جنھون نے چند ہی روز ہوے انتقال کیا موسیقی کے اعلیٰ درجے کے صاحب علم استاد تھے - اور کلکتے مین ہندوستانی موسیقی کے پروفیسر مشہور تھے - وہ اس کتاب کی نسبت مجھے اپنے ایک خط مین لکھتے ہین کہ "موسیقی کا یہ فارسی رسالہ میرے پاس موجود ہے - یہ رسالہ اُن معتبر کتابون سے جو اس علم کی قدیم مایۂ بساط ہین مضامین اخذ کر کے بڑی تحقیق اور تدقیق سے لکھا گیا ہے" - (افسوس یہ لاجواب کتاب آج تک نہین چھپی - اور اس کے نسخے اس قدر کمیاب ہین کہ اُس کے فنا ہو جانے کا اندیشہ ہے - اگر کوئی رئیس توجہ کرین تو ملک اور اپنی قدیم تاریخ پر بڑا احسان کرین -

یہ رسالہ ہی بتا رہا ہے کہ آصف الدولہ کے عہد کے لکھنؤ مین موسیقی کو کس قدر ترقی ہو گئی تھی - اس کا مصنف ایک بڑا محقق معلوم ہوتا ہے جسنے ابن سینا کی کتاب شفا سے لے کے عربی اور فارسی موسیقی کے اصول بھی بصراحت بتا دیے ہین - دلگداز کے اس مضمون کی تکمیل کے لیے ہم نے پروفیسر کوکب مرحوم سے مدد مانگی تھی - اُنھون نے جواب مین ہمین جو کچھ لکھا اُسے ہم بجنسہ شایع کیے دیتے ہین - اس سے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ لکھنؤ مین آنے کے بعد فن موسیقی کی کیا حالت رہی؟ افسوس اب وہ دنیا مین نہین ہین ورنہ ہمین اُن سے بہت زیادہ مدد ملتی - خصوصاً اس لیے کہ اپنی نئی کتاب جو فن موسیقی مین لاجواب ہے وہ ہمارے یہان چھپوانا چاہتے تھے - آصف الدولہ کے عہد کی ترقی موسیقی

تسلیم کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں :-

نواب سعادت علی خان کے زمانے میں موسیقی پر اوس پڑ گئی - غازی الدین حیدر کے زمانے میں اس فن کا ایک بہت بڑا کامل و اکمل شخص لکھنؤ میں موجود تھا - جس کا نام حیدری خان تھا - یہ صاحب اپنی وارفتہ مزاجی کی وجہ سے "سڑے حیدری خان" مشہور تھے - اور گولہ گنج میں رہتے تھے - غازی الدین حیدر کو انکا گانا سننے کا بڑا شوق تھا - مگر کبھی اس کا موقع نہیں ملا تھا - ایک روز سہ پہر کو غازی الدین حیدر ہوادار پر سوار دریا کنارے تفریح کو نکلے - رومی دروازے کے نیچے لوگوں نے دیکھا کہ "سڑے حیدری خان" چلے جاتے ہیں - بادشاہ سے عرض کی کہ قبلۂ عالم حیدری خان یہی ہیں "۔ بادشاہ کو تو اشتیاق تھا ہی حکم دیا کہ "بلاؤ" لوگ پکڑ لائے - اور سامنے کھڑا کر دیا - بادشاہ نے کہا "ارے میاں حیدری خان - کبھی ہمیں اپنا گانا نہیں سناتے ؟" بولے "جی ہاں کیوں نہ سناؤں گا - مگر مجھے آپ کا مکان نہیں معلوم ہے "۔ بادشاہ بے اختیار ہنس پڑے اور کہا " اچھا ہمارے ساتھ چلو - ہم خود تمہیں اپنے مکان پر لے چلیں گے "۔ "بہت خوب" کہہ کے بے تکلف ساتھ ہو لیے - چھتر منزل کے قریب پہونچے تھے کہ حیدری خان ہتھے پر سے اُکھڑ گئے - اور بولے " میں چلتا تو ہوں مگر پوریاں اور بالائی کھلوائیے گا تو گاؤں گا "۔ بادشاہ نے وعدہ کیا - اور محل میں بیٹھ کے گانا سننے لگے - تھوڑی ہی دیر سُن کے بہت محظوظ ہوے - وجد کا عالم طاری ہوا - اور بیخود و بیتاب ہو گئے - یہ حالت دیکھ کے حیدری خان خاموش ہو گئے - بادشاہ نے پھر گانے کو کہا تو بولے " حضور - یہ تُنیا کو جو آپ کے بیچوان میں بھرا ہوا ہے بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے - آپ کس کی دُکان سے منگواتے ہیں ؟ " غازی الدین حیدر خود بھی آشفتہ مزاج تھے - اور سڑی مشہور تھے - اس سوال پر متنفس ہوے تو مصاحبوں نے عرض کیا " قبلۂ عالم ! یہ سڑی تو ہئی ہے - ابھی تک یہی نہیں سمجھا ہے کہ کس سے باتیں کر رہا ہوں "۔

اب لوگ بادشاہ کے ایماے حیدری خان کو دوسرے کمرے میں لے گئے - پوریاں بالائی کھلوائی - حقہ پلوایا - آپ نے پاؤ بھر پوریاں آدھ پاؤ بالائی

اور ایک پیسے کی شکر منگوا کے اپنی بی بی کو بھجوائی (جو اُن کا ہر جگہ معمول تھا)
جب تک ان کاموں میں رہے بادشاہ نے بادۂ ناب کے جام پیے۔ اور جب
نشے کا زور ہوا تو پھر حیدری خان کی یاد ہوئی۔ فوراً بُلوا کے گانے کا حکم دیا
مگر جیسے ہی اُنھوں نے اپنا نغمہ شروع کیا روک کے کہا "حیدری خان سنتے ہو
اگر مجھے خالی خوش کیا اور رُلایا نہیں تو یاد رکھو کہ گومتی میں ڈبوا دوں گا"۔
اب تو حیدری خان کی عقل ٹھکانے آئی۔ سمجھے کہ یہ بادشاہ ہیں۔ کہا "حضور
اللہ مالک ہے"۔ اور جی توڑ کے گانے لگے۔ خدا کی قدرت۔ یا یہ کہیے کہ
حیدری خان کی زندگی تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں بادشاہ پر اثر ہوا۔ بے
اختیار رونے لگے۔ اور خوش ہو کے کہا "حیدری خان۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟"
عرض کیا "جو مانگوں گا دیجیے گا؟" بادشاہ نے وعدہ کیا۔ اور حیدری خان نے
تین دفعہ قبول کرا کے کہا "حضور یہ مانگتا ہوں کہ مجھے پھر کبھی نہ بُلوائیے گا اور نہ
گانا سنیے گا"۔ بادشاہ نے تعجب سے پوچھا "کیوں؟" عرض کیا "آپ کا کیا ہے؟
مجھے مروا ڈالیے گا۔ پھر مجھ سا حیدری خان نہ پیدا ہو گا۔ اور آپ مر جائیں گے
تو فوراً دوسرا بادشاہ ہو جائے گا"۔ اس جواب پر غازی الدین حیدر نے
ناراض ہو کے منہ پھیر لیا۔ یہ موقع پاتے ہی حیدری خان اپنی جان لے کے
بھاگے اور اپنے گھر آئے۔

غرض غازی الدین حیدر کے زمانے میں یہی ایک باکمال موسیقی دان لکھنؤ میں
تھا۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں یوں تو ہزاروں گانے والے تھے مگر اس
پائے کا گویا کوئی نہ تھا۔ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے زمانے ثقاہت آبی کے
عہد تھے۔ اس لیے کہ محمد علی شاہ میں پیرانہ سالی کی بے حسی تھی اور امجد علی شاہ
بغیر جناب قبلۂ و کعبہ سے پوچھے کوئی کام نہ کرتے تھے۔ لہٰذا اُن کے زمانے
میں بعض شوقین رؤسائے شہر اگر ارباب نشاط کے قدر دان بھی تھے تو چھپ کے
گانا سنتے۔ اس لیے اب اس فن کی جو کچھ قدر ہوئی واجد علی شاہ کی عہد شباب
کی تخت نشینی میں ہوئی۔ جبکہ لکھنؤ کا ساغر عیش چھلکنے کو تھا۔ اور گُل ہونے والا چراغ
آخری مرتبہ بھڑک کے روشن ہوا تھا۔

(۲۲)

اگرچہ ہم نصیر الدین حیدر اور بعد والے فرمان روایان عہد کے موسیقی کے بارے مین کچھ اور بھی بیان کرنا چاہتے ہین مگر اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسد اللہ خان کوکب مرحوم کے خط کا باقیماندہ حصہ بھی اپنے ناظرین کو سنا دین جس سے لکھنؤ کی موسیقی پر ایک مستند ماہر فن کی رائے معلوم ہو جائے گی۔

وہ تحریر فرماتے ہین" واجد علی شاہ کے عہد مین لکھنؤ مین باکمالان موسیقی کا گروہ کثیر جمع ہو گیا تھا۔ لیکن دربار کے رسوخ یافتہ اور صاحب خطاب گویے کاملین فن نہ تھے۔ صرف ایک قطب الدولہ رامپور کے رہنے والے البتہ ستار خوب بجاتے تھے۔ اور اپنے فن مین اچھے تھے۔ انیس الدولہ۔ مصاحب الدولہ۔ وحید الدولہ اور رنجی الدولہ اگرچہ گویے تھے مگر ایسے باکمال نہ تھے۔ فقط عنایت شاہی سے دولہ ہو گئے تھے۔ کاملین فن مین یہ لوگ تھے۔ پیار خان۔ جعفر خان۔ حیدر خان۔ باسط خان۔ یہ سب لوگ میان تان سین کے خاندان کی یادگار تھے۔ اس خاندان کے دو نامی شخص آج کل بھی موجود ہین۔ ایک وزیر خان جو ریاست رامپور مین ہین۔ دوسرے محمد علی خان جو ریاست پرتسدا مین ملازم ہین۔ محمد علی خان کے والد باسط خان تھے جن کا نام اوپر آ چکا ہے "

اس موقع پر کوکب خان مرحوم بتاتے ہین کہ میرے والد مرحوم نعمت اللہ خان نے باسط خان ہی سے علم موسیقی حاصل کیا تھا۔ نعمت اللہ خان تقریباً گیارہ سال تک مٹیا برج مین واجد علی شاہ کے ساتھ رہے۔ پھر اس کے بعد تیس برس تک دربار نیپال مین رہے"۔

اس کے بعد لکھتے ہین :۔ واجد علی شاہ کے عہد مین موسیقی کا خوب چرچا رہا۔ لیکن علم موسیقی اپنے بلند پائے سے گر کے چھوٹی چھوٹی چیزون پر آ گیا تھا۔ لکھنؤ مین کدر پیا نے ٹھمریان تصنیف کر کر کے عوام مین پھیلا ئین۔ اور موسیقی کو بےحس کر دیا۔ چنانچہ اکثر شیدایان موسیقی اعلیٰ درجہ کی راگ راگنیون کو چھوڑ کے کدر پیا کی ٹھمریان پسند کرنے لگے۔ موسیقی کے مذاق مین تنزل محمد شاہ رنگیلے ہی کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ جب میان سارنگ نے خیال کو تصنیف کیا جس سے فن موسیقی اصولاً ناقص

ہوگیا۔ مگر اس سے بدرجہا زیادہ خرابی کدر کی ٹھمریون سے پیدا ہوگئی۔ اور اب
عوام و رؤسا کی یہ حالت تھی کہ اعلیٰ قسم کی موسیقی کو اگر سنتے بھی تھے تو دلچسپی و
شوق سے نہین۔ بلکہ ناپسند کرتے تھے۔

واجد علی شاہ کے مصاحب گویّون مین سے انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ
نے موسیقی کو پیار خان سے حاصل کیا تھا جو بہت بڑا صاحب کمال اُستاد تھا۔
اور جو کچھ اُس نے ان دونون شاگردون کو بتایا وہ بیشک اعلیٰ پیمانے پر تھا لیکن
اس کا کیا علاج کہ دربار مین ایسے موسیقی کی قدر ہی نہ تھی۔ برعکس جو قیصر باغ
مین ہوتا تھا جس مین واجد علی شاہ خود کنھیا بنتے تھے بہت ہی بتذل درجے کا
موسیقی تھا۔ لیکن اس مین شک نہین کہ رغبت نہ ہونے پر بھی اہل کمال کی دربار
شاہی مین بڑی قدر ہوتی تھی۔ جس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ واجد علی شاہ نے بھی
باسط خان سے فن موسیقی حاصل کیا تھا۔ اور فن مین پوری بصیرت رکھتے
تھے۔ اپنی عالی دماغی کی وجہ سے بادشاہ نے اپنے طرز مین نئی راگنیان تصنیف
کین جن کے نام اپنی طبیعت داری سے جوگی کنتر۔ جوہی۔ شاہ پسند وغیرہ رکھے
واجد علی شاہ کو اس فن مین اساتذہ کا درجہ حاصل تھا۔ صاحب کمال تھے۔
لیکن اس الزام سے نہین بچ سکتے کہ اُن کے عامیانہ مذاق نے لکھنؤ مین موسیقی
کو سبک اور عام فہم بنا دیا۔ زمانے کا یہ رنگ دیکھ کے نفیس طبیعتین رکھنے والے
گویّون نے بھی راگ راگنیون کی مشکلات کو ترک کر کے چھوٹی چھوٹی سادی دلکش
اور عام فہم چیزون پر موسیقی کو قائم کیا۔ عوام مین غزل ٹھمری کا چرچا ہوگیا۔
اور دھرپد و ہوری وغیرہ جو نہایت ثقیل اور مشکل چیزین ہین اُن کی طرف مطلق
توجہ نہ کی گئی۔ کلماچ جھنجھوٹی۔ بھیروین۔ سیندورا۔ تلک کامود۔ پیلو وغیرہ
چھوٹی چھوٹی مزہ دار راگنیان اہل مذاق کے تفنن کے لیے منتخب کی گئین۔ اور
یہی چیزین بادشاہ کو بالطبع مرغوب تھین۔ یہ راگنیان لکھنؤ کی قدردان سوسائٹی
کے مذاق مین یہان تک سرایت کر گئین کہ آج سارے ہندوستان مین لکھنؤ کے
سفیدے خربوزون کی طرح لکھنؤ کی بھیروین بھی مشہور ہو گئی۔ اور سچ یہ ہے کہ بھیروین
لکھنؤ ہی کا حصہ ہے ایسی بھیروین ہندوستان کے کسی حصے مین نہین گائی جاتی۔

سوز خوانون نے بھی انھین عام پسند و عام فہم راگنیون کو زیادہ رواج دیا جو مذہب کی سفارش سے گھر کی بیٹھنے والی عورتون تک کے گلے مین اُتر گئین۔ یہان تک کہ اُن کی نوحہ خوانی سُن کے بڑے بڑے باکمال گویے نقش حیرت بن جاتے ہین۔ سوز خوانون مین سے اکثر پیارے خان اور حیدر خان کے شاگرد تھے۔

"لَے" ایک اہم جزو موسیقی ہے۔ جس کو عرف مین ٹائم یا وقت کہنا زیادہ موزون ہے۔ اُس کا مادہ واجد علی شاہ مین بہت زیادہ تھا۔ جسے قدرت کی دین کہنا چاہیے۔ اور یون تو لَے کا مادہ کم و بیش ہر شخص مین ضرور موجود ہوتا ہے۔ شعرا نے جو اوزان مقرر کیے ہین وہ بھی "لَے" ہی سے تعلق رکھتے ہین۔ علم عروض دراصل مکمل لَے ہے۔ ارکان تال کے اجزا ہین۔ یہ بدیہی امر ہے کہ جس شخص مین فطرۃً لَے کا مادہ بہت بڑھا ہوا ہوگا اُس کے ہر عضو اور بُن مو سے حرکت بے اختیاری وار بودگی پیدا ہو جائے گی۔ اور لَے پر عضو عضو پھڑکنے لگے گا۔ عوام کی نظر مین یہ حرکت بے وقعت اور مہمل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن وہ شخص جس سے سرزد ہوتی ہے مجبور ہے۔ وہ دانستہ اس فعل کو نہین کرتا بلکہ اعضا خود بخود لَے پر حرکت کرنے لگتے ہین۔ واجد علی شاہ کے اسی فعل کو لوگ کہتے ہین کہ وہ "ناچتے تھے"۔ حالانکہ وہ "ناچتے" نہ تھے بلکہ لے داری مین محو ہو کے اُنکے اعضا سے ایسے حرکات سرزد ہونے لگتے تھے۔ جو لوگ اصول موسیقی سے ناواقف ہین کہنے لگے بادشاہ ناچتے ہین۔ دراصل واجد علی شاہ کبھی اور کسی زمانے مین نہین ناچے اُن کا ناچنا بس یہی تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ لے داری مین کوئی اعلیٰ درجے کا کامل فن گوَیا بھی بادشاہ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ مین نے اُنکی صحبت کے معتبر گویون سے سُنا ہے کہ بادشاہ کے پاؤن کا انگوٹھا سوتے مین بھی لَے ہی پہ چلتا تھا۔

نرت جس کو بھاؤ بتانا کہتے ہین یہ فن بھی علم موسیقی کا ایک خاص جُز ہے۔ نرت کا مقصد یہ ہے کہ مافی الضمیر حرکات اور اشارون سے ادا کیا جائے جس کو انگریزی مین موشن کہتے ہین۔ موشن بڑے بڑے جید اسپیکرون اور لکچرارون مین پایا جاتا ہے۔ لیکن انھین کوئی ہدف ملامت نہین بناتا۔ اگر بیچارے واجد علی شاہ

محض اپنی لے داری کی وجہ سے بدنام کیے جاتے ہین "
یہ ہے جو لکھنؤ کی موسیقی اور واجد علی شاہ کے متعلق کوکب مرحوم کی تحریر سے معلوم ہوا۔ اس سے صاف پتہ چل سکتا ہے کہ لکھنؤ نے چاہے اعلیٰ درجے کے موسیقی کو رواج نہ دیا ہو مگر اسکے سُدھارنے اور عام پسند بنانے کا یہ شہر کتنا بڑا زبردست اسکول قرار پاگیا تھا۔

غازی الدین حیدر ہی کے زمانے مین یہان اعلیٰ درجے کے قوالون کی شہرت تھی۔ چھجو خان اور غلام رسول خان اُستاد فن مانے جاتے تھے۔ شوری اتنا بڑا زبردست موجد فن تھا کہ ٹپے کا موجد وہی مانا گیا ہے۔ بخشو اور سلاری اُن دونون طبلہ بجانے کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ اور اُن کے مقابل کسی کو طبلہ چھونے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اس آخر زمانے مین صادق علی خان سارے ہندوستان مین اُستاد بے بدل مانے جاتے تھے۔ چھوٹے اور بڑے منّے خان کے گانے مین ایسا مزہ اور لطف تھا کہ باوجود کامل فن ہونے کے ناواقف عوام کو بھی اپنے نغمے پر فریفتہ کر لیتے۔

مٹیا برج مین جو ڈھاڑی واجد علی شاہ کے دربار مین ملازم تھے اُن سب کو مین نے خود سُنا تھا۔ احمد خان۔ تاج خان اور غلام حسین خان اُس وقت کے زبردست صاحب کمال مانے جاتے۔ دُلّی خان جس نے سارے کلکتے مین اپنی دھوم مچا رکھی تھی اور اپنے سحر آفرین گلے سے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو فریفتہ کر لیا کرتا۔ لکھنؤ ہی کا تھا۔ اور لکھنؤ ہی کے اسکول موسیقی کا تعلیم یافتہ تھا۔ مرد گویون کے علاوہ لکھنؤ مین بعض رنڈیون نے وہ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے ڈھاڑی اُنکے سامنے کان پکڑتے تھے۔ زہرہ و مشتری جو شاعرہ بھی تھین گانے مین اپنا جواب نہ رکھتی تھین۔ چُونے والی حیدری کو وہ ناموری حاصل ہوئی کہ اُس کے گلے سے سوز سننے کے لیے لوگ محرم کے انتظار مین دن گنا کرتے۔ اور محرم مین باہر کے سیکڑون ہزارون شوقین لکھنؤ مین آکے حیدری کے امام باڑے مین گھنٹون اُمیدوار بنے بیٹھے رہتے کہ کب بی حیدری اپنا نغمۂ غم شروع کرین گی۔

طبلہ بجانے مین آخری عہد کا کامل محمد جی تھا جس کی سارے ہندوستان مین

شہرت تھی۔ تقریباً تیس سال کا زمانہ ہوا۔ مجھے چوک مین ایک جنٹلمین مرہٹہ ملا جو کوٹ پتلون پہنے تھا اور کسی معزز خدمت پر مامور تھا۔ مجھسے مل کے اُس نے کہا کہ "مین لکھنؤ مین صرف اس شوق مین آیا ہون کہ یہان کے باکمالان موسیقی کا کمال دیکھون"۔ مین نے پوچھا "آپ کون ہین؟" کہا "مین خاندانی گویا ہون اور میر باپ دادا سیواجی کے دربار کے گویے تھے۔ اگرچہ اب انگریزی تعلیم پانے کے بعد نوکری کر لی ہے مگر اپنے خاندانی فن کو بھی جانتا ہون"۔ اتفاقاً اُسوقت ایک اور صاحب آگئے جو لکھنؤ کی مشہور گانے والی "محمدی" کے دہان آتے جاتے تھے بولے "چلیے آپ میرے ساتھ چلیے"۔ وہ مرہٹے صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ کھینچ لے گئے۔ اور ہم سب محمدی کے وہان پہونچے۔ اتفاقاً وہان صادق علی خان بھی موجود تھے۔ اور سب نے اپنا کمال دکھایا۔ خود وہ مرہٹہ بھی گایا۔ اسکے بعد ہم سب چودھرائن کے وہان گئے جو گھر یہان صاحبان فن کا سب سے بڑا کلب سمجھا جاتا ہے۔ وہان دونون ننّے خان بُلالئے گئے۔ اُنھون نے گا کے اپنا کمال دکھایا۔ آخر مین اُس مرہٹے نے کہا "مجھے تو صرف اتنی تمنا یہان لائی ہے کہ مین ایک ترانہ گاؤن اور محمدی میرے ساتھ طبلہ بجا دے"۔ فوراً محمدی بُلوائے گئے۔ اور مرہٹے جنٹلمین کے گانے اور محمدی کے بجانے مین کُل حاضرین کو بڑا مزہ آیا۔ سب عش عش کر گئے۔ اور آخر مین اُس مرہٹے نے قبول کر لیا کہ "مین سب جگہ گیا ہون مگر محمدی سے زیادہ باکمال طبلہ نواز آج تک آنکھ سے نہین دیکھا تھا"۔

لکھنؤ مین موسیقی کو اس قدر عروج ہو گیا تھا کہ بخلاف اور شہرون کے اُمرا اور دولتمندون کے یہان کے امرا ذوق صحیح رکھتے ہین۔ سمجھتے ہین۔ دُھنون راگون اور راگنیون کو پہچانتے ہین۔ اور دو ہی ایک تانین سُن کے سمجھ جاتے ہین کہ یہ گویا کس پائے کا ہے۔ معمولی گانے والا یہان کی صحبتون مین فروغ نہین پا سکتا۔ بازاری لوگ اور عموماً لڑکے جو سڑکون اور گذرگاہون مین گاتے پھرتے ہین۔ وہ بھی مختلف چیزون کو ایسے سچے سُرون مین ادا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ راگنی اور لَے گلے مین اُتری ہوئی ہے۔ اکثر شہرون مین لوگ کثرت سے ایسے ملین گے جو شعرون کو موزون نہین پڑھ سکتے۔ بخلاف اسکے یہان

آپ کو ایسا جاہل ڈھونڈھے نہ ملے گا جو اشعار کو موزون نہ پڑھ سکتا ہو۔ دلیل ہے اس بات کی کہ لَے داری یہان کے بچے بچے کے رگ و پے مین سرایت کر گئی ہے۔ بعض اوقات کسی بازاری لڑکے کو بھیرین۔ سوہنی۔ بہاگ۔ یا کسی اور دھن مین ایسی خوبی سے گاتے سُنا گیا ہے کہ سُننے والے محو ہو گئے۔ اور بڑے بڑے گویّون کو اُن پر حسد آنے لگا۔

موسیقی کے سلسلے مین مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سازون اور آلاتِ موسیقی کا بھی حال بیان کر دین۔

موسیقی مین دو چیزین ہوتی ہین۔ سُر اور لَے۔ ان دونون چیزون مین بگڑنا گانے کا ناقابلِ عفو عیب ہے۔ لہٰذا ان دونون کی نگہداشت کے لیے دو ہی سازون کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ فی الحال سُر پر رہنے کی مدد کے لیے سارنگی اور لَے پر قائم رہنے کی ضرورت سے طبلہ کام مین لائے جاتے ہین۔

سُرون کی مدد کے لیے ہندوستان کا پُرانا ساز بین تھی۔ جس مین ایک مجوّف چوبی نلی کے دونون سرون پر دو تونبیان لگائی جاتین۔ اور اُس پر ساتون سُرون کے سات تار کھینچ دیے جاتے۔ جن کا نغمہ نلی کے اندر سے دونون جانب دوڑ کے دونون تونبیون مین گونجتا۔ مسلمان اپنے ساتھ رباب۔ چنگ اور سرود لائے۔ رباب غالباً عربی باجا تھا جس نے عباسیہ کے دور مین بہت ترقی کی تھی۔ چنگ اور سرود عجمی باجے تھے۔ ان مین سے چنگ بہت ہی پُرانا ساز ہے جس کا سراغ اسیریا۔ بابل۔ مصر۔ یونان اور روم غرض تمام اگلی قومون مین لگتا ہے۔ سرود خالص فارسی باجا تھا۔ جس کو عباسی دور کے مغنّیون نے اختیار کر کے بہت ترقی دی۔ ہندوستان مین آنے کے بعد جب ہندوون اور مسلمانون کے نغمون مین میل جول ہوا تو پہلے طنبورہ ایجاد ہوا جو دراصل بین کا اختصار اور صرف سُرون کے قائم رکھنے کا کام دیتا تھا۔ اور تنہا بجانے کی چیز نہ تھا۔ چند روز بعد امیر خسرو نے ستار ایجاد کیا جو دراصل بین اور طنبورہ دونون مین ایک آسان اور عام پسند تصرف تھا۔ لیکن بین ہو یا طنبورہ یا ستار رنگے کا پورا ساتھ کوئی نہ دے سکتا تھا۔ یہ کمی دیکھ کے محمد شاہ رنگیلے کے دربار کے زبردست و نامور مغنّی میان سدا رنگ نے

سارنگی ایجاد کی جو انھیں کی طرف منسوب ہے۔ سارنگی نے بین طنبورے اور ستار سب کو پیچھے ڈال دیا۔ اور رقص وسرود کی محفلوں میں ایسا رسوخ حاصل کیا کہ اُن اگلے سازوں کے بجانے والے بھی فنا ہو گئے۔ انھیں پرانے سازوں میں یہاں ایک قانون بھی تھا جسے یقیناً مسلمان شام وعراق سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اُسکے بجانے والے بھی اب کہیں شاذ ونادر ہی نظر آتے ہیں۔ غرض عیش وطرب کی محفلوں سے سارنگی نے ان سب کو نکال دیا۔ اور ان قدیم سازوں کی یہ شان رہ گئی کہ اعلیٰ درجے کے اُستاد گویوں میں کبھی کبھی کوئی ایک فنیا نظر آجاتا ہے جسے بین یا سرود۔ رباب یا قانون کے بجانے میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ ستار نوجوانوں کے تفنن طبع کے لیے رہ گیا۔ جسے وہ بغیر گانے کے بجاتے اور سنتے ہیں۔ اور کبھی اُس کے ساتھ کوئی گانے بھی لگتا ہے۔

اب رہا طبلہ۔ یہ اگرچہ لَے کے لیے بہت ہی لازمی چیز ہے مگر اس قسم کی کسی چیز کا پتہ دیگر ممالک کی پُرانی قوموں میں نہ تھا۔ لڑائی میں طبل جنگ بجتا۔ نوبت میں نقارہ بجایا جاتا۔ مگر ناچ گانے کے ساتھ سوا ہندوستان کے اور کہیں اس قسم کی کوئی چیز اگلے زمانے میں نہ تھی۔ سوا دَف کے جو عربوں میں تھی۔ اور گانے کے ساتھ بجائی جاتی تھی۔ یہاں بھی گانے کے ساتھ سب سے پہلے دَف کا رواج معلوم ہوتا ہے۔ جو بین کے ساتھ بجتی اور لَے کے قائم رکھنے میں مدد دیتی۔ اس کے بعد قدیم الایام ہی میں مردنگ نکلی جو غالباً سری کرشن جی کے زمانے میں موجود تھی اور اُن کی بانسری کے نغمے کے ساتھ مردنگ کی گمک بھی جمنا کنارے برج کے جنگل میں سُنی جاتی تھی۔ مردنگ کے بعد ترقی یہ ہوئی کہ پکھاوج بنی جو اعلیٰ موسیقی کا خوب ساتھ دے سکتی تھی۔ اب اسکے بعد سے عام لوگوں میں اور گھر کی بیٹھنے والی عورتوں میں ڈھول کا رواج ہوا جو مردنگ اور پکھاوج سے نکل کے عام پسند ہو گئی۔ اور خاص باکمال موسیقی کی اعلیٰ محفلوں کے لیے طبلہ ایجاد ہوا جس میں پکھاوج کے دونوں رُخ دو جدا سازوں میں تقسیم ہو کے دہنا اور بایاں کے نام سے مشہور ہوے۔ طبلہ یقیناً مسلمانوں کے آنے کے بعد کی ایجاد ہے۔ اگرچہ ٹھیک نہیں معلوم کہ لَے داری کے ان سازوں میں مذکورہ ترقیاں کب اور کس کے ہاتھ سے ہوئیں۔

(۲۳)

موسیقی کے ساتھ ناچ نے بھی ایک ممتاز فن کی حیثیت سے لکھنؤ مین بہت نمایان ترقی کی۔ رقص ہر قوم مین تھا۔ اور قدیم سے قدیم زمانے مین تھا۔ فراعنۂ مصر کے سامنے بانکی رسیلی عورتین کھڑی ہو کے ساز کے ساتھ ناچا کرتی تھین۔ حضرت مسیح کے عہد مین بپتسما دینے والے یوحنا کا سر ہیرودیا نے ناچ ہی کے کٹوایا تھا۔ مگر ہندوستان مین بہت صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ گانے کی طرح ناچنا بھی عبادت مین داخل تھا۔ اور یہان فن رقص کی پرورش ہمیشہ مذہب ہی کے آغوش مین ہوئی۔ چنانچہ اس فن کے جاننے اور کرنے والے خاص برہمن تھے۔ اور اُن کا مرکز یا تو اجودھیا اور بنارس کے کتھک تھے یا متھرا اور برج کے رہس دھاری۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے تمام قدیم مندرون مین اگرچہ سیکڑون ہزارون عورتین دیوتاؤن کی مورتون کے سامنے روز مجرا کیا کرتی تھین۔ اور جہان بڑے معبد تھے وہان قدیم سے قدیم زمانے مین ناچنے والیون کا ایک بڑا بھاری گروہ بھی موجود رہا کرتا تھا مگر ناچنے کی اُستادی ہمیشہ مردون مین رہی اور وہی جوان عورتون کو اُس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

ناچنا در اصل حرکات جسمانی کے باقاعدہ بنانے کا نام ہے۔ حرکات کی اس باقاعدگی کو اگر بہت سے اشخاص کے حرکات کے موافق یکسان اور موزون بنانے سے تعلق ہو تو وہ ڈرِل یا فوجی قواعد ہے۔ یا یورپ کے میوزک ہالون کا وہ ناچ ہے جو "بیلڈ" کہلاتا ہے۔ اور اب اکثر ہندوستان کے تھیٹرون مین نظر آجایا کرتا ہے۔ اور اگر وہ حرکات کی باقاعدگی موسیقی کی لے اور آواز کے نشیب و فراز کے موافق بنانے سے علاقہ رکھے تو وہ رقص ہے۔ ہندوستان کا اصلی خالص رقص یہی ہے کہ جسم کے حرکات و سکنات گیتون اور شعرون کے زیر و بم کے مطابق اور مناسب بنا لیجا ئین۔ یہ اصلی ناچ ہے جو ہندوستان مین ایک بہت بڑا وسیع فن بن گیا۔ اس کی سیکڑون گتین اور ہشیار توڑے اور ٹکڑے ایجاد ہوگئے۔ اس کے بعد رقص مین جذبات و خیالات کا اشارون اور حرکتون سے ادا کرنا بھی شامل کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی گانا ناچنے کی شرح

بن جاتا ہے - پھر جب خوبصورت عورتوں کا ناچنا لوگوں کو فطرةً زیادہ پسند آیا تو معشوقانہ ناز و انداز دکھانا - اور نزاکت و نازنینی کی اداؤں کا ظاہر کرنا بھی اس کا جُز بن گیا۔ لکھنؤ کے اسکول نے انھین امور کا لحاظ کرکے زنانے اور مردانے طائفون مین امتیاز پیدا کر دیا - نزاکت کے ساتھ تیانا - معشوقانہ ناز و انداز دکھانا - اور ہر حرکت مین معشوقیت و نازنینی کا لحاظ رکھنا ناچنے والی عورتون کے ساتھ مخصوص رہا جو بعض وقت اگر بے مزہ ہو تو ناظرین کی طبیعتون کو سُست اور پست کر دیتا ہے - اس کے مقابل حرکات کو ئے کے مناسب بنانے مین چلت پھرت دکھانا اور شاعرانہ دلکشی سے اظہار جذبات کرنا - مردانے طائفون کے لیے خاص ہو گیا - اگرچہ دونون گروہ ایک دوسرے کے فن کا ایک مناسب حد تک ضرور لحاظ رکھتے ہین مگر یہ امتیاز نمایان طور پر قائم ہے -

یہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہین کہ اودھ اور لکھنؤ مین ارباب نشاط اور مجرا کرنے والی رنڈیون کے طائفون کا آ آ کے جمع ہونا نواب شجاع الدولہ ہی کے زمانے مین انتہائی درجے کو پہونچ گیا تھا - اُنکے علاوہ اجودھیا اور بنارس کے کتھک جو یہین یا قریب ہی موجود تھے قدردانی دیکھ کے دربار کے مرکز کی طرف کھنچنے لگے - اور دونون کے میل جول سے رقص کا فن نمایان ترقی کرتے کرتے یہان خاص شان پیدا کرنے لگا -

مرد ناچنے والون کے یہان دو گروہ ہین - ایک ہندو کتھک اور رہس دھاری - اور دوسرے مسلمان کشمیری بھانڈ - مگر اصلی ناچنے والے کتھک ہین - اور کشمیری طائفون سے معلوم ہوتا ہے اپنی نقالی کے کمالات مین جان ڈالنے کے لیے اپنے گروہ مین ایک ناچنے والا نو عمر لڑکا بڑھا لیا - جو بال بڑھا کے عورتون کا سا جُوڑا باندھتا ہے - اور نہایت ہی پھرتیلے پن سے ناچ کے اپنی چلت پھرت سے محفل مین زندہ دلی اور تازگی پیدا کر دیتا ہے -

ہندو کتھکون مین سے کوئی نہ کوئی باکمال ہر زمانے مین یہان موجود رہا - یہ لوگ اپنے فن کا بانی مہادیو جی - پاربتی جی - اور کنھیا جی کو بتاتے ہین - شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے عہد مین خوشی مہاراج ناچنے کا بڑا زبردست اُستاد تھا - نواب

سعادت علی خان - غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے دور میں ہلال جی پرکاش جی اور دیا لو جی مشہور ناچنے والے تھے - محمد علی شاہ کے زمانے سے واجد علی شاہ کے عہد فرمان روائی تک پرکاش جی کے بیٹون درگا پرشاد اور ٹھاکر پرشاد کے ناچ کی شہرت رہی - درگا پرشاد کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ناچ مین واجد علی شاہ کا اُستاد تھا - اُسکے بعد درگا پرشاد کے بیٹون کالکا اور بندادین کی شہرت ہوئی - اور قریب قریب تمام لوگون نے مان لیا کہ سارے ہندوستان مین ناچنے کا ان دونون سے زیادہ صاحب کمال اُستاد کوئی نہین ہے - پُرانے اُستاد کبھی خاص بات مین نمود حاصل کرتے تھے - مگر ان دونون بھائیون خصوص بندادین نے ناچ کے تمام فنون مین کمال دکھا کے اپنے آپ کو ہر حیثیت سے اُستاد بے بدل ثابت کر دیا - اور آج کل کے اکثر مشہور ناچنے والے انھین دونون بھائیون کے شاگرد ہین - اور اُن کا گھر ہندوستان بھر کا سب سے بڑا رقص کا اسکول ہے -

کالکا تھوڑا زمانہ ہوا کہ مر گیا - اور سچ یہ ہے کہ اُس کے مرنے سے بندادین کے ناچ کا مزہ اُٹھ گیا - بندادین کی عمر اسوقت ۷۷ سال کی ہے - اور اب بھی ناچ کے شائق اُس کا مجرا دیکھنے کو اپنی زندگی کی ایک یادگار مسرت تصور کرتے ہین - اُس کا گت پر ناچنا - رقص کے اُستادانہ توڑے اور ٹکڑے اصلی صورت مین دکھانا - گھونگھرو بجانے مین یہ اختیار اور قدرت ظاہر کرنا کہ جے گھونگھرو چاہے بجائے - اور اُسکے بعد ہر ہر لفظ اور ہر ہر چیز کو بتانا ایسی چیزین ہین جن کا بندادین ہی پر خاتمہ ہے - وہ ایک ایک چیز کو سو سو اداؤن - وضعون - نزاکتون اور دلفریب اشارون سے بتاتا ہے - اور اُس مین ایسی نازک خیالی اور جدت طرازی ہوتی ہے کہ دیکھنے والا جانتا نہ ہو تو سمجھ بھی نہین سکتا - معمول تھا کہ بندادین بتاتا اور کالکا پاس کھڑے ہو کے اُس کی تشریح کرتا جاتا - اُس کی تشریح ہی سے لوگون کو پتہ چلتا کہ بندادین اپنے فن مین کیسا کمال دکھلا رہا ہے - ناچ مین اُسکے پانوٴن اس نزاکت سے زمین پر پڑتے ہین کہ مشہور ہے بعض اوقات وہ تلوار کی باڑھ پر ناچا اور مجال کیا جو تلوے مین چرکا آیا ہو -

(۲۴)

مرد ناچنے والون کا دوسرا گروہ بھانڈ ہین۔ اُن کے مجرے کی شان یہ ہے کہ کہ ایک نوخیز و خوش رُو لڑکا جس کے بال عورتون کی طرح لمبے ہوتے ہین رنگین اور زرق برق کپڑے پہن کے اور پانوٴن مین گھونگھرو باندھ کے ناچتا گاتا ہے۔ اُس کے ساتھ کا سازنے مین ڈوبا ہوا اور دلون کو اُبھارنے والا ہوتا ہے۔ اُسکے ناچ مین غیرمعمولی چلت پھرت اور شوخی و چالاکی ہوتی ہے۔ اور اُس کا گانا بھی اسی رنگ اور مذاق کے مناسب ہوتا ہے۔ ساتھ بجانے والون کے علاوہ سات آٹھ یا اس سے زیادہ بھانڈ رہتے ہین جو اُسکے ناچ گانے پر واہ واہ کے نعرے بلند کرتے۔ متاثر ہو ہوکے تال دیتے۔ اور اکثر خلاف تہذیب بے اعتدالیون سے اُسکے حرکات و سکنات اور اُسکی اداؤن پر ہنسانے والے ریمارک کرتے رہتے ہین۔ اور جہان وہ لڑکا تھوڑی دیر گا چکا وہ سامنے آکے نقلین کرتے اور بذلہ سنجی و نقالی کا کمال دکھاتے ہین۔

لکھنؤ مین ان لوگون کے دو گروہ ہین۔ ایک کشمیری جو کشمیر سے آئے ہین۔ اور دوسرے خاص یہان کے جن کا پیشہ ابتدائً کچھ اور تھا۔ مگر اب نقالی اُن کا خاص فن ہو گیا ہے۔

نقالی اور خصوصًا رقص و سرود کے ساتھ نقالی ہندوستان کا بہت ہی پُرانا فن تھا۔ جو راجہ بکرماجیت کے دربار مین یعنی حضرت مسیح سے بھی پہلے بہت ترقی پر تھا۔ مگر اُسوقت اُس مین اعلیٰ درجے کے ڈرامے دکھانے جاتے۔ اور سچ یہ ہے کہ وہ بہت ہی مہذب و شائستہ نقالی تھی۔ ہندوستان کی ادنیٰ قومون کی تقریبون مین آج تک معمول ہے کہ جب وہ لوگ خود ہی ناچتے گاتے ہین تو اُنھین کے ساتھ مضحک نقلین بھی کرتے ہین۔

مسلمانون کے زمانے مین دولت مغلیہ سے پہلے بھانڈون اور نقالون کا پتہ نہین لگتا۔ ممکن ہے کہ ہون اور اُس دور کے وقائع نگارون نے ان کو قابلِ لحاظ نہ خیال کیا ہو۔ مگر دولت مغلیہ کے زمانے مین بھانڈون نے خاص نمود حاصل کر لی تھی۔ اُن کا پتہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سے ملتا ہے جب اُمرا

و سلاطین دہلی کو ملک گیری و ملک داری کی زحمتوں سے چھٹی مل گئی تھی - اور صرف دربارداری و عیش پرستی کو اپنا آبائی حق تصور کرنے لگے تھے - مگر دراصل ان بھانڈوں نے یہاں کی سوسائٹی مین عجیب عجیب کام کیے - یہی یہاں کے نیشنل سٹائرز ہین - اور انھون نے قریب قریب وہی کام کیے جو انگلستان مین ایکٹیٹر اور ٹاٹلر نے کیے تھے - دہلی کا سب سے پہلا بھانڈ کریلا مشہور ہے - جو محمد شاہ کے عہد مین تھا - کسی بات پر ناراض ہوکے محمد شاہ نے حکم دیا کہ بھانڈون کو ہمارے ملک سے نکال دو - دوسرے دن بادشاہ کی سواری نکلی تو اوپر سے ڈھول بجنے اور بھانڈون کے گانے کی آواز آئی - تعجب سے سر اٹھاکے دیکھا تو کریلا اور چند بھانڈ ایک کھجور کے درخت پر چڑھے ہوے ڈھول بجا بجا کے گا رہے تھے - سواری رکواکے پوچھا "یہ کیا گستاخی ہے؟ اور ہمارے حکم کی تعمیل کیون نہ ہوئی؟" عرض کیا "قبلۂ عالم - ساری دنیا تو جہان پناہ کے زیرنگین ہے جائین تو کہان؟ اس لیے عالم بالا کا ارادہ کیا - اور یہ پہلی منزل ہے" اس جواب پر بادشاہ اور جملہ مصاحبین ہنس پڑے - اور ان کا قصور معاف کیا گیا -

لکھنؤ مین آنے کے بعد ان لوگون کی کچھ ایسی قدر ہوئی کہ ان طائفون کا اصلی مرکز لکھنؤ ہی قرار پا گیا - جہان تک مجھے معلوم ہے فی الحال دہلی مین بھانڈ نہین ہین - اور ہون تو بہت ہی کم اور گمنام ہین - ہان بریلی مین پرانے زمانے سے بھانڈون کے طائفے موجود ہین - اور اکثر لکھنؤ کے ڈوم ڈھاری بھی بریلی سے آئے ہین - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوانین روہیلکھنڈ بھی موسیقی اور ارباب نشاط کے قدردان تھے - جن کی فیاضی سے بریلی و مرادآباد مین ان لوگون کا نشو و نما اچھی طرح ہوا - اور وہان سے بھی صاحب کمال ڈھاڑی اور نقال لکھنؤ مین آئے - اگرچہ اب ان کا اصلی مرکز لکھنؤ ہی بنا ہوا ہے -

ان کے لطیفے - نوک جھونک کے فقرے - اور نقالی کے عجیب کمالات لکھنؤ مین مشہور ہین - نواب سعادت علی خان کے اشارے سے اسوقت کے سب سے بڑے بانکے کے سامنے چوٹ کرتا ہوا فقرہ ایک بھانڈ نے کہا تھا اس سے پہلے ہم اپنے ناظرین کو سنا چکے ہین - اسی زمانے کا ایک یہ واقعہ بھی یادگار رہنے کے

کسی رئیس نے انعام مین دوشالہ دیا۔ مگر وہ دوشالہ بوسیدہ اور پُرانا تھا۔ ایک
نقال نے ہاتھ مین لے کے اُسے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اور اُس پر بہت ہی گہ
نظرین جما دین۔ دوسرے نے پوچھا "دیکھتے کیا ہو؟" کہا "دیکھتا یہ ہون کہ اس پ
لکھا ہوا ہے۔" پوچھا "آخر کیا لکھا ہے؟" عینک نکال کے لگائی۔ اور اٹک اٹک
کے بڑی مشکلون سے پڑھا "لا الہ الا اللہ" پوچھا "بس اتنا ہی؟ محمد رسول اللہ
نہین لکھا؟" جواب دیا "محمد رسول اللہ کیسے لکھا ہو۔ یہ تو ہمارے حضرت سے پ
کا ہے۔"

لکھنو کے ایک نواب صاحب "گڑھیا والے نواب" مشہور تھے۔ اس لیے کہ ا
مکان کے قریب ایک گڑھیا تھی۔ اُنھین کے وہان کسی تقریب مین محفل رقص و سر
تھی۔ ایک بھانڈ گھبرایا ہوا محفل کے سامنے آیا اور سب ساتھیون سے کہا "ا
اُٹھو تعظیم کرو۔" سب نے کہا "کس کی تعظیم کرین؟ کوئی ہے بھی؟" بولا "نواب صاح
آتے ہین۔" اور یہ کہہ کے ایک ہانڈی جو کھولی تو ایک بڑا سا مینڈک اُچھل کے
بیچ محفل مین بیٹھ گیا۔ اور سب سے کہنا شروع کیا "جلدی اُٹھو جلدی اُٹھو۔"
ساتھیون نے حیران ہو کے پوچھا "آخر کس کے لیے اُٹھین؟" کہا "تم نے پہچا
نہین۔ آپ گڑھیا کے نواب ہین۔"

اُن لوگون کی نسبت مشہور تھا کہ جس کے وہان جا کے ناچتے اُس کی نقل ضرور کرتے
اور ممکن نہ تھا کہ اُس پر چوٹ نہ کرین۔ اور سچ یہ ہے کہ جیسی جیسی خوبصورتی سے
ان لوگون نے اُمرا و رؤسا کو سبق دیے ہین اور اُن کی لغزشون پر اُنھین متنبہ
کیا ہے اور کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ اسی طرح نقالی مین جس کی نقل کرتے اُ
ایسا مکمل بہروپ بھرتے اور ایسا سچا کیرکٹر دکھاتے کہ لوگ عش عش کر جاتے
آج کل انگریزون کی صحبت مین جس طرح "بابو انگلش" کا مضحکہ اُڑا کرتا ہے اُ
دنون کایتھون کی فارسی آمیز اُردو کا مضحکہ اُڑا کرتا تھا۔ اُنکی نقل اور دیوا
جی کا کیرکٹر ایسا اعلیٰ درجے کا یہ بھانڈ دکھایا کرتے تھے کہ لوگ محو حیرت ہو جا
یہان دو سرا کربلا بھانڈ نصیر الدین حیدر کے زمانے تک موجود تھا۔ اُسکے بعد سح
قائم۔ دائم۔ رجبی۔ نوشاہ۔ بی بی قدر وغیرہ کی شہرت ہوئی۔ علی نقی خان ن

اپنی بی بی کے جن کا بہت کچھ دور دورا تھا قائم کی سبیل دیکھنے کو آئے جسے وہ خوب سجتا اور شربت پلایا کرتا تھا۔ ان معزز زائرون کو دیکھتے ہی قائم سامنے آگیا اور ہاتھ جوڑ کے کہا "خدا نواب صاحب کو سلامت اور بیگم صاحب کو قائم رکھے!" اتنا سخت فقرہ تھا مگر نواب اور بیگم دونون کو انعام ہی دیتے بنی۔ قائم کا کمال یہ تھا کہ ایک مرتبہ ساڑھے تین گھنٹے تک فقط طرح طرح کے مُنہ بناتا رہا۔

آخر زمانے مین فضل حسین۔ کھلونا۔ بادشاہ پسند۔ کیا خوب کے طائفے بہت مشہور رہے تھے۔ اب بھی علی جان غنیمت ہے۔ یہ اُن طائفون کے ناچنے والون کے نام ہین جنھون نے رقص مین بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ اور جو اب نہ رکھتے تھے۔

مگر لکھنؤ کی سوسائٹی پر ان سب لوگون سے زیادہ اثر ڈومنیون کا پڑ گیا تھا۔ تمام قصبات اور کُل شہرون مین شادیون مین گانے والی میراثنین اور ڈھاڑنین مدت ہائے دراز سے ہوتی آئی ہین۔ جن کی وضع ڈفالیون کی طرح ہمیشہ یکسان رہی مگر ڈومنیون نے لکھنؤ مین عجیب نمایان ترقی کی۔ ڈھول کو چھوڑ کے اُنھون نے رنڈیون اور مردانے طائفون کی طرح طبلہ سارنگی اور مجیرے اختیار کیے۔ صرف گانے کی حد سے ترقی کر کے ناچنا شروع کیا۔ اور اسی پر کفایت نہ کی بلکہ بھانڈون کی طرح زنانی محفلون مین نقلین بھی کرنے لگین۔ شادی کی تمام رسمون کا وہ سب سے بڑا عنصر بن گئین۔ اور دولتمند گھرانون کی بیگمون کو ایسا گرویدہ کر لیا کہ کوئی محل اور کوئی ڈیوڑھی نہ تھی جس مین ڈومنیون کا کوئی طائفہ نوکر ہو۔ اُن مین سے اکثر گانے اور ناچنے مین بیمثل ہوتی تھین۔ اور ایسے نور کے گلے پائے تھے کہ زنانی محفلین مردانی محفلون سے زیادہ شاندار اور حد درجہ دلکش و پُر لطف ہو گئین۔ خصوصاً محفلون مین اُنکی شوخیان اور جدت طرازیان ایسی دلفریب ہوتی تھین کہ مردون کو اکثر تمنا رہتی تھی کہ کسی طرح ڈومنیون کا مجرا دیکھنے کا موقع ملے۔ اس لیے کہ ڈومنیان مردانی صحبتون مین گانا ناچنا کسی طرح گوارا نہ کرتی تھین۔ اب بھی ڈومنیان کثرت سے موجود ہین۔ اور اُسی شان و وضع

پر ہین - مگر کمال اُٹھ گیا - حسبی حسبی نامی نئے دار اور گلے باز ڈومنیان لکھنؤ مین گذر گئین ویسے گوئیے بھی کہین نہ پیدا ہوے ہون گے -

(۲۵)

ناچنے کی اُستادی اگرچہ مردون ہی مین مخصوص ہے مگر علی العموم حسن وسعت اور تعمیم کے ساتھ گانے والی رنڈیون نے اس فن کو ترقی دی مردون سے ممکن نہین ناچنے کو عورتون کے ساتھ خصوصیت اور موزونیت بھی زیادہ ہے یہ چیز ایک حد تک ہندوستان کے ہر شہر مین نظر آئیگی - مگر جیسی باکمال ناچنے اور بتانے والی رنڈیان لکھنؤ مین پیدا ہوئین شاید کسی شہر مین نہ ہوئی ہونگی - آج سے چالیس سال پیشتر لکھنؤ کی ایک مشہور رنڈی "منصرم والی گوہر" نے کلکتے مین جاکے نمود حاصل کی تھی مین نے ایک محفل مین اُس کا یہ رنگ دیکھا کہ کامل تین گھنٹے تک ایک ہی چیز کو ایسی خوبی سے بتاتی رہی کہ حاضرین محفل (جن مین مٹیا برج کے تمام باکمال ڈھاڑی اور معزز لوگ موجود تھے) اول سے آخر تک محو حیرت وسکوت تھے - اور کوئی بچہ بھی نہ تھا جو ہمہ تن غرق نہ ہو - زہرہ ومشتری شاعرہ اور صاحب کمال گانیوالیان ہی نہین بے نظیر رقاصہ بھی تھین - جدن نے ایک مدت تک زمانے کو اپنے رقص وسرود کا گرویدہ رکھا ہے -

یہان کی رنڈیان عموماً تین قومون کی تھین - اول کنچنیان جو اصلی رنڈیان تھین اور اُن کا پیشہ علی العموم عصمت فروشی تھا - دہلی اور پنجاب انکے اصلی مسکن تھے - جہان سے اُنکی آمد شجاع الدولہ ہی کے زمانے سے شروع ہوگئی - شہر کی نامی رنڈیان اکثر اسی قوم کی ہین - دوسرے چونے والیان - اُن کا اصلی کام چونا بیچنا تھا مگر بعد کو بازاری عورتون کے گروہ مین شامل ہوگئین - اور آخر مین انھون نے بڑی نمود حاصل کی - چونے والی حیدر جس کے گلے کا شہرہ تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اُسکا سا گلا کسی نے پایا ہی نہین اِسی قوم کی تھی - اور اپنی برادری کی رنڈیون کا بڑا گروہ رکھتی تھی - تیسری ناگرنیان - یہ تینون وہ شاہدان بازار ہین جنھون نے اپنے گروہ قائم کرلیے ہین اور برادری رکھتی ہین ورنہ بہت سی اور قومون کی عورتین بھی آوارگی مین پڑنے کے بعد اسی گروہ مین

شامل ہو جاتی ہیں۔

گویوں اور ناچنے والوں کے بعد یہاں اُسی نوعیت کا ایک اور گروہ بھی ہے جس کا نشو و نما لکھنؤ میں بہت ہوا۔ اور اُسے لکھنؤ کے ساتھ مخصوص کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ وہ رہس والے ہیں۔ رہس خاص متھرا اور برج کا فن ہے وہیں کے رہس دھاریوں نے آ آ کے لکھنؤ کو اُس کا شوق دلایا۔

واجد علی شاہ کو جب رہس پسند آیا تو اُنھوں نے اپنے مذاق اور اپنے خیالی پلاٹ کا ایک نیا رہس تیار کیا۔ اُسکو دیکھتے ہی دعایا میں اس بات کا خاص شوق پیدا ہوا کہ عاشقانہ قصے جو اُن دنوں پریوں کے حسن و عشق سے زیادہ وابستہ تھے عملی صورت میں دکھائے جائیں۔ پبلک کا یہ رجحان دیکھ کے میاں اَمانت نے جو رعایت لفظی میں کمال رکھنے والے ایک مشہور شاعر تھے اپنی اندرسبھا تصنیف کی۔ جس میں ہندوؤں کی دیومالا میں مسلمانوں کے فارسی مذاق کی آمیزش کا پہلا نمونہ نظر آیا۔

یہ اندرسبھا جیسے ہی شہر میں دکھائی گئی ہر شخص دالہ و شیدا ہو گیا۔ یکایک بیسیوں سبھائیں شہر میں قائم ہو گئیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا اس قدر رواج ہوا کہ گویوں اور ناچنے والی رنڈیوں کا بازار چند روز کے لیے سرد پڑ گیا۔ اب امانت کے سوا اور بہتیرے لوگوں نے نئی سبھائیں بنانا شروع کیں۔ جن میں اُردو شاعری چاہے بگڑتی ہو مگر زبان منجھتی اور پورب کی دیہاتی اور ہندو اہل حرفہ کی آبادی میں سرایت کرتی جاتی تھی۔ اس مذاق نے ڈراما اور تھیٹر کی مضبوط بنیاد ڈال دی تھی۔ اور اگر چند روز اور شاہی کا دَور رہتا تو بہت اچھے اصول پر خالص ہندستانی ناٹک ایک خاص صورت پیدا کر لیتا جو بالکل اچھوتی اور ہندوستانی مذاق میں ڈوبی ہوتی۔

مگر یکایک مہذب سوسائٹی کو جس میں پرانی موسیقی گھر کر چکی تھی ان کھیلوں میں ابتذال نظر آیا۔ فن موسیقی کے شوق نے شرفا کو پھر گویوں اور مجرا کرنیوالے طائفوں کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور یہ چیزیں جو ناٹک کی شان رکھتی تھیں عوام الناس اور بازاری لوگوں ہی تک محدود رہ گئیں۔ مگر اسکے ذوق نے شہر میں

اُس مذاق کو عملی صورت مین دکھانے والا ایک خاص گروہ پیدا کر دیا جن کو آج کل کی اصطلاح مین ایکٹر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا - ہمارے یہ ایکٹر پہلے تو مہذب سوسائٹی کی قدر دانی سے زبان اُردو مین ترقی کرتے جاتے تھے - مگر چونکہ اُن کا شمار ادنیٰ درجے کے بازاری لوگون مین رہ گیا ہے اسلیے وہ مہذب زبان چھوٹ گئی - بازاری زبان مین آج کل بھی یہ لوگ بیسیون طرح کے پرفارمنس دکھاتے ہین-

ہمارے ان ایکٹرون کے مبتذل ہو جانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ بمبئی کے پارسیون نے انگریزی مذاق کے تھئیٹر کھڑے کیے - جن مین سچ یہ ہے کہ نہ فن موسیقی ہی تھا اور نہ صحیح ایکٹ - مگر اُن کی صفائی - ترتیب - طلسم نمائی اور اُنکے زرق برق پردون نے ہمارے قومی ڈراما کا جو ایک بچّے کی طرح ہنوز گہوارے مین تھا گلا گھونٹ دیا - اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ ناٹکون کی شانداری پر فریفتہ ہو کے صحیح مذاق کو بھول گئے -

سچ یہ ہے کہ بمبئی کے تھئیٹرون نے ہندوستان کو بلحاظ فنون رقص و سرود کے بیحد نقصان پہونچا دیا - سب سے پہلے موسیقی کو تباہ کیا - اور ایسی وضع کے بے اصول نغمون کو اختیار کر کے بازارون مین پھیلا دیا جن سے زیادہ مہمل کوئی چیز نہین ہو سکتی - اس کے بعد اُس نے ہمارے رقص کو جو بہت ہی اعلیٰ درجے کا فن تھا مٹانا چاہا - اور اپنے اسٹیج پر ناچ کے نام سے یورپ کے "ڈرل" کو رواج دیا - جس مین چند لڑکے اپنی ترتیب اور وضع بدل کے دلچسپی پیدا کر دیا کرتے ہین - لیکن رہس والون کا موسیقی اور ایکٹ اگرچہ دونون ناقص ہین مگر وطنی رنگ مین ڈوبے ہین اور قومی مذاق رکھتے ہین - اُن کے چھوڑنے کی نہین بلکہ اُن کی اصلاح کی ضرورت ہے -

(۳۶)

موسیقی ہی کے سلسلے مین سوزخوانی کے بیان کرنے کی ضرورت ہے - اگرچہ اس نئے مذہبی فن کو گانے بجانے کے خلاف شرع فنون مین داخل کرنا بے ادبی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ سوزخوانی ایک خاص قسم کی موسیقی ہی ہے - محرّم مین

شہادت سبط جعفر علیہ السلام کی یاد تازہ کرنا ہندوستان مین خاص شیعون سے شروع ہوا۔ خصوصاً اُسوقت سے جبکہ مذہب اثنا عشری ایران کا قومی مذہب بنا اور وہان کے لوگ آ آ کے ہندوستانی دربار مین رسوخ حاصل کرنے لگے۔ تاہم دہلی مین چونکہ تاجدارون اور شاہی خاندان کا مذہب سنت وجماعت تھا اس لیے وہ خاص چیزین جو شیعون کے مذہبی معاشرت کے ساتھ مخصوص تھین وہان نشو ونما نہ پا سکین۔ اس لیے اُن فنون کی پرورش کا گہوارہ شہر لکھنؤ اور اُس کا اگلا شیعہ دربار قرار پا گیا۔

جس طرح مذہبی سرگرمی نے شاعری مین مرثیہ گوئی اور تحت اللفظ خوانی کو پیدا کیا اُسی طرح موسیقی مین سوزخوانی پیدا کردی۔ پھر ان دونون فنون کو یہان تک ترقی دی کہ مستقل فن بن گئے۔ اور ایسے فن جو ابتدا سے انتہا تک لکھنؤ ہی کے ساتھ مخصوص ہین۔ تحت اللفظ خوانی مرثیون کا متانت اور بے تکلفی کے ساتھ اس طرح پڑھنا اور بتا بتا کے سُنانا ہے جس طرح شاعر مشاعرے مین اپنی غزل سُناتا ہے۔ اور سوزخوانی اُن کو پُرسوز وگداز نغمے کے ساتھ سُناتا ہے

اصلی اور پُرانی مرثیہ خوانی سوزخوانی ہی تھی۔ یعنی مرثیے مجلسون مین ہمیشہ نغمے کے ساتھ سُنائے جاتے تھے۔ اور اُن کا رواج دہلی ہی نہین ہندوستان کے اُن تمام شہرون مین تھا جن مین حضرات شیعہ آباد تھے۔ مدراس اور دکن تک مین زور وشور سے اُس قسم کی مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ اور ڈیڑھ دو سو برس کے تصنیف کیے ہوے نسخے آج تک موجود ہین۔ مرثیون کو شاعرون کی شعرخوانی کے لہجے مین ادا کرنا خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ اور اس مین میر انیس اور مرزا دبیر وغیرہ نے جو کمالات دکھائے اُن کا ذکر ہم شاعری کے سلسلے مین کر چکے ہین۔

سوزخوانی اگرچہ پہلے سے تھی اور ہر جگہ تھی مگر اُس مین بھی لکھنؤ کے سوزخوانون نے ایسے ایسے کمال دکھائے کہ اس فن کو بھی اپنے ساتھ مخصوص کر لیا۔ سارے ہندوستان کی اگلی سوزخوانی کا اندازہ اس مثل سے ہو سکتا ہے کہ "بگڑا گویا مرثیہ خوان"۔ لکھنؤ نے سوزخوانی کا پایہ اس قدر بلند کر دیا کہ صاحب کمال گویون کا بازار بھی سوزخوانون کے آگے سرد پڑ گیا۔

لکھنؤ مین سوزخوان دیگر اہل فن کی طرح نواب شجاع الدولہ کے ساتھ یا اُنکے عہد مین آئے۔ تاریخ فیض آباد مین لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم صاحبہ کے محل مین مجلسین ہوتین۔ اور جواہر علی خان خواجہ سرا جو اُن کی ڈیوڑھی اور سارے علاقے کا مختار تھا مرثیہ خوانون کی نوحہ خوانی سنا کرتا۔ مگر اُسوقت تک یہان کی سوزخوانی وہی تھی جو ہر جگہ عام تھی۔

بعض لوگ کہتے ہین کہ خواجہ حسن مودودی سے یہ فن شروع ہوا۔ وہ مصنف نغمات الاصفیہ کے اُستاد تھے اور باوجود عطائی ہونے کے فن موسیقی مین ایسا کمال رکھتے تھے کہ دُور دُور تک کہین اُن کا جواب نہ تھا۔ اگرچہ سُنی المذہب تھے مگر اُنھون نے موسیقی کی خاص خاص دُھنین سوزون مین قائم کر کے اپنے شاگردون کو بتائین اور اس فن کے باضابطہ و باقاعدہ بننے کی بنیاد پڑ گئی۔ اسکے بعد جب بڑے حیدری خان کا زمانہ آیا تو اُن کا معمول تھا کہ محرم مین اپنے مذاق کی مناسب دھنون مین نوحہ خوانی کیا کرتے۔ چونکہ وہ بہت بڑے صاحب کمال گویے تھے۔ اور دربار قدردان تھا اس کوشش مین اُن کو نمایان کامیابی حاصل ہوئی اور پتہ لگ گیا کہ اگر ترقی دی جائے تو یہ فن جداگانہ طور پر ایک خاص اور ممتاز شان پیدا کر سکتا ہے۔ موسیقی کی ہزارہا دھنون مین سے وہ دُھنین منتخب کی گئین جو اظہار حزن و ملال اور بین کے لیے مناسب ہون۔ اور وہ صدہا سوزون مین قائم کی گئین۔ آخر مین حیدری خان نے اپنی سوزخوانی سید میر علی صاحب کو سکھا دی جو ایک شریف النسل سیدزادے تھے۔ اور اُنھون نے مذہبی جوش مین اس فن کو بہت زیادہ ترقی دی۔ اور اپنے زمانے مین استنے بڑے صاحب کمال مشہور ہوے کہ نواب سعادت علی کے عہد مین اُنھون نے کسی بات پر برہم ہو کے لکھنؤ سے چلے جانے کا ارادہ کیا تو انشاء اللہ خان نے اپنے موثر شاعرانہ انداز اور تمسخر کی شان سے سفارش کی۔ اور نواب نے دلدہی و قدردانی کے ساتھ اُنھین رُوکا۔

اس کے بعد تانسین کے خاندان کا ایک گویا ناصر خان لکھنؤ مین آیا اور چمکا۔ یہان سوزخوانی کی طرف لوگون کا توغل دیکھا تو اُس نے بھی اپنے موسیقی کے کمال

کو نوحہ خوانی میں صرف کرکے مقبولیت و شہرت حاصل کی - اور اپنے پڑوس کی ایک مفلس و بیوہ سیدانی پر ترس کھا کے اُن کے دو بچوں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کو سوز خوانی کی تعلیم دی - ان دونوں کا کمال تمام سبق اُستادوں سے بڑھ گیا - اور سوز خوانی میں بے عدیل و نظیر ثابت ہوئے - اُنھوں نے سوز خوانی کو اعلیٰ درجے کا راگ بنا دیا ہے - یہان تک کہ موسیقی کے اصلی راگوں کے بول تو اکثر گویوں تک کو یاد نہیں مگر ایسے سوز اکثر سوز خوانوں کو یاد ہیں جو راگوں کے بول ہیں جن کو سُن کے حقیقی راگ اور سچی دُھنیں متاثر طور پر سمجھ لی جا سکتی ہیں -

انھیں بزرگوں کی وجہ سے لکھنؤ میں سوز خوانی کا فن گویوں سے نکل کے شرفا میں آ گیا - اور کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو ڈوم ڈھاری نہیں شریف و وضع ہیں - مگر سوز خوانی میں ایسا کمال رکھتے ہیں کہ گویوں کا بازار اُن کے سامنے سرد پڑ گیا ہے -

فی الحال منجھو صاحب اور دو ایک اور بزرگ سوز خوانی میں ایسا کمال اور ایسی شہرت رکھتے ہیں کہ ہندوستان بھر میں ہر جگہ اُنکے استقبال میں شوق کی آنکھیں بچھائی جاتی ہیں - اور دیگر بلاد کے لوگوں کی قدردانی ماہ محرم اور عزاداری کے خاص ایام میں ہمیشہ اُنھیں شایقین لکھنؤ کے ہاتھ سے چھین لیا کرتی ہے -

سب سے زیادہ اثر اس مذاق نے لکھنؤ کی عورتوں پر ڈالا - سوزوں کی مؤثر اور دل کو پاش پاش کر دینے والی دُھنیں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کے

عہ موسیقی میں اُن کے کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مرہٹوں کی دست برد کے زمانے میں وہ میانے میں سوار لکھنؤ سے اٹاوے کی طرف جا رہے تھے - راستے میں کسی گانوں میں گذر ہوا اور سُنا گیا کہ اُس گانوں پر مرہٹے تاخت کرنے والے ہیں - کہاروں نے جو بہت دور سے اُنھیں لیے چلے آتے تھے یکایک میانہ رکھ دیا اور کہا ہم میں اب آگے چلنے کی طاقت نہیں ہے - ہزار کہا گیا کہ یہ مقام خطرناک ہے مگر اُنھوں نے ایک نہ سُنی - خواجہ صاحب نے زندگی سے مایوس ہو کے وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھی اور بیٹھے بیٹھے کچھ الاپنا شروع کیا اور اُس کا کہاروں پر اس قدر اثر پڑا کہ تازہ دم ہو گئے اور امن کی جگہ پہونچا دیا -

گلے سے نکلتے ہی صدہا شریف مردون کے گلے مین اُتر پڑا اور اُن کے ذریعے سے ہزارہا شریف شیعہ خاندانون کی عورتون کے نوکے گلون مین اُتر گئین - عورتون کو فطرۃً گانے بجانے کا زیادہ شوق ہوتا ہے - اور اُن کے گلے نغمون کے لیے عموماً زیادہ موزون ہوا کرتے ہین - یہ با اصول اور با قاعدہ نوحہ خوانی عورتون مین پہونچی تو اُس مین قیامت کی دلکشی پیدا ہو گئی - اور چند روز مین شیعہ ہی نہین اور سنّی طبقے کی سنّیون کی عورتون مین بھی نوحہ خوانی کا شوق پیدا ہو گیا - اور یہ حالت ہو گئی کہ محرم مین اور اکثر مذہبی عبادتون کے ایام مین لکھنؤ کے گلی کوچون مین تمام گھرون سے پُرسوز و گداز تانون اور دلکش نغمون کی عجیب حیرت انگیز صدائین بلند ہوتی ہین - اور کوئی مقام نہین ہوتا جہان یہ سمان نہ بندھا ہو - آپ جس گلی مین کھڑے ہو کے سننے لگیے ایسی دلکش آوازین اور ایسا ایسا ست و بجوو کرنے والا نغمہ سننے مین آ جائے گا کہ آپ زندگی بھر نہین بھول سکتے - ہندوون اور بعض خاص خاص سنّیون کے مکانون مین تو خاموشی ہوتی ہے - باقی جدھر کان لگائیے نوحہ خوانی کے قیامت خیز نغمون ہی کی آوازین آتی ہوتی ہین -

تعزیہ داری چونکہ نوحہ خوانی کا بہانہ ہے - اس لیے سنّی اور شیعہ دونون گروہون کے گھرون مین نوحہ خوانی کے شوق مین تعزیہ داری ہونے لگی - اور سنّی مسلمان ہی نہین ہزارہا ہندو بھی تعزیہ داری اختیار کر کے نوحہ خوانی کرنے لگے - جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ مین تعزیہ داری کے بہت زیادہ بڑھنے اور فروغ پانے کا زبردست باعث نوحہ خوانی ہے -

لکھنؤ مین بعض شریف شائستہ اور تعلیم یافتہ عورتین ایسی اچھی سوز خوان ہین کہ اگر پردے کی روک نہ ہوتی تو مرد سوز خوان اُنکے مقابلے مین ہرگز فروغ نہ پا سکتے - اس کو بہت مدت ہوئی کہ ایک سال چہلم کے موقع پر چند احباب کے ساتھ مین تال کٹورے کی کربلا مین گیا تھا اور وہین ایک خیمے مین شب باش ہوا تھا - دو بجے رات کو یکایک آنکھ کھلی تو ایک ایسے دلکش نغمے کی آواز کان مین آئی جس نے سب دوستون کو جگا کے بیتاب کر دیا - ہم سب اُس آواز کے شوق مین خیمے سے نکلے - اور دیکھا کہ آخر شب کا سناٹا ہے - چاندنی کھیت کیے ہوے ہے

اور اُس مین عورتون کا ایک غول تعزیہ لیے ہوے آرہا ہے - سب بال کھولے
اور سر برہنہ ہین - بیچ مین ایک عورت شمع ہاتھ مین لیے ہے - اس کی روشنی مین
ایک حسین سرو قد نازنین چند اوراق مین سے پڑھ پڑھ کے نوحہ خوانی کر رہی ہے
اور کئی اور عورتین اُس کے ساتھ گلے بازی کر رہی ہین - اُس سناٹے - اُس وقت
اُس چاندنی - اُن برہنہ سر حسینون - اور اُس پُر سوز وگداز نغمے نے جو سماں
پیدا کر رکھا تھا اُس کو مین بیان نہین کر سکتا - نازک اداؤن کا یہ مجمع جیسے ہی
کربلا کے پھاٹک مین داخل ہوا اُس سرو قامت نازنین نے پرچ کی دھن مین
یہ نوحہ شروع کیا -

جب کاروان شہر مدینہ لُٹا ہوا پہونچا قریب شام کے قیدی بنا ہوا
نیزے پہ سر حسینؑ کا آگے دھرا ہوا اور پیچھے پیچھے بیبیون کا سر کھلا ہوا

اس مناسب حالت مرثیے نے یکایک ایسا سماں باندھ دیا کہ شبہہ ہوتا تھا کہ ان
اشعار کے ذریعے سے وہ خاتون واقعۂ کربلا کی تصویر کھینچ رہی ہے - یا خود اپنے
اس ماتمی جلوس اور اپنے داخلۂ کربلا کی -

اصل یہ ہے کہ لکھنؤ کی عورتون اور اُن کے ساتھ مردون پر بھی سوزخوانی
وعزاداری نے جو نمایان اثر ڈالا ہے اور کسی چیز نے نہین ڈالا - اسکی پہلی
برکت تو یہ ہے کہ تمام عورتین بہت اچھی گلے باز ہوگئین - اور موسیقی کے سچے
اصول کے ساتھ نوحہ خوانی کرنے لگین - دوسری برکت یہ ہے کہ سارے اہل شہر
کو عام اس سے کہ مرد ہون یا عورت موسیقی کے ساتھ مناسبت ہوگئی - یہ جو لکھنؤ
کے گلی کوچون مین دیکھا جاتا ہے کہ ادنیٰ درجے کے لڑکے اور بازاری لوگ اکثر
چلتے چلتے گانے لگتے - اور گانے مین ایسی گلے بازی کرتے اور مشکل سے مشکل
دھنون کو اس آسانی سے اُڑا لیتے ہین کہ باہر کے لوگون کو حیرت ہو جاتی ہے -
اس کا اصلی باعث یہ نوحہ خوانی و سوزخوانی کا مذاق ہے - اور تعریف کی بات
یہ ہے کہ سوزخوانی کا نشو ونما باوجود عوام الناس اور ادنیٰ درجے کے جہلا مین
پھیلنے کے صحیح اصول پر رہا اور موسیقی کے صحیح مذاق سے باہر نہین ہونے پایا
بخلاف اور چیزون کے جو عوام مین پہونچتے ہی بے قاعدہ اور خراب ہوجایا کرتی ہین

سوز خوانی کو گو کہ عوام شیعہ موجب ثواب تصور کرتے ہین - مگر علمائے شیعہ نے اسوقت تک اسکے جواز کا فتوے نہین دیا ہے - وہ پابندی شرع مین متشدد ہین اب تک مجتہدین اور ثقہ لوگون کی مجلسون مین صرف حدیث خوانی یا تحت اللفظ خوانی ہوتی ہے - اور عوام کی جن مجالس مین علمائے شریعت شریک ہوتے ہین اُن مین بھی اُن کے سامنے سوز خوانی نہین ہوتی - لیکن اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ سوز خوانی نے اپنی عام مقبولیت کی وجہ سے علما کے فتوون پر پوری فتح پالی ہے - مشکل یہ ہے کہ اہل سنت کے علمائے حدیث اور مشائخ صوفیہ کے نزدیک تو غنا کے جواز کی بہت گنجایش ہے - مگر شاید فقہ اثنا عشری مین اتنی گنجایش نہین - ورنہ اس فن نے اب تک سند جواز حاصل کر لی ہوتی -

(۲۷)

ارباب نشاط اور فن موسیقی اور اُس سے نکلے ہوے فنون کے متعلق ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہین - لیکن اسی سلسلے مین بازاری باجون کا حال بیان کرنا باقی ہے - لہذا آج ہم یہ بتاتے ہین کہ اُن باجون پر لکھنؤ کا کیا اثر پڑا - اور اسی پر ہم موسیقی کی بحث ختم کر دین گے - باجون کے جوڑ جو شادی وغیرہ کے جلوسون کے ساتھ جاتے ہین چھ طرح کے ہین - (۱) ڈھول تاشے - (۲) روشن چوکی (۳) نوبت (۴) تُرہی اور قرنا - (۵) ڈنکے اور بگل (۶) انگریزی باجا جو ارگن باجا کہلاتا ہے اور روز بروز زیادہ رواج پاتا جاتا ہے -

پہلا یعنی ڈھول تاشا ہندوستان کا قدیم نیشنل باجا ہے جس کا انگریز انڈین ٹام ٹام "نام رکھ کے اپنی عدم واقفیت اور جہالت سے مضحکہ اُڑاتے ہین - ۱۸۹۶ء مین جب انگلستان کی تماشگاہ "ارلس کورٹ" مین ہندوستانی معاشرت اور یہان کے فنون و مشاغل کے صدہا نمونے دکھائے گئے تھے تو وہان اس باجے کا نمونہ مین نے خود اپنی آنکھ سے یہ دیکھا کہ ایک نہایت ہی سیاہ فام شخص جسکے بدن پر سوا ایک میلے لنگوٹے کے کچھ نہ تھا - عام مجمع مین برہنہ آکے کھڑا ہو جاتا اُسکے گلے مین ایک ڈھول ہوتی - اور وہ نہایت ہی وحشیانہ طریقے سے بغیر کسی لے اور ترتیب کے مجنونون کی طرح سر ہلا ہلا کے زور زور سے ڈھول کو لکڑی

سے پیٹنے لگتا۔ اور کہا جاتا کہ یہی ہندوستان کا باجا "تام تام" ہے۔ مگر یہ اُن لوگوں کی جہالت و بے عقلی ہے۔ یہ بہت ہی مکمل باجا ہے۔ اور اس کا بجانا ایک باقاعدہ فن ہے جس میں نہایت اعلیٰ درجے کی لَے رکھی گئی ہے۔

اس میں لکھنؤ میں عموماً دو اور کبھی تین تین چار چار بڑے ڈھول ہوتے ہیں۔ اور کم سے کم ایک ورنہ دو تین تاشے والے ہوتے ہیں۔ اور کم سے کم ایک جھانجھ والا ہوتا ہے۔ جھانجھ کا پتہ ایران وغیرہ میں بھی ملتا ہے۔ اور تاشے مصر وغیرہ میں بھی مروج ہیں۔ مگر ڈھول خالص ہندوستان کی چیز ہے۔ لکھنؤ میں یہ باجا فوجوں اور خوش باشوں کے ساتھ دہلی سے آیا۔ مگر دہلی میں اسکے جوڑ میں صرف ڈھول اور جھانجھیں تھیں۔ تاشے لکھنؤ میں بڑھائے گئے۔ اور رواج پاتے ہی اس قدر ضروری اور اہم نظر آئے کہ معلوم ہوا جیسے اُن سے اس باجے میں جان پڑ گئی۔ اگرچہ اکثر شہروں میں صرف ڈھول اور جھانجھیں ہی ہوتی ہیں مگر لکھنؤ میں تاشے جزو لازمی ہو گئے ہیں۔ اور بغیر اسکے ڈھولیں کہیں بجتی ہی نہیں ہیں۔ مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس باجے میں سب سے زیادہ کمال وہی شخص دکھاتا ہے جو تاشا بجاتا ہے۔ وہی لَے قائم کرتا ہے اور لَے میں اُس کی پیروی ڈھول والے کرتے ہیں۔ تاشا بجانے کی یہ صفت ہے کہ اتنی جلدی جلدی ضربیں پڑیں کہ ایک قرعے کا دوسرے سے امتیاز نہ ہو سکے۔ اور اُن متواتر و مسلسل قرعوں سے نشیب و فراز یا زیر و بم سے لَے اور گت پیدا ہو۔ لکھنؤ میں اس باجے کے بجانے والے ایسے ایسے اُستاد تھے کہ انھوں نے اس معمولی باجے کو جو سب جگہ بے اصول تھا بہت ہی باقاعدہ بنا دیا۔ اور اب بھی یہاں ایسے چابکدست بجانے والے پڑے ہیں کہ اُنکے سامنے کسی شہر کے ڈھول بجانیوالے نہیں بجا سکتے۔

لکھنؤ میں چہلم کے بعد ایک تعزیہ اُٹھتا ہے جو تحشو کا تعزیہ کہلاتا ہے۔ اب تو اُسکے جلوس نے شیعوں سنیوں کے جھگڑے کی وجہ سے دوسری صورت اختیار کر لی ہے۔ مگر دس بارہ برس پہلے اُسکی شان یہ تھی کہ چونکہ شاہی کے ایک بڑے محب اہل بیت کی یادگار تھا۔ اور اب اُسکے اُٹھانے والے غریب و بے سروسامان

لوگ تھے اس لیے ہر قسم کے باجوں کے بے نظیر و بے بدل اُستاد ثواب سمجھ کے شریک ہوتے اور ثواب کے بہانے اپنے فنون کا کمال اہل شہر کو دکھاتے اور اسی وجہ سے اُن کا معمول تھا کہ جہاں کھڑے ہو گئے قدردانوں نے گھیر لیا۔ اور وہ گھنٹوں اُسی جگہ کھڑے اس بات کا دعوی کر رہے ہیں کہ کوئی ہے جو ہمارے سامنے آ کے بجائے؟ بڑے بڑے اُستاد گوئیے اُن کی داد دیتے اور وہ جوش میں آ آ کے اور زیادہ خوبی سے بجاتے۔ خصوصاً اُن میں تاشا بجانے والے بڑے اُستاد ڈھاڑی ہوتے جو موسیقی میں کمال رکھتے اور گتوں میں جدتیں پیدا کرتے۔

ڈھول تاشا بجانے کے فن کے اہم اور با اصول ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ آخری معزول تاجدار اودھ واجد علی شاہ کو جو موسیقی کے اُستاد بے بدل تھے میں نے کلکتے میں اپنی آنکھ سے دیکھا کہ محرم کی ساتویں تاریخ جب مہندی کا جلوس اُن کی آسمانی کوٹھی سے روانہ ہوتا تو وہ خود گلے میں تاشا ڈال کے بجاتے۔ بڑے بڑے گویوں کے گلوں میں بڑی بڑی ڈھولیں ہوتیں۔ معززین دربار گرد حلقہ باندھے ہوتے۔ اور وہ ایسی نزاکت اور خوبی سے تاشا بجاتے کہ ناواقف سُننے والے بھی عش عش کر جاتے۔ اور گویوں کی واہ وا تو ہمارے مشاعروں کے ہنگاموں کو بھی مات کر دیتی۔ اسی طرح میں نے اُنھیں کئی بار ڈھول بجاتے بھی دیکھا۔

بہر حال ہندوستان کے اس قدیم ترین باجے میں بھی لکھنؤ کی سوسائٹی نے اپنا تصرف کیا۔ اور ایسا تصرف کیا جو نہایت ہی مقبول اور ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص آج کے یہاں کے تاشہ نوازوں کا کمال دیکھے تو اُسے معلوم ہوگا کہ کس قدر مناسب تصرف ہے۔ اور اُس نے ڈھول اور جھانجھ کو کس قدر اہم بنا دیا ہے۔

دوسرا جوڑ روشن چوکی کا ہے۔ روشن چوکی بہت پرانا باجا ہے اور اگر کل نہیں تو اُس کے اہم ترین اجزا کو مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ کیونکہ شہنائی اس کا اہم جز ہے۔ اور اس کی نسبت مشہور ہے کہ شیخ الرئیس ابن سینا کی ایجاد ہے۔ بالکل انسان کے گلے کی طرح جس قدر سچے سُر گلے بازی کے اعلیٰ ترین کمال کے ساتھ شہنائی

سے ادا ہوتے ہیں اور کسی باجے سے نہیں ادا ہوسکتے۔ روشن چوکی میں کم از کم دو شہنائی نواز ہوتے ہیں اور ایک طبلچی جسکی کمر میں چھوٹے چھوٹے دو طبل بندھے ہوتے ہیں۔ طبل لے کو قائم رکھتے ہیں۔ ایک شہنائی نواز اصلی سُر قائم رکھنے کے لیے سُر دیتا رہتا ہے اور ایک آواز کی حلیت پھرت اور گلے بازی کی مشق دکھاتا ہے۔ اور یہی اصلی شخص ہوتا ہے جو غزلوں یا ٹھمریوں وغیرہ کو عجب دلکش سروں میں ادا کرتا ہے۔

روشن چوکی ہندوستان کا خاص درباری باجا تھا۔ جو بادشاہوں اور اعلیٰ ترین امرا کے خاصے کے وقت سجا کرتی۔ رات کو آرام کے وقت روشن چوکی شاہی قصر کے گرد گشت کیا کرتی۔ اور اُس کا نغمہ دُور سے بہت ہی لطف دیتا۔ دولتِ مغلیہ میں یہ بہت ہی اہم اور لطیف باجا خیال کی جاتی۔ اور دہلی میں خدا جانے کب سے مروج تھی۔ یقیناً لکھنؤ میں روشن چوکی بجانے والے دہلی سے آئے ہونگے۔ مگر اسکے صاحب کمال ان اطراف میں بھی مدت سے موجود تھے۔ بنارس کے اکثر مندروں میں آج تک صبح کو روشن چوکی بجا کرتی ہے۔ اور تڑکے منہ اندھیرے کہیں قریب سے جا کے سُنیئے تو بہت ہی لطف آتا ہے۔

لکھنؤ میں علی العموم شادی کے جلوسوں میں روشن چوکی بجانے والے دولھا کے قریب رہتے ہیں۔ خصوصاً ہندوؤں کی براتوں میں راستے بھر قدم قدم پر اُنھیں انعام دیا جاتا ہے۔ روشن چوکی بجانے والے میرے خیال اور تجربے میں لکھنؤ سے اچھے آج کل کہیں نہ ملیں گے۔ جس قدر لے داری اور ہر چیز کو دلکش دُھنوں میں سچے سُروں کے ساتھ اہل لکھنؤ ادا کر لیتے ہیں اور کسی مقام کے روشن چوکی نواز نہیں ادا کر سکتے۔ اُنکے کمال اور فن دانی کا اندازہ اُسوقت ہو سکتا ہے جب کوئی شوق سے سُنے اور داد دیتا جائے۔ اُسی بخشو کے تعزیے میں جس کا ذکر آچکا ہے روشن چوکی بجانے والے بھی اپنا کمال دکھاتے تھے اور اس طرح جان توڑ کے کوشش کرتے تھے کہ پھر اُنکے بعد اور کسی کی شہنائی میں مزہ نہ آتا

تیسرا جوڑ نوبت کا ہے۔ ہمارے پُرانے نغمہ ہاے طرب میں یہ سب سے زیادہ عالیشان بینڈ ہے۔ اس میں دو تین شہنائی نواز ہوتے ہیں۔ ایک نقارہ بجانیوالا

ہوتا ہے جو دو بہت بڑے بڑے عظیم الشان نقاروں کو اپنے آگے خمیدہ رکھ کے دونوں کو ایک ساتھ چوبوں سے بجاتا ہے - ان نقاروں کی آواز بہت بڑی ہوتی ہے - اور گرد کی فضا میں بہت دور تک گونجتی ہے - اور ساتھ ہی ایک جھانجھ والا بھی رہتا ہے -

نوبت بھی تاریخی باجا ہے - اور اظہار شوکت کے لیے مدتوں کام میں لایا جا رہا ہے - تاریخ اسلام میں ہمیں دمشق و بغداد و مصر کے درباروں میں بھی اس کا پتہ لگتا ہے - بغداد میں عباسیہ کے دربائی دور میں ہر امیر کی ڈیوڑھی پر نوبت بجا کرتی تھی - اور موجب احترام و عظمت تصور کی جاتی - اور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہی یہ ہندوستان میں آئی - ممکن ہے کہ ہندوستان میں پہلے سے موجود ہو - اور گو کہ شہنائی نہ تھی مگر خالی نقارہ اور جھانجھ بجتی ہو - لیکن اصلی موجودہ صورت وہی ہے جو ایران و عراق میں مرتب ہونے کے بعد یہاں آئی -

بادشاہوں اور عالی مرتبہ امیروں کے جلوس اور لشکر کے ساتھ نوبت بہت ہی لازمی شے تھی - اولوالعزم تاجداروں کے جلوس کے آگے آگے ہاتھیوں پر نوبت بجتی جاتی - لڑائیوں میں غالب آنے والا گروہ اپنی فتحمندی اور غلبے کے اظہار کے لیے زور شور سے نوبت بجوایا کرتا - شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے حیدرآباد کو فتح کر کے اُس کے قریب ایک پہاڑی پر نوبت بجوائی تھی جو آج تک نوبت پہاڑ کہلاتی ہے - دولت مغلیہ میں دربار کے اعلیٰ ترین طبقے کے رئیسوں اور عہدہ داروں کو بادشاہ کی طرف سے نوبت کا حق دیا جاتا - جو اپنی ڈیوڑھیوں اور نیز اپنی سواری میں نوبت بجوایا کرتے - نوبت بجانے والوں کے لیے کوئی بلند برج منتخب کیا جاتا چنانچہ اکثر شاہی محلوں کے پھاٹکوں کے اوپر نوبت خانہ بنوا دیا جاتا ہے جس کے نمونے ہر بڑے شہر میں جہاں کوئی بڑا دربار رہ چکا ہو نظر آتے ہیں -

اسی قدیم رواج کی پیروی میں لکھنؤ میں آج تک معمول ہے کہ جس دولتمند شخص کے وہاں شادی یا کوئی خوشی کی تقریب ہوتی ہے تو اُس کے دروازے پر لمبی لمبی بَلّیاں کھڑی کر کے اور سرخ کپڑے اور پنی وغیرہ سے منڈھ کے عارضی طور پر ایک بلند نوبت خانہ بنوا دیا جاتا ہے

دن بھر ٹھہر کے مختلف اوقات میں باربابت بجایا کرتے ہیں ۔ علی ہذا القیاس جب براتین یا تعزیون کے جلوس چلتے ہیں اسی قسم کے مصنوعی نوبت خانے جو تختون پر بنا لیے جاتے ہین کہارون کو کندھون پر سب کے آگے آگے چلا کرتے ہین ۔ اور راستے بھر ان پہ نوبت بجتی جاتی ہے ۔

یہی نوبت اگلے دنون خصوصاً لکھنؤ کے دربار مین وقت پہچاننے کا ذریعہ قرار پاگئی تھی ۔ اُن دنون وقت کی تقسیم یہ چوبیس گھنٹون کی نہ تھی جو اب انگریزی گھڑیون کے رواج سے ہم مین مروج ہو گئی ہے ۔ ان دنون وقت کی تقسیم کا یہ حساب تھا کہ دن اور رات کے آٹھ پہر ہوتے ہین ۔ چار پہر دن کے اور چار پہر رات کے ۔ اور ہر پہر کی آٹھ گھڑیان ہوتین ۔ ہر نوبت خانے مین ایک پتیلے یا ناندے مین پانی بھرا رہتا ۔ اُس مین کٹورا جس کے پیندے مین ایک باریک سا سوراخ ہوتا تھا خالی کر کے ڈال دیا جاتا ۔ وہ پانی پر تیرتا رہتا تھا اس سوراخ سے آہستہ آہستہ اُس مین پانی آتا رہتا تھا ۔ اور وہ سوراخ اس حساب سے کر کے بنایا جاتا تھا کہ ایک گھڑی بھر مین پانی سے بھرتے بھرتے ڈوب جائے ۔ پہر شروع ہونے کے بعد جب پہلی مرتبہ کٹورا ڈوبتا تو ایک گھڑی بجائی جاتی ۔ جب دوبارہ ڈوبتا دو گھڑیان بجائی جاتین ۔ اسی طرح مسلسل آٹھ گھڑیان بجائی جاتین ۔ اور آٹھوین گھڑی کے ساتھ گجر بجایا جاتا ۔ یعنی پہلے ممتاز طور پہ آٹھ ضربین بجا کے گھڑیال پر ایک ساتھ بہت سی بے شمار ضربین جلدی جلدی لگا دی جاتین جس مین یہ اشارہ تھا کہ پہر پورا ہو گیا ۔ اور گھڑیون کا سلسلہ پھر ایک سے شروع ہو جاتا ۔

جن ڈیوڑھیون پر نوبت ہوتی وہان ہر پہر کے خاتمے پر تقریباً ایک گھڑی تک نوبت بجتی رہتی ۔ اس قریب سے رات دن کے آٹھ پہرون کی آٹھ نوبتین ہوئین ۔ مگر معمول یہ تھا کہ صرف سات ہی نوبتین بجا کرتین ۔ پہلی نوبت تڑکے نماز کے وقت یعنی پچھلے پہر کے آغاز پہ بجتی اور صبح کی نوبت کہلاتی ۔ دوسری اُس وقت جب ایک پہر دن آ جاتا ۔ یہ پہر دن چڑھے کی نوبت کہلاتی ۔ تیسری جب آفتاب نصف النہار پہ ہوتا ۔ یعنی ٹھیک بارہ بجے ۔ یہ دوپہر کی نوبت کہلاتی ۔ اسکے بعد

جب آٹھ گھڑیاں پوری ہو جاتیں تو تیسری نوبت بجتی - اور یہ تیسرے پہر کی نوبت کہلاتی - اس کے بعد چوتھا پہر ختم ہونے پر مغرب کے وقت نوبت بجتی - اور شام کی نوبت کہلاتی - اسکے بعد جب پانچواں پہر پورا ہو جاتا تو پانچویں نوبت بجتی جو پہر رات گئے کی نوبت کہلاتی - پھر جب چھٹا پہر گذرتا تو چھٹی نوبت بجتی جو آدھی رات یا دوپہر رات کی نوبت کہلاتی - اسکے بعد جب ساتواں پہر پورا ہوتا اور رات کے تین پہر گذر جاتے تو اُس وقت لوگوں کے آرام میں خلل نہ پڑنے پانے کے خیال سے نوبت نہ بجائی جاتی - صرف گجر بجا دیا جاتا - پھر اسکے بعد آٹھویں پہر کے خاتمے پر صبح کی نوبت بجتی -

اوقات کا یہ حساب تھا جو دربار مغلیہ مین اور نیز انتزاع سلطنت تک لکھنؤ مین مروج رہا - اور کلکتے میں جب تک واجدعلی شاہ زندہ رہے اسی حساب سے پہر اور گھڑیاں بجتی رہیں - مگر اتنے ہی دنوں مین وہ حساب اس قدر مفقود ہو گیا کہ اب شاذونادر ہی کوئی شخص ہوگا جو پہرون اور گھڑیون کا حساب جانتا ہو - مگر خرابی یہ ہے کہ باوجود شب و روز کی تقسیم اوقات کے بدل جانے کے اگلا حساب ہماری زبان کے رگ وپے مین سرایت کیے ہوے ہے - ہم کہتے ہین "گھڑی بھر مین آؤن گا" "دوپہر کو سوؤن گا" "پہر دن چڑھے کھانا کھاؤن گا" مگر ہم نہین جانتے کہ پہر کتنا ہوتا ہے اور گھڑی کسے کہتے ہین - ہم عموماً سُنا کرتے ہین کہ "پہرہ بیٹھ گیا" اور "پہرے کے سپاہی" مگر نہین جانتے کہ پہرے کا لفظ اُسی پہر سے نکلا ہے - اس لیے کہ اُن دنون پہر پہر بھر کی نوکری ہر ایک کو دینا پڑتی تھی - تقسیم اوقات کا یہ پُرانا حساب ہندوون کا ہے - مگر ایران مین بھی اگلے دنون یہی حساب مروج تھا - اور اسی حساب سے نوبت بجا کرتی تھی - ہمارے موجودہ حساب سے ایک پہر تین گھنٹون کا ہوا کرتا تھا -

نوبت نواز بھی لکھنؤ مین ایسے اعلیٰ درجے کے تھے کہ ہر جگہ اور ہر شہر میں یہیں سے جایا کرتے - یہاں کے استادون کے شاگرد ہوتے - لیکن نوبت مین کوئی ترقی یا اضافہ نہین ہوا - بجانے والون کی تعداد وہی رہی - باجے وہی رہے اور بجانے کا طریقہ وہی رہا - پھر بھی اتنا ضرور ہوا کہ لکھنؤ کے اسکول موسیقی نے

جن چیزون اور جن دُھنون کو منتخب کرکے عام سوسائٹی مین مقبول کرا دیا تھا وہی دُھنین اور چیزین نقارخانون مین بھی سُنی جانے لگین۔ مگر با وجود اسکے نوبت بجانے کا جو قدیم طریقہ تھا وہ بھی اپنی حد پر قائم رہا۔ امیر خسرو نے اپنے زمانے کی نوبت نوازی کی جو تصویر اپنی نظم مین دکھائی ہے اُس سے اُسوقت کی نوبت بجنے کے طرز کا بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہی طرز آج تک مروج ہے اور اُس مین بہت کم فرق آیا ہے۔ لیکن اسپر بھی شہنائی سے جو دُھنین اور گیت بجائے جاتے ہین اُن پر لکھنؤ کی موسیقی کا جو کچھ اثر پڑا ہے وہ سنتے ہی نظر آجاتا ہے۔

تُرہی اور قرنا ہندوستان کے بہت پُرانے قومی باجے ہین۔ جن کو فوجون کے ساتھ زیادہ خصوصیت تھی۔ تُرہی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزون کے ساتھ ہندوستان مین آئی اور اُنکے ورود کے ابتدائی دَور مین رواج پاگئی مگر قرنا خاص ایرانی باجا ہے۔ اور اُس کی آواز مین کچھ ایسا رعب وداب ہے کہ میدان جنگ مین رعب بٹھانے کے لیے زیادہ موزون ہے۔ ان دونون باجون کا بھی لکھنؤ کے جلوسون مین رواج ہے۔ لیکن مستقل باجے کی حیثیت سے نہین بلکہ فوجی دستون یا پلٹنون کے ساتھ ایک تُرہی نواز یا قرنا نواز رہا کرتا ہے جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنا باجا بجا کے اپنے گروہ کی موجودگی کی اطلاع دے دیا کرتا ہے۔ ان دونون باجون کے مقابل ہندوون کا قدیم باجا نرسنگھا ہے جو اکثر ہندوون کے مذہبی جلوسون کے ساتھ بجا کرتا ہے۔ یہ باجے دہلی سے آئے اور جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ اور شاید اُن مین ترقی کی گنجایش بھی نہین ہے۔

بگل اور ڈنکا جو فی الحال لکھنؤ کے شادی کے جلوسون مین نظر آیا کرتا ہے وہ دراصل اگلے اور پچھلے باجون کا ایک مبتذل مجموعہ ہے۔ ڈنکے سے مراد وہ نقارہ ہے جو اگلے دنون فوجون اور زبردست فاتحون کے ساتھ گھوڑے پر رہا کرتا تھا اور اُسپر چوب پڑتے ہی لوگون پر ایسا رعب پڑتا کہ بڑے بڑون کے کلیجے دہل جایا کرتے تھے۔ بگل یا بیوگل انگریزی فوج کا وہ باجا ہے جس کے ذریعے سے فوج کو حسب ضرورت نقل وحرکت اور دوسرے کامون کا حکم دیا جاتا۔ لہذا اب ڈنکے کے ساتھ بگل کو شریک کرکے ایک نیا جوڑ بنا لیا گیا جو شادی کے جلوسون

کے ساتھ نظر آیا کرتا ہے۔ مگر چونکہ کرایہ کے اور بہت ہی بتذل حالت کے لوگ ہوتے ہین اس لیے اُن کا لباس۔ اُنکے گھوڑے اور خود اُنکی صورتین ایسی ذلیل و خوار ہوتی ہین کہ اُن سے بجاے رونق کے اور ابتذال اور ایک شرمناک منظر پیدا ہو جاتا ہے۔

اب سب کے آخر مین اور سب سے زیادہ ترقی پذیر باجا انگریزی باجا ہی خالص انگریزون کا لایا ہوا ہے جو اُن سے پیشتر مطلقاً نہ تھا۔ لکھنؤ مین خدا جانے کیون مگر اسکے بجانے والے صرف مہتر ہی ہین۔ جو پاخانے صاف کرنے کے علاوہ اس کام کو بھی کرتے ہین۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہو کہ ابتداءً ہندو مسلمان دونون گروہون کو عیسائیون سے ایسی سوشل نفرت تھی کہ اگر وہ کسی برتن کو ہاتھ لگا دیتے تو ہمیشہ کے لیے چھوت ہو جاتا۔ اور اس باجے کو انگریزون سے سیکھنا اور اُسے مُنہ لگانا پڑتا۔ اس لیے سوا مہترون کے اور کسی کو اُسکے اختیار کرنے کی جراُت نہ ہوئی۔ بہرحال اب قریب قریب یہ مہترون کا لازمی پیشہ ہو گیا ہے۔

چونکہ اس کام کو یہان ایک ایسے گروہ نے اختیار کیا جو سب سے زیادہ ذلیل و خوار ہے اور جسے موسیقی سے بالکل مس نہین۔ اس لیے امید نہ تھی کہ اس فن مین یہان ذرا بھی ترقی ہو سکے گی۔ مگر ایسا نہین ہوا۔ مہترون ہی مین ترقی کا شوق پیدا ہوا۔ اور چونکہ شہر کی سوسائٹیون مین ہندوستانی موسیقی کی دُھنین پھیلی اور مذاق مین سرایت کی ہوئی تھین اس لیے مہترون کو مجبور ہونا پڑا کہ اس مغربی ارغنون مین اپنی دُھنون کو ادا کرین۔ انگریزون یا انگریزی بجانے والے فوجی باجیون سے اُنھون نے صرف یہ حاصل کیا تھا کہ انگریزی باجون کا بجانا آ جائے یا دو چار مغربی موسیقی کی دُھنین سیکھ لی ہون گی۔ لیکن اب اُنھون نے ہندوستانی دُھنون مین مروجہ چیزون کو بجانا شروع کیا تو روز بروز اُس مین ترقی ہی کرتے گئے۔

انگریزی باجا مین نے ہر جگہ سُنا ہے۔ اور سب جگہ وہی انگریزی کی چیزین بجائی جاتی ہین۔ جن کو اُنھون نے اپنے انگریزی بینڈ ماسٹرون سے سیکھ لیا ہے

یہ کہین نہ نظر آیا کہ اس باجے کو بجانے والون نے ہندوستانی موسیقی کے سانچے مین ڈھال لیا ہو۔ یہ بات اگر غور سے دیکھیے تو لکھنؤ ہی مین نظر آئے گی کہ جن غزلون یا ٹھمریون کو روشن چوکی والے شہنائی سے ادا کر رہے ہین۔ اُنھین چیزون کو انگریزی باجے والے اپنے باجون سے ادا کر رہے ہین۔ اور ایسی خوبی سے کہ خواہ مخواہ سننے کو جی چاہتا ہے۔

انگریزی باجے کے بینڈ مہترون کی مستعدی سے لکھنؤ مین سیکڑون قائم ہو گئے ہین۔ جن مین سے بعض ایسے ہین کہ اُن مین پچیس پچیس تیس تیس بجانے والے ہوتے ہین اور بعض مین چھ سات یا چار ہی پانچ۔ اُنھون نے گورون کی وردیون مین ہندوستانی مذاق کے مطابق تصرف کر کے اپنے لیے رنگ رنگ کی وردیان بھی بنا لی ہین۔ اور اگر وہ وردیان صاف اور نئی ہون تو اُنکو پہن کے جب برات کے ساتھ ارگن باجا بجاتے ہوے چلتے ہین تو بہت اچھے اور بہت شاندار معلوم ہوتے ہین۔

وردی کی خصوصیت انھین لوگون مین ہے۔ اور قسم کے باجے والون کو کبھی اس کا خیال نہ آیا کہ اپنے لیے کوئی وردی ایجاد کرین۔ وہ نہایت ہی ذلیل اور کثیف کپڑے پہنے ہوا کرتے ہین۔ مگر انگریزی بینڈ والے مہترون نے اپنے لیے طرح طرح کی وردیان ایجاد کر کے اپنی شان بڑھالی ہے۔ اور ہندوستانی موسیقی کو انگریزی ارغنون مین شامل کر کے لوگون مین اپنی قدر بھی زیادہ کر لی ہے۔

(۲۸)

انسانی معاشرت مین سب سے زیادہ ضروری اور سب سے اہم کھانا پینا ہے۔ اور کسی گروہ اور قوم کے ترقی کرتے وقت سب سے پہلے شوق اپنی خوش مذاقی اور جدتون کا اظہار دسترخوان پر کرتا ہے۔ اسی لیے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہین کہ باورچیخانے اور دسترخوان کے متعلق لکھنؤ کے مشرقی دربار نے کیا رنگ دکھایا۔ اور کیا کیا جدت طرازیان کین۔ اور اس فن مین یہان کے لوگون نے کس درجے تک ترقی کی۔

اودھ کے تمدن کی تاریخ شجاع الدولہ سے اور اُنکے بھی آخر عہد سے شروع

ہوتی ہے۔ یعنی اُسوقت سے جبکہ وہ بکسر کی لڑائی مین شکست کھاکے اور انگریزون سے نیا معاہدہ کرکے خاموش بیٹھے اور فوجی سرگرمیون کی طرف سے بے توجہی ہوئی اُس زمانے مین اُن کے مہتمم باورچی خانہ حسن رضا خان عرف مرزا حسنو تھے جو ایک دہلی سے آئے ہوئے معزز و شریف گھرانے سے تھے۔ صفی پور ضلع اُناؤ کے ایک شیخ زادے مولوی فضل عظیم جو لکھنؤ مین طالبعلمی کو آئے تھے خوش قسمتی سے مرزا حسنو کے گھر مین اُنکی رسائی ہوگئی۔ اور اُن کے ساتھ ہی ل کے اور کھیل کود کے بڑے ہوئے تھے۔ اُن کو اُنھون نے اپنی طرف سے نائب مہتمم باورچی خانہ مقرر کرادیا تھا۔ اور اُن کا معمول تھا کہ خاصے کے خوانون کو درست کرکے اور اُن مین اپنی مُہر لگا کے نوابی ڈیوڑھی مین لیجاتے۔ اور بہو بیگم صاحبہ کی ڈیوڑھی کی مخصوص مہریون دھنیا پنیا۔ اور منیا کے حوالے کردیتے۔ محض اس غرض کے لیے کہ یہ مہریان اُنکے خلاف کوئی کارروائی نہ ہونے دین مولانا نے اُن مہریون سے بھائی چارہ کرلیا تھا۔ چنانچہ یہ مہریان بہت ہی نازک موقعون پر اُن کے کام آئین۔

نواب شجاع الدولہ کا معمول تھا کہ محل کے اندر اپنی بی بی بہو بیگم صاحبہ کے ساتھ کھانا کھاتے۔ مہریان خوانون کو بیگم صاحب کے سامنے لیجاکے کھولتین۔ اور دسترخوان پر کھانا چُنا جاتا۔

نواب اور بیگم کے لیے ہر روز چھ باورچی خانون سے کھانا آیا کرتا۔ (اول) مذکورۂ بالا اصلی نوابی باورچی خانے سے جس کے مہتمم مرزا حسنو تھے۔ اور مولوی فضل عظیم خاصے کے خوان خود لے کے ڈیوڑھی مین حاضر ہوتے۔ اس باورچی خانے مین دو ہزار روپیہ روز کی پخت ہوتی۔ جسکے یہ معنی ہوے کہ باورچیون اور دیگر ملازمون کی تنخواہون کے علاوہ ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار یا سات لاکھ بیس ہزار روپیہ سالانہ کی رقم فقط الوان نعمت اور غذاؤن کی قیمت مین صرف ہوتی تھی۔ (دوسرے) سرکاری چھوٹے باورچی خانے سے جس کے مہتمم پہلے تو مرزا حسن علی مہتمم توشہ خانہ تھے۔ لیکن بعد ازان وہ عنبر علیخان خواجہ سرا کے سپرد ہوگیا تھا۔ اس مین تین سو روپیہ روز یعنی ایک لاکھ آٹھ ہزار روپیہ ہر سال کھانون کی تیاری مین صرف ہوتے۔ (تیسرے) خود بہو بیگم صاحبہ کے محل کے اندر کا باورچی خانہ جس کا مہتمم بہار علی خان خواجہ سرا تھا جو تھے

باورچی نے کہا "کوئی ہو۔ مین تو اور کسی کے لیے نہین پکا سکتا"۔ جب سالار جنگ نے زیادہ اصرار کیا تو اُس نے کہا "بہتر۔ مگر شرط یہ ہے کہ حضور خود لے جا کے اپنے ساتھ کھلائین۔ اور چند لقمون سے زیادہ نہ کھانے دین۔ اور احتیاطاً آبدار ساتھ لے جانے کا انتظام بھی کر کے اپنے ساتھ لیجائین"۔ سالار جنگ نے یہ شرطین قبول کین۔ آخر باورچی نے پلاؤ تیار کیا اور سالار جنگ خود لے کے پہونچے اور دسترخوان پر پیش کیا۔ شجاع الدولہ نے کھاتے ہی بہت تعریف کی۔ اور رغبت کے ساتھ کھانے لگے۔ مگر دو ہی چار لقمے کھائے تھے کہ سالار جنگ نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا "بس۔ اس سے زیادہ نہ کھائیے"۔ شجاع الدولہ نے حیرت سے اُن کی صورت دیکھی اور کہا "اِن چار لقمون مین کیا ہوتا ہے؟" اور یہ کہہ کے زبردستی دو ایک لقمے اور کھا ہی لیے۔ اب پیاس کی شدت ہوئی۔ سالار جنگ نے اپنے آبدارخانے سے جو ساتھ گیا تھا پانی منگوا کے پلانا شروع کیا۔ بڑی دیر کے بعد خدا خدا کر کے تشنگی موقوف ہوئی۔ اور سالار جنگ اپنے گھر آئے۔

آج کل کے مذاق مین یہ غذا کی کوئی خوبی نہین سمجھی جا سکتی۔ مگر اُس زمانے مین اور پُرانے مذاق کے کھانے والون کے نزدیک اب بھی غذا کی خوبی کا اصلی معیار یہی ہے کہ غذائین بہ ظاہر نفیس و لطیف ہون مگر اصل مین اس قدر قوی اور معدے پر گران ہون کہ ہر معدہ برداشت نہ کر سکے۔

دوسرا کمال یہ تھا کہ کسی ایک چیز کو مختلف صورتون مین دکھا کے ایسا بنا دیا جائے کہ دسترخوان پر ظاہر مین تو یہ نظر آئے کہ بیسیون قسم کے الوان نعمت موجود ہین۔ مگر چکھیے اور غور کیجیے تو وہ سب ایک ہی چیز ہین۔ مثلاً معتبر ذرایع سے سُنا جاتا ہے کہ دہلی کے شاہزادون مین سے مرزا آسمان قدر فرزند مرزا خرم بخت لکھنؤ مین آ کے شیعہ ہوے اور چند روز یہان ٹھہرنے کے بعد بنارس مین جا کے اقامت پذیر ہو گئے۔ قیام لکھنؤ کے زمانے مین واجد علی شاہ نے اُنکی دعوت کی تو دسترخوان پر ایک مربہ لا کے رکھا گیا جو صورت مین نہایت ہی نفیس و لطیف اور مرغوب معلوم ہوتا تھا۔ مرزا آسمان قدر نے اُسکا لقمہ کھایا تو چکرائے۔ اسلیے

اُس پر ترجیح دی - عوام کی نظر میں دونوں قریب قریب بلکہ ایک ہی ہیں - مگر بریانی میں مسالے کی زیادتی سے سالن سلے ہوئے چاولوں کی شان پیدا ہو جاتی ہے - اور پلاؤ میں اتنی لطافت - نفاست - اور صفائی ضروری سمجھی جاتی ہے کہ بریانی اُسکے سامنے ملغوبہ سی معلوم ہوتی ہے - اس میں شک نہیں کہ معمولی قسم کے پلاؤ سے بریانی اچھی معلوم ہوتی ہے - وہ پلاؤ خشکہ معلوم ہوتا ہے جو عیب بریانی میں نہیں ہوتا - مگر اعلیٰ درجے کے پلاؤ کے مقابل بریانی نفاست پسند لوگوں کی نظر میں بہت ہی لدھڑ اور بدنما غذا ہے - بس یہی فرق تھا جس نے لکھنؤ میں پلاؤ کو زیادہ مروج بنا دیا -

پلاؤ یہاں کہنے کو تو سات طرح کے مشہور ہیں - اُن میں سے بھی صرف گلزار پلاؤ - نور پلاؤ - کوکو پلاؤ - موتی پلاؤ - اور چنبیلی پلاؤ کے نام ہمیں اس وقت یاد ہیں - مگر واقعہ یہ ہے کہ یہاں کے اعلیٰ درجے کے دسترخوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوا کرتے تھے - محمد علی شاہ کے بیٹے مرزا عظیم الشان نے ایک شادی کے موقع پر سمدھی ملاپ کی دعوت کی تھی جس میں خود فرمان روائے وقت واجد علی شاہ بھی شریک تھے - اُس دعوت میں دسترخوان پر نمکین اور میٹھے کُل ستر قسم کے چاول تھے -

غازی الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں نواب سالار جنگ کے خاندان سے ایک رئیس تھے - نواب حسین علی خان - اُنھیں کھانے کا بڑا شوق تھا - خصوصاً پلاؤ کا - اُن کے دسترخوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوا کرتے - اور وہ ایسی نفاست اور لطف کے ساتھ تیار کیے جاتے کہ شہر بھر میں اُن کی شہرت ہو گئی - یہاں تک کہ رؤسا و عمائد میں سے کوئی اُن کے مقابلے کی جرأت نہ کر سکتا - خود بادشاہ کو اُن پر رشک تھا - اور کھانے کے شوقینوں میں وہ "چاول والے" مشہور ہو گئے تھے -

نصیر الدین حیدر کے عہد میں باہر کا ایک باورچی آیا جو پستے اور بادام کی کھچڑی پکاتا - بادام کے سڈول اور صاف ستھرے چاول بناتا - پستے کی دال تیار کرتا - اور اس نفاست سے پکاتا کہ معلوم ہوتا نہایت عمدہ نفیس اور کھری

کہ وہ مربّہ نہ تھا بلکہ گوشت کا نمکین قورمہ تھا۔ جس کی صورت رکابدار نے بعینہٖ مربّے کی سی بنا دی تھی۔ یوں دھوکا کھا جانے پر اُنھیں ندامت ہوئی۔ اور واجد علی شاہ خوش ہوے کہ دہلی کے ایک معزز شاہزادے کو دھوکا دیدیا۔

دو چار روز بعد مرزا آسمان قدر نے واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ اور واجد علی شاہ یہ خیال کرکے آئے تھے کہ مجھے ضرور دھوکا دیا جائے گا۔ مگر اس ہوشیاری پر بھی دھوکا کھا گئے۔ اس لیے کہ آسمان قدر کے باورچی شیخ حسین علی نے یہ کمال کیا تھا کہ گو دسترخوان پر صدہا الوان نعمت اور قسم قسم کے کھانے چنے ہوے تھے۔ پلاؤ تھا۔ زردہ تھا۔ بریانی تھی۔ قورمہ تھا۔ کباب تھے۔ ترکاریاں تھیں۔ چٹنیاں تھیں۔ اچار تھے۔ روٹیاں تھیں۔ پراٹھے تھے شیرمالیں تھیں۔ غرضکہ ہمہ نعمت موجود تھی۔ مگر جس چیز کو چکھا شکر کی بنی ہوئی تھی۔ سالن تھا تو شکر کا۔ چاول تھے تو شکر کے۔ اچار تھا تو شکر کا۔ اور روٹیاں تھیں تو شکر کی۔ یہان تک کہ کہتے ہین تمام برتن۔ دسترخوان۔ اور سلفچی آفتابہ تک شکر کے تھے۔ واجد علی شاہ گھبرا گھبرا کے ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے تھے اور دھوکے پر دھوکا کھاتے تھے۔

ہم بیان کر آئے ہین کہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے خاصے پر چند مقاموں سے کھانے کے خوان آیا کرتے تھے۔ مگر یہ اُنھیں تک منحصر نہ تھا۔ اُنکے بعد بھی یہ طریقہ جاری رہا کہ اکثر معزز امرا خصوصاً اعزاے شاہی کو یہ عزت دی جاتی کہ وہ خاصے کے لیے خاص خاص قسم کے کھانے بلا ناغہ بھیجا کرتے۔

چنانچہ ہمارے دوست نواب محمد شفیع خان صاحب بہادر نیشاپوری کا بیان ہے کہ اُنکے نانا نواب آغا علی حسن خان صاحب کے گھر سے جو نیشاپوریوں مین سب سے زیادہ نامور اور ممتاز تھے بادشاہ کے لیے روغنی روٹی اور میٹھا گھی جایا کرتا۔ روغنی روٹیاں اس قدر باریک اور نفاست سے پکائی جاتین کہ موٹے کاغذ سے زیادہ کُندہ نہ ہوتین۔ اور پھر یہ ممکن نہ تھا کہ چتّیاں پڑین اور نہ یہ مجال تھی کہ کسی جگہ پر کچّی رہ جائین۔ میٹھا گھی بھی ایک خاص چیز تھا جو بڑے اہتمام سے تیار کرایا جاتا۔ دہلی مین بریانی کا زیادہ رواج ہے اور تھا۔ مگر لکھنؤ کی نفاست نے پلاؤ کو

ماش کی کھچڑی ہے۔ مگر کھائیے تو اور ہی لذت تھی۔ اور ایسا ذائقہ جس کا مزہ
زبان کو زندگی بھر نہ بھولتا۔

نواب سعادت علی خان کے زمانے مین ایک صاحب کمال باورچی صرف
چانولون کی گلتھی پکاتا۔ مگر ایسی گلتھی جو شاہی دسترخوان کی رونق۔ فرمانروائے
وقت کو نہایت ہی مرغوب تھی۔ اور شہر کے تمام رئیسون کو اُس کا ایک لقمہ ملجانے
کی تمنا تھی۔ مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ کے سامنے ایک نیا باورچی پیش ہوا
پوچھا گیا "کیا پکاتے ہو؟" کہا صرف ماش کی دال پکاتا ہون" پوچھا "تنخواہ
کیا لوگے؟" کہا "پانسو روپیہ" نواب نے نوکر رکھ لیا۔ مگر اُس نے کہا "مین
چند شرطون پر نوکری کرونگا" پوچھا "وہ شرطین کیا ہین؟" کہا "جب حضور کو
میرے ہاتھ کی دال کا شوق ہو ایک روز پہلے سے حکم ہو جائے۔ اور جب اطلاع
دون کہ تیار ہے تو حضور اُسی وقت تناول فرمالین" نواب نے یہ شرطین بھی منظور
کرلین۔ چند ماہ کے بعد اُسے دال پکانے کا حکم ہوا۔ اُس نے تیاری کی۔ اور نواب
کو خبر کی۔ اُنھون نے کہا "اچھا دسترخوان بچھاؤ مین آتا ہون" دسترخوان بچھا۔ مگر
نواب باتون مین لگے رہے۔ اُس نے جاکے پھر اطلاع دی کہ "خاصہ تیار ہے" نواب
کو پھر آنے مین دیر ہوئی۔ اُس نے سہ بارہ خبر کی۔ اور اسپر بھی نواب صاحب نہ
آئے تو اُس نے دال کی ہانڈی اُٹھا کے ایک سوکھے پیڑ کی جڑ مین انڈیل دی۔ اور
استعفا دے کے چلا گیا۔ نواب کو افسوس ہوا۔ ڈھونڈھوایا مگر اُس کا پتہ نہ لگا۔
مگر چند روز بعد دیکھا تو جس درخت کے نیچے دال پھینکی گئی تھی وہ سرسبز ہو گیا تھا۔
اس مین شک نہین کہ اس واقعے مین مبالغہ ہے۔ جس نے اسے خلاف قیاس
ہونے کے درجے تک پہونچا دیا ہے۔ مگر اس سے اتنا اندازہ البتہ ہو جاتا ہے
کہ دربار مین باورچیون کی کس درجہ قدر ہوتی تھی۔ اور کوئی صاحب کمال باورچی
آجاتا تو کس فیاضی سے رکھ لیا جاتا۔

امیرون کا یہ ذوق وشوق دیکھ کے باورچیون نے بھی طرح طرح کی جدت
طرازیان شروع کردین۔ کسی نے پلاؤ انار دانہ ایجاد کیا۔ اُس مین ہر چانول
آدھا یاقوت کی طرح سرخ اور چلادار ہوتا اور آدھا سفید۔ مگر اُس مین بھی

کی سی چمک موجود ہوتی - جب دسترخوان پر لا کے لگایا جاتا تو معلوم ہوتا کہ پلیٹ
مین ابلق رنگ کے جواہرات رکھے ہوے ہین - ایک اور باورچی نے نورتن
پلاؤ پکا کے پیش کیا جس مین نورتن کے مشہور جواہرات کے مثل نو رنگ کے چاول
ملا دیے - اور پھر رنگون کی صفائی اور آب و تاب عجیب نفاست اور لطف
پیدا کر رہی تھی - اسی طرح کی خدا جانے کتنی ایجادین ہو گئین جو تمام گھرون
اور باورچی خانون مین پھیل گئین -

کھانے کے شوقین اگلے رئیسون مین سے ایک نواب مرزا خان نیشاپوری
تھے جو کہتے ہین کہ چودہ ہزار ماہوار کے وثیقہ یاب تھے - اچھا کھانے کے شوق
مین اُنھون نے وہ کمال دکھایا اور ایسے اچھے اچھے باورچی جمع کر لیے کہ
شہر مین اُن کے دسترخوان کی دھوم تھی - دوسرے مرزا حیدر تھے - یہ بھی
نیشاپوری اور ایسے محترم رئیس تھے کہ تمام نیشاپوری اُنکو اپنا سرتاج اور
بزرگ مانتے - اُن کی شان یہ تھی کہ جس کی دعوت مین جاتے اُن کا آبدارخانہ -
گلوریون کا سامان - اور سو ڈیڑھ سو حقے اُن کے ساتھ جاتے - اُن کی اس وضع
سے اکثر متوسط الحال لوگون کو بڑی مدد ملجاتی - کسی نہ کسی طرح خوشامد
در آمد کر کے اُن سے دعوت قبول کرا لیتے - اور اُن کے قبول کر لینے کے
یہ معنی تھے کہ محفل مین حقون - گلوریون - اور پانی کا انتظام اُنکے ذمے ہو گیا -
اور پھر کیسا انتظام جو کسی بڑے سے بڑے رئیس کے بھی امکان سے باہر تھا -

کھانا تیار کرنے والے تین گروہ ہین - پہلے دیگ شو - جن کا کام دیگون کا
دھونا اور باورچیون کی ماتحتی مین مزدوری کرنا ہے - دوسرے باورچی - یہ
لوگ کھانا پکاتے ہین اور اکثر بڑی بڑی دیگین تیار کر کے اُتارتے ہین - تیسرے
رکابدار - یہی لوگ اس فن کے اعلیٰ درجے کے ماہر اور صاحب کمال ہوتے ہین
یہ لوگ علی العموم چھوٹی ہانڈیان پکاتے ہین - اور بڑی دیگین اُتارنا اپنی شان
اور مرتبے سے ادنیٰ کام خیال کرتے ہین - اگرچہ اکثر باورچی بھی چھوٹی ہانڈیان
پکاتے ہین - مگر رکابدارون کا کام فقط چھوٹی ہانڈیون تک محدود تھا - یہ لوگ
میوہ جات کے پھول کترتے - کھانا نکالنے اور لگانے مین سلیقہ - نفاست - اور

تکلف ظاہر کرتے۔ جو بھون اور قابون مین جو پُلاؤ یا زردہ نکالا جاتا اُس پر میوہ جات اور دیگر طریقون سے گلکاریان کرتے اور نقش و نگار بناتے۔ نہایت نفیس اور لطیف مربّے اور اچار تیار کرتے اور کھانون مین اپنی طبیعت داری سے صدہا قسم کی صنعتین دکھاتے۔

غازی الدین حیدر پہلے شاہ اودھ کو پراٹھے پسند تھے۔ اُن کا رکابدار ہر روز چھ پراٹھے پکاتا۔ اور فی پراٹھا پانچ سیر کے حساب سے ۳۰ سیر گھی روز لیا کرتا۔ ایک دن وزیر سلطنت معتمد الدولہ آغا میر نے شاہی رکابدار کو بلا کے پوچھا "ارے بھئی یہ تیس سیر گھی کیا ہوتا ہے؟" کہا "حضور پراٹھے پکاتا ہون۔" کہا "بھلا میرے سامنے تو پکاؤ۔" اُس نے کہا "بہت خوب!" پراٹھے پکائے۔ جتنا گھی کھپا کھپایا۔ اور جو باقی بچا پھینک دیا۔ معتمد الدولہ آغا میر نے یہ دیکھ کے حیرت اور استعجاب سے کہا "پورا گھی تو خرچ نہین ہوا؟" اُس نے کہا "اب یہ گھی تو بالکل تیل ہو گیا۔ اس قابل تھوڑے ہی ہے کہ کسی اور کھانے مین لگایا جائے۔" وزیر سے جواب تو نہ بن پڑا مگر حکم دے دیا کہ "آیندہ سے صرف پانچ سیر گھی دیا جایا کرے۔ فی پراٹھا ایک سیر بہت ہے۔" رکابدار نے کہا "بہتر مین اتنے ہی گھی مین پکا دیا کرون گا۔" مگر وزیر کی روک ٹوک سے اِس قدر ناراض ہوا کہ معمولی قسم کے پراٹھے پکا کے بادشاہ کے خاصے پر بھیجنے لگا۔ جب کئی دن یہی حالت رہی تو بادشاہ نے شکایت کی کہ "یہ پراٹھے اب کیسے آتے ہین؟" رکابدار نے عرض کیا "حضور جیسے پراٹھے نواب معتمد الدولہ بہادر کا حکم ہے پکاتا ہون۔" بادشاہ نے اس کی حقیقت پوچھی تو اُس نے سارا حال بیان کر دیا۔ فوراً معتمد الدولہ کی یاد ہوئی۔ اُنھون نے عرض کیا "جہان پناہ۔ یہ لوگ خواہ مخواہ کو لوٹتے ہین۔" بادشاہ نے اس کے جواب مین دس پانچ تھپڑ اور گھونسے رسید کیے۔ خوب ٹھونکا۔ اور کہا "تم نہین لوٹتے ہو؟ تم جو ساری سلطنت اور سارے ملک کو لوٹے لیتے ہو اس کا خیال نہین۔ یہ جو تھوڑا سا گھی زیادہ لے لیتا ہے اور وہ بھی میرے خاصے کے لیے۔ یہ تمھین نہین گوارا ہے؟" بہر حال معتمد نے توبہ کی۔ کان اُمیٹھے۔ تو خلعت ہوا۔ جو اس بات کی نشانی تصور کی جاتی کہ

جہان پناہ نے دست شفقت پھیرا ہے۔ اور اپنے گھر آئے۔ پھر اُنھون نے کبھی اُس رکابدار سے تعرض نہ کیا۔ اور وہ اُسی طرح ۳۰ سیر گھی روز لیتا رہا۔

(۲۹)

نواب ابوالقاسم خان ایک شوقین رئیس تھے۔ اُنکے وہان بہت بھاری پلاؤ پکتا۔ ۴۲ سیر گوشت کی یخنی تیار کرکے مقطر کرلی جاتی اور اُس مین چانول دم کیے جاتے۔ اور پھر اس لطف کے ساتھ کہ لقمہ مُنہ مین رکھتے ہی معلوم ہوتا کہ سب چانول خود ہی گھُل کے حلق سے اُتر گئے۔ پھر اُسکے ساتھ اس درجہ لطافت کہ مجال کیا جو ذرا بھی محسوس ہو سکے کہ اُس مین کسی قسم کی گرانی ہے۔ اتنی ہی یا اس سے زیادہ قوت کا پُلاؤ واجد علی شاہ کی خاص محل صاحبہ کے لیے روز تیار ہوا کرتا تھا۔

ممدوح بالا معزول شاہ اودھ کے ہمراہ مٹیا بُرج مین ایک رئیس تھے جن کا منشی السلطان بہادر خطاب تھا۔ بڑے وضعدار اور نفیس مزاج شوقینون مین تھے کھانے کا بیحد شوق تھا۔ اور اگرچہ کئی صاحب کمال باورچی موجود تھے مگر انھین جب تک دو ایک چیزین خود اپنے ہاتھ سے نہ پکا لیتے کھانے مین مزہ نہ آتا۔ آخر اُنکے اچھے کھانے کی یہان تک شہرت ہوئی کہ واجد علی شاہ کہا کرتے "اچھا تو منشی السلطان کھاتے ہین۔ مین کیا اچھا کھاؤن گا"۔ بچپن مین چھ سات برس تک مٹیا برج مین مین اُنھین کے ساتھ رہا۔ اور اُنھین کے ساتھ دسترخوان پر شریک ہوتا رہا۔ مین نے اُن کے دسترخوان پر تیس چالیس قسم کے پلاؤ اور بیسیون قسم کے سالن کھائے۔ جن مین سے بعض ایسے تھے کہ پھر کبھی کھانا نصیب ہوئے۔ اُنھین حلوا سوہن کا بھی بڑا شوق تھا۔ جس کا ذکر اپنے محل پہ آئے گا۔

آخر زمانے مین اور غدر کے بعد لکھنؤ مین حکیم بندہ مہدی مرحوم کو کھانے اور پہننے کا بیحد شوق تھا۔ اور بڑے بڑے دولتمند اور شوقین لوگون کو یقین ہے کہ جیسا کھانا اُنھون نے کھایا اور جیسا کپڑا اُنھون نے پہنا اس زمانے مین بہت کم کسی کو نصیب ہو سکا۔ ہمارے ایک معمر و معزز دوست فرماتے ہین کہ ہمارے

خاندان سے حکیم صاحب موصوف سے بہت ربط وضبط تھا۔ ایک دن حکیم صاحب نے ہمارے والد اور چچا کو بلا بھیجا کہ ایک پہلوان کی دعوت ہے۔ آپ بھی آکے لطف دیکھیے۔ والد تشریف لے گئے اور میں بھی اُن کے ساتھ گیا۔ وہاں جاکے معلوم ہوا کہ وہ پہلوان روز صبح کو بیس سیر دودھ پیتا ہے۔ اُس پر ڈھائی تین سیر میوہ یعنی بادام اور پستے کھاتا ہے اور دوپہر اور شام کو ڈھائی سیر آٹے کی روٹیاں اور ایک متوسط درجے کا بکرا کھا جاتا ہے۔ اور اسی غذا کے مناسب اُس کا تن و توش بھی تھا۔ وہ ناشتے کے لیے بیتاب تھا۔ اور بار بار تقاضا کر رہا تھا کہ کھانا جلدی منگوائیے۔ مگر حکیم صاحب جان بوجھ کے ٹال رہے تھے۔ یہاں تک کہ بھوک کی شدت نے اُسے بیتاب کر دیا۔ اور اب وہ ناراض ہو کے اُٹھنے لگا۔ تب حکیم صاحب کھانا بھیجنے کا وعدہ کر کے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر اور ٹالا۔ اور جب دیکھا کہ اب وہ بھوک کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا تو مہری کے ہاتھ ایک خوان بھیجا۔ جس کی صورت دیکھتے ہی پہلوان صاحب کی جان میں جان آئی۔ مگر جب اُسے کھولا تو ایک چھوٹی طشتری میں تھوڑا سا پلاؤ تھا۔ جس کی مقدار چھٹانک بھر سے زیادہ نہ ہو گی۔ پرخور مہمان کو یہ چانول دیکھ کے بڑا طیش آیا جو اُس کے ایک لقمے کے لیے بھی کافی نہ تھے۔ قصد کیا کہ اُٹھ کے چلا جائے مگر لوگوں نے سمجھا بجھا کے روکا۔ اور اُس نے مجبوراً وہ طشتری اُٹھا کے مُنہ میں اُنڈیل لی۔ اور بغیر مُنہ چلائے نگل گیا۔ پانچ منٹ کے بعد اُس نے پانی مانگا۔ اور اُس کے پانچ منٹ بعد پھر پانی پیا اور ڈکار لی۔ اب اندر سے کھانے کے خوان آئے۔ دسترخوان بچھا۔ خود حکیم صاحب بھی آئے۔ کھانا چُنا گیا اور وہی پلاؤ جس میں سے ایک لقمہ پہلے بھیجا گیا تھا اُس کی پلیٹ جس میں کوئی ڈیڑھ پاؤ چانول ہونگے حکیم صاحب کے سامنے لگائی گئی۔ حکیم صاحب نے اُس پلیٹ کو اُس پہلوان کے سامنے پیش کیا اور کہا دیکھیے یہ وہی پلاؤ ہے یا کوئی اور؟ اُس نے قبول کیا کہ وہی ہے۔ حکیم صاحب نے کہا "تو اب کھائیے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کی تیاری میں دیر ہوئی۔ اور آپ کو تکلیف اُٹھانا پڑی"۔ پہلوان نے کہا "مگر اب مجھے معاف فرمائیے۔ میں اُسی پہلے لقمے سے سیر ہو گیا۔ اور اب

ایک چاول بھی نہین کھا سکتا۔" ہزار اصرار کیا گیا مگر اُس نے قطعاً ہاتھ روک لیا اور کہا "کھاؤن کیونکر؟ جب پیٹ مین جگہ بھی ہو۔" حکیم صاحب نے وہ چاول لے کے سب کھا لیے۔ اور اُس سے کہا "بیس بیس سیر اور تیس تیس سیر کھا جانا انسان کی غذا نہین۔ یہ تو گائے بھینس کی غذا ہوئی۔ انسان کی غذا یہ ہے کہ چند لقمے کھائے۔ مگر اُن سے قوت و توانائی وہ آئے جو بیس تیس سیر غلہ کھانے مین بھی نہ آسکے۔ آپ اس ایک لقمے مین سیر ہو گئے ہین۔ کل پھر آپ کی دعوت ہے۔ کل آکے بتائیے گا کہ اس ایک لقمے سے آپ کو ویسی ہی قوت و توانائی محسوس ہوئی جیسی کہ ۲۰ سیر دودھ اور سیرون میوے اور گوشت اور غلے سے حاصل ہوتی تھی یا اُس سے کم؟" اور ہم سب کو بھی حکیم صاحب نے دوسرے دن مدعو کر دیا۔ دوسرے دن اُس پہلوان نے آکے بیان کیا کہ "مجھے زندگی بھر ایسی توانائی اور چوچالی نہین نصیب ہوئی تھی جیسی کہ کل سے آج تک رہی۔"

شاہی خاندان کے لوگون مین سے آخر عہد مین نواب محسن الدولہ اور نواب ممتاز الدولہ دسترخوان اور باورچی خانے کے شوق اور کمال مین بے نظیر سمجھے جاتے۔ اور اُنھین کا باورچی تھا جو حکیم بندہ مہدی صاحب کے لیے یہ پلاؤ تیار کیا کرتا تھا۔ اُنھین دنون ملکۂ زمانیہ کی ایک بڑی سرکار قائم تھی اور اُن کا باورچی خانہ مشہور تھا۔ جس مین روزانہ تین سو روپے کی پخت ہوتی۔ اسی عہد مین شاہزادہ یحییٰ علی خان کی سرکار مین قائم علی نام ایک باورچی نوکر تھا وہ مسلّم مچھلی ایسی بے مثل پکاتا تھا کہ تمام رئیسون مین مشہور تھی۔ اور دوسری سرکارون کے باورچیون نے ہزار کوشش کی مگر وہ بات نہ پیدا کر سکے۔

نصیر الدین حیدر کے زمانے مین محمّو نام ایک ولایتی شخص نے آکے فرنگی محل مین باورچی کی دوکان کھولی۔ اور اُس کی نہاری کی ایسی شہرت ہوئی کہ بڑے بڑے رئیس اور شاہزادے تک اُس کی نہاری کی قدر کرتے۔ قدردانی نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ اور اُس نے شیرمال ایجاد کی جو آج تک لکھنؤ کا سرمایۂ ناز ہے۔ روٹیون کی بہت سی قسمین مشہور اور مختلف شہرون مین مروج

ہین۔ ایران سے مسلمان خمیری روٹیان کھاتے اور ہندوستان کی سرزمین مین تنور لگاتے ہوے آئے تھے۔ مگر اُسوقت تک سادی روٹیان تھین۔ جن مین گھی کا لگاؤ نہ ہوتا۔ ہندوؤن کو پوریان تلتے دیکھکے مسلمانون نے توے کی روٹیون مین گھی کا جزو دے کے پَراٹھے ایجاد کیے۔ اور پھر اُن مین متعدد پرتین اور تہین دینا شروع کین۔ پھر اُسی پراٹھے مین پہلی ترقی یہ ہوئی کہ باقرخانی کا رواج ہوا جو ابتداءً امرا کے دسترخوان کی بہت تکلفی روٹی تھی۔ لکھنؤ مین محمدو نے باقرخانی پر بہت ترقی دے کے شیرمال پکائی جو مزے۔ بوباس۔ نفاست اور لطافت مین باقرخانی اور تکلفی روٹیون کے تمام اصناف سے بڑھ گئی۔ شیرمال آج تک سوا لکھنؤ کے اور کہین نہین پکتی۔ اور پکتی بھی ہے تو ایسی نہین پک سکتی۔ چند ہی روز مین شیرمال کو ایسی عام مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ لکھنؤ کی نفیس روٹی قرار پا گئی۔ یہان تک کہ جس دعوت مین شیرمال نہ ہو وہ مکمل نہین سمجھی جاتی۔

شیرمال کی ایجاد نے محمدو کی اس قدر قدر بڑھائی کہ شاہی مجالس اور تقریبون کے لیے اُسے بعض اوقات ایک ایک لاکھ شیرمالون کا آرڈر ایک دن مین ملا۔ اور اُس نے بھی ایسا کافی انتظام کر رکھا تھا کہ جتنی شیرمالین مانگی جاتین مہیا کر دیتا۔ محمدو کا جانشین ان دنون علی حسین تھا جو کئی مہینے ہوے مرگیا۔ مگر اُسکی دُکان سے آج بھی جیسی اعلیٰ درجے کی شیرمالین مل سکتی ہین اور کہین نہین مل سکتین۔

شیرمال سے بھی زیادہ مزہ دار نان جلیبی ہوتی ہے جو خاص اہتمام سے پکوائی جاتی ہے۔ اور وہی رکابدار اُسے طیار کر سکتے ہین جو واقف ہین۔ اور باورچیون کو دعوےٰ ہے کہ لکھنؤ کے باورچیون سے اچھی نان جلیبی کوئی نہین پکا سکتا۔ پراٹھون مین لکھنؤ اُسی درجے پر ہے جو دوسرے شہرون کو حاصل ہے۔ اس مین بظاہر کوئی خاص ترقی نہین ہوئی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے اچھے نان بائی بہت اعلیٰ درجے کے پراٹھے پکاتے ہین۔ اور سیر بھر آٹے مین پورا سیر بھر گھی کھپا دیتے ہین۔ مگر مین نے اپنے زمانۂ قیام دہلی مین کئی بار مشہور

نان بائیون سے پراٹھے پکوائے - بیشک اُنھون نے گھی بہت خرچ کر دیا - مگر چونکہ آٹے کے اندر گھی نہین دیا تھا اس لیے وہ اُسی وقت تک کھانے کے قابل تھے جب تک کہ تازے کھا لیے جائین - ٹھنڈے ہوتے ہی چمڑے ہو گئے

روٹی کو توڑ کے اور اُس مین گھی شکر ملا کے مَل دینا ایک عام اور معمولی غذا ہے جس کا اکثر فاتحون اور نیازون مین زیادہ رواج ہے - مگر شاہی باورچی خانے کے یہان کے باورچی ایسا لطیف ملیدہ تیار کرتے جو بعض فرمان رواؤن کو نہایت ہی مرغوب تھا - اور تعریف یہ تھی کہ منہ مین لقمہ لیتے ہی شربت بن جائے اور معلوم ہو کہ چبانے یا منہ چلانے کی مطلق ضرورت نہین -

اسی روٹی کے سلسلے مین یہان تک ترقی ہوئی کہ صرف دودھ کی پوریان پکائی جانے لگین جن مین آٹے کا بالکل جُز نہ ہوتا - صرف دودھ کے پھٹن مین گندھے ہوے میدے کی شان پیدا کر لی - اور آخر مین یہان تک ترقی ہوئی کہ دودھ کی گلوریان اور دیگر اقسام کی چیزین تیار ہونے لگین - اسی طرح خالص دودھ کی پنیری دسترخوانون پر آتی جو بہت ہی نفیس و لطیف غذا اور امرا کو بہت پسند تھی -

لیکن مسلمانون کی مخصوص ڈش یعنی قومی غذا پُلاؤ اور قورمہ ہے - لہذا سب سے زیادہ نزاکت و لطافت اُنھین چیزون مین دکھائی گئی - پُلاؤ کے متعلق ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہین - پھر بھی بعض باتین باقی رہ گئین - دولتمند اور شوقین امیرون کے لیے مُرغ مشک و زعفران کی گولیان کھلا کھلا کے تیار کیے جاتے - یہان تک کہ اُن کے گوشت مین ان دونون چیزون کی خوشبو سرایت کر جاتی - اور ہر رگ و ریشہ معطر ہو جاتا - پھر اُن کی یخنی نکالی جاتی - اور اُس یخنی مین چاول دم دے دیے جاتے -

موتی پُلاؤ کی یہ شان تھی کہ معلوم ہوتا چاولون مین آبدار موتی ملے ہوے ہین - اُس کے لیے موتیون کے تیار کرنے کی یہ ترکیب تھی کہ تولہ بھر چاندی کے ورق اور ماشہ بھر سونے کے ورق انڈے کی زردی مین خوب حل کیے جاتے -

پھر اس حل شدہ مرکب کو مرغ کے نرخرے مین بھر کے نرخرے کے ہر ہر جوڑ پر باریک دھاگا کس کے باندھ دیا جاتا - اور اُسے خفیف سا جوش دے کے چاقو سے نرخرے کی کھال چاک کر دی جاتی اور سوڈول آبدار موتی نکل آتے جو پلاؤ مین گوشت کے ساتھ دم کر دیے جاتے - بعض رکابدار پنیر کے موتی بناتے اور اُس پر چاندی کا ورق چڑھا دیتے - بہرحال ایسی ایسی جدتین عمل مین آتین کہ اور کہین لوگون کے خیال مین بھی نہ آئی ہوتین بعض رکابدارون نے پلاؤ کی تیاری مین یہ صنعت دکھائی کہ گوشت کی چھوٹی چھوٹی چڑیان بنا کے اور خوب احتیاط سے اس طرح پکا کے کہ صورت نہ بگڑنے پائے پلیٹ مین بٹھا دین - چاولون کی صورت دانے کی کر دی - اور معلوم ہوتا کہ ہر مہمان کے سامنے پلیٹ مین چڑیان بیٹھی دانہ چگ رہی ہین - پھولے ہوے سموسے جن مین سے توڑتے ہی لال نکل کے اُڑ جاتے - حیدرآباد دکن مین غالباً لکھنؤ کے رکابدار پیر علی نے آکر تیار کیے جو سرکاری ڈنرون مین میز پر آئے اور معزز انگریزون اور کیڈیون کو بہت محظوظ کیا - اس کی ایجاد سب سے پہلے نصیرالدین حیدر کے دسترخوان پر ہوئی تھی - مگر چڑیون والا مذکورۂ بالا پلاؤ اس سے بدرجہا زیادہ دلچسپ صنعت تھا -

ایک رکابدار نے یہ صنعت دکھائی کہ دسترخوان پر بڑے بڑے سیر سیر بھر کے انڈے اُبلے اور تلے ہوے پیش کیے - جن مین سفیدی اور زردی اُسی نسبت اور وضع سے قائم تھی جو معمولی انڈون مین ہوا کرتی ہے - بعض رکابدارون نے بادام کا سالن پکایا جو بعینہٖ سیم کے بیجون کے مثل اور مزے اور لطافت مین اُس سے بڑھا ہوا تھا - وزیر سلطنت روشن الدولہ کے باورچی نے کچے بھٹون کے بھٹے اس نفاست سے کاٹے کہ کہین ٹوٹنے نہ پائے" - اور اُن کا دا نتا ایسا اعلیٰ درجے کا بنایا کہ جس نے چکھا عش عش کر گیا -

ہمارے معزز رقم خوشنویس منشی شاکر علی صاحب نے چاول پر قل ہو اللہ لکھ کے بے مثل کمال دکھایا ہے مگر یہان کے ایک باورچی نے شاہی مین خشخاش کے دانون مین چارون طرف کھٹل کے سے خار پیدا کیے - اور اُسے خاص

ترکیب سے پکا کے دسترخوان پر پیش کیا تھا۔

پیر علی لکھنو کا مشہور رکابدار جو حضور نظام کے باورچی خانے مین ملازم تھا ایک نہایت قیمتی اور لذیذ ارہر کی دال پکایا کرتا جو اگلے فرمانروایان لکھنؤ کے باورچی خانون مین پکا کرتی تھی۔ اور سلطانی دال کے نام سے مشہور تھی۔

بعض رکابدار مسلّم کریلے ایسی نفاست اور صفائی سے پکاتے کہ دیکھیے تو معلوم ہوتا کہ اُنھین بھاپ بھی نہین لگی ہے۔ ویسے ہی ہرے اور کچے رکھے ہین۔ مگر کاٹ کے کھائیے تو نہایت ہی پُر لطف اور لذیذ ہوتے ہین۔ اسی قسم کا ایک واقعہ آج ہی کل کے زمانے مین ہمارے مکرم دوست سید علی اوسط صاحب کو پیش آیا۔ اُن کا بیان ہے کہ موجودہ خاندانی روساے لکھنؤ مین سے نواب علی نقی خان نے ایک دن مجھ سے کہا کہ رات کا کھانا ذرا انتظار کر کے کھائیے گا مین کچھ بھیجون گا۔ رات کو حسب وعدہ کھانے کے وقت اُن کا آدمی ایک خوان لے کے آیا۔ مین نے دو فرط شوق سے خوان اپنے سامنے منگوا کے کھلوایا تو اُس مین صرف ایک پلیٹ تھی اور اُسپر ایک کچا کدو رکھا ہوا تھا دیکھ کے طبیعت نہایت منغص ہوئی۔ انتہاے یاس سے مین نے ماما سے کہا اسے لیجا کے رکھو۔ کل پکا لینا۔ مگر شاہزادے صاحب کے آدمی نے ہنس کے کہا ”اسے کاٹ کے یون ہی کھائیے۔ پکانے کی ضرورت نہین ہے“۔ اب مین نے جو اُسے کاٹا تو عجیب لذیذ اور مزے کی چیز نظر آئی۔ اور ایسا کبھی نہین کھایا تھا۔

رکابدارون نے سچ یہ ہے کہ اِس قسم کی صنعتون مین یہان عجیب عجیب کمال دکھائے تھے۔ پیر علی رکابدار مٹھائی کا انار بناتا تھا۔ جس مین اوپر کا چھلکا۔ اندر کے دانے۔ اُن کی ترتیب۔ اور اُنکے بیچ کے پردے سب اصلی معلوم ہوتے۔ دانون کی گٹھلیان بادام کی ہوتین۔ ناشپاتی کے عرق کے دانے ہوتے۔ دانون کے بیچ کے پردے اور اوپر کا چھلکا دونون شکر کے ہوتے۔

علی العموم رکابدار مربے اور اچار وغیرہ اور طرح طرح کی مٹھائیان تیار کرتے۔ جن مین صدہا قسم کی ترکیبین اور عجیب عجیب صنعتین اور نفاستین دکھاتی

جاتین - آم کا مربّہ سب نے کھایا ہے مگر یہان رکابدار سلم ہری کیریون کا مربّہ تیار کرتے - اور اُن مین ویسے ہی سبز چھلکے اپنی اصلیت پر قائم رہتے ہین یہ معلوم ہوتا کہ تازی کیریان ابھی توڑکے لائی اور شیرے مین ڈال دی گئی ہین -

(۳۰)

مذکورہ تمام تکلفات سے دعوتون اور حصون کے لیے جو کھانے علی العموم منتخب کر دیے تھے اُنکے مجموعے کا نام تورا تھا - جس مین لازمی طور پر حسب ذیل غذائین ہوتین (۱) پلاؤ - (۲) مزعفر (۳) متنجن (۴) شیرمال (۵) سفیدہ (میٹھے چاول جن مین زعفران کا رنگ نہ دیا گیا ہو) (۶) بورانی کے پیالے (۷) شیربرنج کے خوانچے (۸) قورمہ (۹) تلی ہوئی اروِیان گوشت مین (۱۰) شامی کباب (۱۱) مربہ (۱۲) اچار یا چٹنی - اکثر جگہ توڑے مین اِن مین سے بعض چیزین کم و بیش بھی کر دی جاتین - مگر لکھنؤ مین علی العموم یہی کھانے مقبول تھے اور دعوتون اور حصون مین ان کے سوا اور کوئی چیز کم ہوتی تھی - دعوتون مین یہ چیزین دسترخوان پر ہر شخص کے سامنے جدا جدا پلیٹون مین چنی جاتین اور کہین بھیجنا ہوتا تو یہی تورہ لکڑی کے خوانون مین رکھ کے اہتمام سے بھیجا جاتا -

انگریزون مین رواج ہے کہ میز پھولون گلدستون اور طرح طرح کی زینتون سے آراستہ کی جاتی ہے - اس کا اس قدر نمونہ یہان بھی تھا کہ امیرون نوابون اور شاہزادون مین جو تورے تقسیم ہوتے اُن مین کھانون کے درمیان مین کاغذ کے پھولون کا ایک گلدستہ بھی رکھ دیا جاتا - جس کو عوام اور اوسط درجے کے لوگون نے فضول سمجھ کے ترک کر دیا -

جن معزز سرکارون اور اعلیٰ درجے کی ڈیوڑھیون مین کھانا جاتا اُنکے رتبے اور درجے کے مطابق تورے مین الوان نعمت کا شمار بھی بڑھ جاتا - بادشاہ کے محل مین خاص جہاں پناہ کے لیئے ایک سو ایک خوانون کا تورہ جاتا - جس کی لاگت کا اندازہ پانچ سو روپیہ کا تھا - فرمان روایان اودھ مین واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ بڑے مقدس و متقی و پرہیزگار فرمان روا تھے - مناہی سے

بیچتے - اور امر شریعت کی پوری پابندی کرتے - اور کوئی کام بغیر جناب قبلۂ و کعبہ کی اجازت کے نہ کرتے - انھون نے جوش اتقا مین ملک کا روپیہ اپنی ذات پر صرف کرنا حرام تصور کیا - اور اپنے تمام اعزا سے خواہش کی کہ ہمین دعوت مین بجاے کھانے کے تم لوگ نقد روپیہ بھیجدیا کرو - نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ پانچ سو روپیہ بھیجدیا کرتے - مگر اُنکے ساتھ خوشنودی مزاج کے لیے ایک تورا بھی ضرور بھیجا جاتا - جس کے لیے اس کی پابندی نہ تھی کہ ایک سو ایک خوان ہون -

خوانون کی شان عام سوسائٹیون مین یہ تھی کہ لکڑی کے خوان اُن پر رنگین تیلیون کا گنبد نما جھابہ - اُسپر ایک سفید کپڑے کا کسنا جو چوٹی کے اوپر باندھ دیا جاتا - اور شاہی باورچی خانے اور معززامرا مین دستور تھا کہ اُس بندھن پر لاکھ لگا کے مُہر بھی کردی جاتی - تاکہ درمیان مین کسی کو تصرف کا موقع نہ ملے پھر اُس کسنے کے اوپر نہایت پُرتکلف رنگین اور اکثر ریشمی خوان پوش ہوتا - یہ خوان پوش بڑی سرکارون مین لازمی طور پہ اطلس اور کمخاب یا زربفت کے ہوتے - اور کبھی فقط لچکا ٹانک دیا جاتا یا کارچوب کا کام ہوتا -

ممکن ہے کہ یہ طریقہ دربار مغلیہ مین بھی جاری ہو - اور وہین سے لکھنؤ مین آیا ہو مگر ہم نے ان تکلفات کو جس اعلیٰ پیمانے پر لکھنؤ مین دکھیا دہلی مین نہین دیکھا - یہان کھانے پینے کے ادنے ادنے معاملے مین یہ تکلفات لازمی اور طبیعت ثانیہ ہوگئے ہین - کسی معمولی شخص کے لیے بھی فقط پانی مانگا جائے تو خدمتگار نہایت نفاست کے ساتھ گلاس کو تھالی مین رکھ کے اور اس پر جھجرا ڈھانک کے لائے گا اور ادب سے پیش کرے گا -

اس شوق - اس نفاست - اور ان تکلفات نے سوہی برس کے اندر لکھنؤ مین ایسے باکمال باورچی پیدا کردیے جن کی ہندوستان کے ہر شہر اور ہر دربار مین شہرت اور قدر تھی - اور مین نے ہندوستان کے تمام مسلمان دربارون اور ریاستون مین جہان گیا لکھنؤ ہی کے باورچیون کو پایا - جن کو خاص امرا اور والیان ملک کے مزاج مین دخل تھا اور اُن کی بڑی قدر ہوتی تھی - اس سے انکار

نہین کہا جا سکتا کہ اب حیدرآباد دکن ۔ بھوپال ۔ اور رامپور مین بڑے بڑے صاحبِ کمال باورچی موجود ہین ۔ لیکن اگر آپ اُن کی اصلیت کا پتہ لگائین اُن کے خاندان کا پتہ لگائین اور اُن کی ترقی کی تاریخ پر غور کرین تو یہی ثابت ہوگا کہ باورچی یا تو وہ لکھنؤ کے ہین یا لکھنؤ سے آئے ہوے باورچیون کی نسل سے ہین یا کسی لکھنوی باورچی کے شاگرد ہین ۔

ہم باورچی خانے کا حصہ ختم کر چکے مگر ابھی مٹھائیون کا ذکر باقی ہے ۔ مٹھائیون کا بنانا ہندو حلوائیون کا کام ہے ۔ اور انھین کی مٹھائیون سے عام پبلک آشنا ہوئی ہے ۔ لیکن مٹھائیان تیار کرنے مین مسلمان رکابدارون کا درجہ بڑھا ہوا ہے رکابدار عوام کی ضرورتون کو نہین پورا کر سکتے ۔ اس لیے کہ یہ ہندو حلوائیون کا حصہ ہے ۔ رکابدار خاص امیرون اور شوقین اور نفاست پسند امیرون کے لیے مٹھائیان تیار کرتے ہین جو بے نظیر اور بہت ہی لذیذ ہوتی ہین ۔

حلوائی لکھنؤ مین دو طرح کے ہین ۔ مسلمان حلوائی اور ہندو حلوائی ۔ مسلمان حلوائیون کی شان یہ ہے کہ اگر عام قسم کی مٹھائی لی جائے تو اُن کی دکان کی چیز ہندو حلوائیون کی دوکانون سے اچھی نہین ہوتی ۔ لیکن اگر فرمایش کر کے اُن سے خاص قسم کی تکلفی مٹھائی بنوائیے تو ہندو حلوائیون کی مٹھائی سے بہت زیادہ اچھی اور بہت ہی نفیس و لذیذ ہوتی ہے ۔ لیکن علی العموم لکھنؤ مین جلیبیان ۔ امرتیان اور بالوشاہی بہت اچھی بنتی ہین ۔

مٹھائیون مین یہ امتیاز کرنا دشوار ہے کہ کون اصلی ہندوون کی ہے اور کون مسلمانون کے ساتھ ہندوستان مین آئی ۔ لیکن نامون اور مذاق پر قیاس کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلوا خالص عربی چیز ہے ۔ جو عرب سے ایران ہوتا ہوا ہندوستان مین آیا اور اپنا نام بھی ساتھ لیتا آیا ۔ لیکن بظاہر یہ عام فیصلہ نہین ہو سکتا ۔ اس مین تفریق ہے ۔ تر حلوہ جو عموماً حلوائیون کے ہان ملتا ہے اور پوریون کے ساتھ کھایا جاتا ہے وہ خالص ہندو چیز ہے ۔ جیسے وہ موہن بھوگ بھی کہتے ہین ۔ مگر حلوا سوہن کی چار قسمین پپڑی ۔ جوزی ۔ حبشی ۔ اور دودھیا یہ خالص مسلمانون کی معلوم ہوتی ہین ۔ بجز یہ عربی مذاق کے حلوے جو جنوبی ہند خصوصاً مدراس مین مروج

ہین - اُن کا پتہ نہین - وہ واقعی خالص عربی حلوے ہین جو براہ راست عرب سے ہندوستان مین آگئے -

مگر ہندو حلوائیون کی اکثر مٹھائیان بھی مسلمانون ہی کے زمانے کی ایجاد معلوم ہوتی ہین - مثلاً برفی کا نام بتا رہا ہے کہ اُسے فارسی وعجمی مذاق نے ایجاد کیا - بالوشاہی خرمے - نکتیان - گلاب جامن - دربہشت - وغیرہ بھی عہد اسلام کی ایجادین ہین -

جلیبی کو عربی مین زلابیہ کہتے ہین - اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلابیہ ہی سے بگڑ کے جلیبی کا لفظ بنا ہے - اس لیے یہ بھی انھین عربی وفارسی مٹھائیون مین شامل کرنے کے قابل ہے - پیڑا خالص ہندی مٹھائی ہے اور امرتیان بھی ہندی ہین - مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ امرتی خاص لکھنؤ مین ایجاد ہوئی - فی الحال ان مٹھائیون کے اعتبار سے لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہین - جو درجہ بلندی ہند کے تمام ممتاز شہرون کو حاصل ہے وہی لکھنؤ کو بھی حاصل ہے - بلکہ یہ عجیب تماشا نظر آتا ہے کہ لکھنؤ مین تو آگرے اور پنجاب کے حلوائی زیادہ مشہور ہین - اور دوسرے شہرون مین مجھے یہ نظر آیا کہ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے حلوائیون کو زیادہ نمود حاصل ہے - دراصل اس کو کسی دُکان کے چل جانے سے تعلق ہے - اس لیے کہ جس حلوائی کی دُکان جس قدر زیادہ چل جاتی ہے اُسی قدر اُسے مٹھائیون مین ترقی کرنے کا موقع مل جاتا ہے -

حلوائیون کی نسبت اصلی فیصلہ یہ ہے کہ ہندو حلوائیون کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہے مٹھائیون کے جتنے قدردان ہندو ہین مسلمان نہین - مسلمانون کو شاید گوشت خوری کی وجہ سے علی العموم نمکین کھانون کا زیادہ شوق ہے - بخلاف اُنکے ہندو مٹھائیون کے زیادہ شوقین ہین - وہ فقط مٹھائیون سے پیٹ بھر لیتے ہین جو مسلمانون سے غیر ممکن ہے - اور ہندوؤن کی رغبت کی وجہ سے متھرا - بنارس اور اجودھیا جو ہندوون کے مذہبی مرکز ہین مٹھائیون کے اقسام اور مزے کے اعتبار سے دوسرے شہرون پر فوقیت رکھتے ہین -

مگر حلوا سوہن کے بنانے مین مسلمان رکابدارون کے علاوہ اور بہت سے لوگون نے بھی شہرت حاصل کی - آخر زمانے مین یہان کے مشہور خوشنویس منشی ہادی علی صاحب نے پپڑی حلوا سوہن مین خاص ناموری حاصل کی - وہ سیر بھر سمنک مین پچیس تیس

سیر گھی کھپا دیتے۔ اور اُس کی ٹکیون پر عجیب عجیب قسم کے خوبصورت طغرے بناتے جن سے حلوا سوہن بنانے کے ساتھ خوشنویسی اور نقاشی کے کمالات بھی ظاہر ہوتے۔

اسکے بعد مین نے مٹیا برج (کلکتہ) مین منشی السلطان بہادر کو جو لکھنؤ کے ایک رئیس زادے تھے اپنی آنکھون سے بارہا دیکھا کہ چھٹانک بھر سمنک مین دو ڈھائی سیر گھی کھپا دیتے۔ جو فی سیر چالیس سیر کے قریب پڑا۔ ان کا پپڑی حلوا سوہن سچے زر دکے دھوئے کپڑے کے مانند اُجلا اور سفید ہوتا۔

(۳۱)

باورچی خانے اور کھانون کی ایجاد و ترقی کے متعلق ہم کافی درجے تک لکھ چکے ہین۔ لیکن اتنا اور کہنا چاہتے ہین کہ یہان اور عموماً ایشیائی ممالک مین خوش مزگی پیدا کرنے کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش اہمیت کے ساتھ کی جاتی تھی کہ لطافت ذوق کے ساتھ غذاؤن مین اعلیٰ درجے کی روح افزا خوشبوئین پیدا ہون۔ رنگ نفیس اور دلکش رہے۔ صورت نظر فریب اور شوق دلانے والی ہو۔ اگرچہ ہندوستان کے تمام شہرون مین جہان لوگون کو اچھا کھانے کا شوق ہے ان تمام امور کی کوشش کی جاتی ہے مگر اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ لکھنؤ سب جگہ سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ کسی جگہ کھانے کا سچا ذوق چند امیرون اور مخصوص لوگون تک محدود رہا ہے۔ مگر یہان قریب قریب ہر شخص مین ایک صحیح ذوق پیدا ہو گیا۔ اچھے باورچی ہی نہین پیدا ہوے بلکہ معزز اور شریف گھرانون کی عورتون مین رکابدارون سے زیادہ نفاست مزاجی اور ذوق کی خوش سلیقگی پیدا ہو گئی۔ کوئی معزز خاندان نہین ہے جس کی محترم بیگمون مین سے ہر ایک کھانا پکانے مین اچھا سلیقہ نہ رکھتی ہو۔ اور اُسے کسی اچھی غذا کے تیار کرنے مین دعوے نہ ہو۔

دودھ دہی کا ہر جگہ رواج ہے۔ لکھنؤ مین ان دونون چیزون کے علاوہ بالائی کی تیاری مین زیادہ توجہ ہوئی۔ اس لیے کہ دودھ کا لطیف ترین حصہ اُس مین آ جاتا ہے۔ انگریزی مین اسی کو "کریم" کہتے ہین۔ جسکا رواج یورپ مین کثرت سے ہے۔ مگر وہان کریم اس کا نام ہے کہ دودھ تھوڑی دیر رکھا رہے اور جب دُہنیت کا سفید اور لطیف حصہ اوپر آ جائے تو کاچھ کے الگ کر لیا جائے

یہان دودھ کا یہ لطیف حصہ ہلکی آگ پر رکھ کے اور جما کے الگ کیا جاتا ہے۔ اور بڑی نفاست سے اُس کی تہ پر تہ جما دی جاتی ہے۔ بالائی کی تہون کو نفاست اور خوشنمائی سے جمانا ایسا کام ہے جو لکھنؤ کے سوا شاذ و نادر ہی کسی اور شہر کے لوگون کو آتا ہوگا۔

اس کو پُرانی زبان مین مَلائی کہتے ہین۔ آصف الدولہ بہادر نواب اودھ کو یہ اس قدر پسند تھی کہ خاص اہتمام سے اُن کے لیے تیار کی جاتی۔ اُنھون نے اس کا نام مَلائی کے عوض بالائی رکھ دیا۔ اس لیے کہ یہ دودھ کے اوپر کی چیز ہے۔ اہل لکھنؤ کو اپنے فرمان روا کا یہ تصرف بہت پسند آیا۔ اور بالائی کا لفظ زبانون پر اس قدر چڑھ گیا کہ اب لکھنؤ مین سوا دیہاتیون یا ہندو جہلا کے سب اسے بالائی ہی کہتے ہین اور ملائی کا لفظ کسی مہذب شخص کی زبان پر باقی نہین ہا

اس پر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے آب حیات مین اعتراض کر دیا اور انصاف کو ذوق سلیم پر محول فرمایا۔ جس معیار سے اُنکے مذاق مین "ملائی" کا لفظ بالائی سے زیادہ لطیف و فصیح ہے۔ کسی لفظ کو محض اپنے مذاق کے اعتبار سے غیر فصیح کہدینا میرے نزدیک ایک بے معنی سی چیز ہے۔ اس لیے کہ ہر جماعت کو وہی الفاظ اپنے ذوق مین اچھے معلوم ہوتے ہین جو اُن لوگون کی زبان پر چڑھے ہون اور اُن کے لہجے اور محاورے سے مانوس ہوگئے ہون۔ جن شہرون کے لوگ ملائی کہتے ہین انکو بے شک بالائی کا لفظ گران گذرتا ہوگا۔ اور اُن کی زبان سے نا آشنا ہوگا۔ مگر جس شہر مین لوگ بالائی کہتے ہین اور یہی لفظ اُنکے محاورے مین شامل ہوگیا ہے اُن کو جو فصاحت بالائی مین نظر آتی ہے ملائی مین ممکن نہین۔ اُن کو ملائی جاہلون اور گنوارون کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ فصاحت و لطافت زبان کا اندازہ کسی خاص ذوق یا کسی منطق سے نہین ہوتا بلکہ جو لوگ اہل زبان مان لیے جاتے ہین فقط اُن کا ذوق اور محاورہ معیار قرار پا جاتا ہے اور سب کو بغیر کسی منطقی دلیل کے اُن کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ اُردو کے لیے اب دہلی و لکھنؤ دونون اہل زبان کے مستند اسکول سمجھے جاتے ہین۔ لہذا دونون مسلم الثبوت معیار سخن ہین۔ چاہے ایک کا لفظ دوسرے کو

غیر مانوس ہی کیون نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ لکھنؤ کی زبان کو سچا اور مستند معیار رہی یہ تسلیم کیا جائے۔ لیکن اس جھگڑے مین ہم پڑنا نہین چاہتے۔ اور غالباً یہ جھگڑا طے بھی ہو چکا ہے۔ بہرحال اگر دونون شہر معیار مانے جائین تو ملائی اور بالائی بجائے خود دونون فصیح ہین۔ ملائی اہل دہلی کے نزدیک اور بالائی اہل لکھنؤ کے نزدیک۔ کسی کو کسی پر اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نہین ہو سکتی۔

کھانے کے پکانے سے زیادہ یا اُسی کے برابر ضرورت کھانون کے نکالنے مین اچھا سلیقہ دکھانے۔ اور نکالنے کے بعد اُسکے آراستہ کرنے اور سجنے کی ہے یورپ کا موجودہ مذاق یہ ہے کہ میز خوب آراستہ کی جاتی ہے۔ اُسپر جابجا گلدستے لگائے جاتے ہین۔ اور بعض جگہ تکلف کے لیے کچے چاولون کو مختلف رنگون مین رنگ کے اُن سے میز پر حروف اور نقش ونگار بنا دیے جاتے ہین۔ ظروف بھی نہایت صاف ستھرے قیمتی اور اکثر چاندی کے کام مین لائے جاتے ہین۔ مگر خاص کھانے کی سجاوٹ کا انگریزی باورچیون یا خانساماؤن کو چندان خیال نہین ہوتا۔ بجز شادیون کے کیک کے جو امرا اور لارڈون کے عروسی ڈنرون مین عجیب تکلفات سے برجون یا خوبصورت عمارتون کی وضع مین بنا کے دعوت ولیمہ کی میز پر لگا دیے جاتے ہین۔

اسکے خلاف ہندوستان مین دسترخوان کی آراستگی کی طرف تو کم توجہ کیجاتی ہے مگر خود کھانے اعلیٰ درجے کی نفاست سے نکال کے سجے جاتے ہین۔ اُن پر چاندی سونے کے ورق لگائے جاتے ہین۔ پستے اور بادام کی ہوائیون سے نقش ونگار اور رنگ رنگ کے پھول بنائے جاتے ہین۔ کھوپرے کے ورق کاٹ کاٹ کے نہایت ہی موزون ترتیب سے اُنپر آراستہ کیے جاتے ہین۔ اس فن مین رکابدارون کو خاص کمال حاصل ہے۔ بلکہ اُن کا کام یہی ہے کہ جس خوبی سے غذاؤن کو تیار کرین اُس سے زیادہ خوشنمائی سے انکو سجین۔ اور ہر پلیٹ کو ایک گلدستہ بنا دین۔

لکھنؤ مین یہ تکلفات اہل پیشہ باورچیون اور رکابدارون سے شروع ہو کے شرفا کے عام گھرون مین پہونچ گئے۔ اور خاتونون اور بیگمون کو اس مین ایسا

اچھا سلیقہ ہوگیا کہ جو خوبی پلیٹون اور رقابون کے سجنے مین اکثر وہ دکھاتی ہین خود رکابدارون سے بھی ممکن نہین - اگرچہ یہ خاص اُنھین کا ہنر ہے - یورپ کے محققین نے طے کر دیا ہے کہ عورتین فنون لطیفہ سے خاص مناسبت رکھتی ہین - خصوصاً کسی چیز کے سجنے اور آراستہ کرنے مین ان کو بالطبع مردون پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اس کا ثبوت ہندوستان مین لکھنؤ کی اُن عورتون کی طبیعت داری سے مل سکتا ہے جو کھانون کے سجنے مین کمال دکھا دیا کرتی ہین -

ہندوستان کے عروسی کے کیک جن کا ابھی ذکر ہو چکا چوکھے ہین - جو عموماً رسم کے طریق سے شادیون مین دولہا دولھنون کے سامنے لگائے جاتے ہین اُن کو اکثر گھرون کی خاتونین ایسی نفاست مزاجی اور خوش سلیقگی سے آراستہ کرتی ہین کہ جی چاہتا ہے بیٹھے اُنھین دیکھا کیجیے -

کھانے کے ساتھ ہی آبدارخانے کی ترقیون کو بھی بیان کر دینا لطف سے خالی نہ ہوگا - آبدارخانہ بادشاہون اور امیرون کے پانی کے انتظام کا نام ہے - اگلے دنون برف نہ تھی - اور بعض موسمون مین ٹھنڈا پانی ملنا نہایت ہی دشوار ہوتا تھا - اسکے لیے اُن دنون خاص قسم کے انتظام کیے جاتے تھے - پانی کورے گھڑون مین بھر کے رکھا جاتا - نازک اور نفیس آبخورے پینے کے لیے موجود رہتے - گھڑون اور آبخورون پر سرخ کپڑا چڑھا دیا جاتا - اور وہ تر رکھا جاتا - اس لیے کہ ہوا لگنے سے بھیگا کپڑا خوب ٹھنڈا ہو جاتا - یہان تک کہ گرم ہوا اور لو بھی جتنی زیادہ گرم ہوتی اُتنا ہی زیادہ کپڑے کو ٹھنڈا کر دیتی - اور کپڑے کی ٹھنڈک اندر کے پانی کو ٹھنڈا کرتی - اکثر جھجریان اور صراحیان بلکہ گھڑے بھی منہ پر کپڑا باندھ کے کسی درخت کی ٹہنیون مین اُلٹے لٹکا دیے جاتے - ہوا کا اندر نفوذ نہ ہونے کی وجہ سے پانی نہ گرتا - اور خوب ٹھنڈا ہو جاتا - برسات مین جب یہ تدبیر بھی کامیاب نہ ہوتی تو اکثر گھڑے بھر کے کنوؤن کے اندر لٹکا دیے جاتے جہان اُن مین خوب خنکی پیدا ہو جاتی -

اس کے علاوہ سب سے بڑا انتظام یہ تھا کہ جست کی نازک صراحیان موجود رہتین - اور وہ ناندون مین شورا اور پانی ڈال کے اُس مین پھرائی

جاتین۔ اس تدبیر سے تھوڑی دیر مین پانی مین برف کی سی خنکی پیدا ہو جاتی۔ اور اُس کی ٹھنڈک نہایت ہی لطیف و خوشگوار ہوتی۔ اس تدبیر کو صراحیون کا جھلنا کہتے تھے۔

بعد کے زمانے مین برف کے فراہم کرنے کی بھی ایک معقول اور دیرپا تدبیر نکال لی گئی تھی۔ چلّون کے جاڑون مین جب سردی خوب شدت پر ہوتی کھیتون اور کھلے میدانون مین رات کو گلی رکابیون اور پیالون مین گرم گرم پانی بھر کے رکھ دیا جاتا جو صبح کو جما ہوا ملتا۔ اس برف کو اُسی وقت فوراً زمین کے اندر گہرے کھتون مین جو پہلے سے کھُدے تیار رہتے دفن کر دیتے۔ اور ان مین وہ برف جب تک دبی رہتی اپنی حالت پر قائم رہتی۔ بہر حال اس طریقے سے اتنی برف بنا کے کھتّون مین بھر دی جاتی کہ سال بھر کے لیے کافی ہوتی۔ اور اُسی مین سے ہر روز نکال لی جاتی۔ مگر یہ برف اس قدر صاف نہ ہوتی کہ پانی مین ملائی جائے۔ بلکہ شورے کی طرح اُس مین نمک اور شورا ملا کے صراحیان جھلی جاتین۔ یا برف کی قلفیان جمائی جاتین۔

مگر یہ انتظام خاص بادشاہون یا اُن کے ہم رتبہ امیرون تک محدود رہتا۔ غریب لوگ اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکتے۔ غربا اور متوسط درجے کے لوگ اُنھین اول الذکر تدبیرون سے کام لے کے پانی ٹھنڈا کرتے۔ اور یہ اہتمام اس قدر عام ہو گیا تھا کہ تھوڑا بہت ہر گھر مین رہتا۔

بہر تقدیر لکھنؤ مین پانی کے لیے یہ اہتمام اُن دنون ہوا کرتا۔ اور نفاست مزاجی نے یہ تکلفات پیدا کر دیے تھے کہ مٹی اور جست کی صراحیون اور ایسے ہی آبخورون پر اکثر سرخ شالبات (ڈول) کا کپڑا چڑھا ہوتا۔ اور ڈول پر روپہلا گوٹا خوبصورتی سے لپیٹ کے اُن مین ایسا لطف پیدا کر دیا جاتا کہ پینا درکنار اُنکے ظروف دیکھ کے آنکھون مین خنکی پیدا ہو جاتی۔

مجھے یہ نہین معلوم کہ آبدار خانے کا یہ انتظام جو مین نے بیان کیا ہے پورا پورا دہلی مین تھا بھی یا نہین۔ غالباً وہان ضرور ہو گا۔ اور وہین سے یہ سب چیزین لکھنؤ مین آئی ہون گی۔ مگر مین نے اس اہتمام اور سامان کو جس تکمیل کے

ساتھ اور جس تعمیم سے لکھنؤ کے لوگون مین دکھا تھا دہلی مین نہین دکھا۔ ممکن ہے کہ وہان بھی ایسا ہی ہو۔ لیکن اس مین شک نہین کیا جا سکتا کہ لکھنؤ مین آ کے مٹی کے ظروف آب کی لطافت و نفاست اور نزاکت بہت بڑھ گئی۔ اس لیے کہ یہان کی مٹی کی عمدگی کی وجہ سے جیسے نازک و خوشنما اور خوش قطع ظروف گلی لکھنؤ مین بن سکتے ہین اور کہین نہین بن سکتے۔ دہلی والون کے پاس جست کی صراحیان ایسی ہی ہونگی مگر ایسی مٹی کی صراحیان وہان کسی کو نصیب نہین ہوسکین۔ ان ظروف گلی کا حال ہم آیندہ مناسب موقع پر بیان کرین گے۔

بادشاہون کے ساتھ جہان وہ جائین باورچی خانہ اور آبدار خانہ بھی جایا کرتا تھا۔ لیکن یہان آبدار خانے کا اہتمام دوسرے امرا کے دہان بھی اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بہت سے امرا تھے جو اپنا آبدار خانہ اپنے ساتھ رکھتے۔ چنانچہ مرزا حیدر صاحب کا آبدار خانہ اور بھنڈی خانہ اس فیاضی کے اصول پر قائم تھا کہ وہ جس شادی کی محفل مین جاتے ساری محفل کو پانی اور حقّہ پلانے کا انتظام اُنھین کے سپرد ہو جاتا۔ اور اُن کی شرکتِ محفل بہت سے لوگون کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ اور رحمت الٰہی بن جاتی۔

(۳۲)

اب ہم اس دربار اور لکھنؤ کے لباس پر بحث کرنا چاہتے ہین جو در اصل نہایت ہی دلچسپ بحث ہے۔ ہندوستان کے لباس کی تاریخ نہایت تاریکی مین ہے۔ مسلمانون کے آنے سے پیشتر ہندوستان مین جہان تک پتہ لگایا جائے اور قدیم مورتون اور آلوز وغیرہ کی تصویرون پر غور کیا جائے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانون کے آنے سے پہلے یہان سیے ہوے کپڑے کا رواج نہ تھا۔ عورت اور مرد دونون بے سی ہوئی چادرون۔ ساریون۔ اور دھوتیون سے بدن ڈھانکتے تھے۔ عرب سیاح جو فاتحان اسلام سے پہلے ہی یہان پہونچ گئے تھے اُنھون نے سندھ سے لے کے بنگالے تک ہر ساحلی شہر اور قریب کے اندرونی علاقون مین یہان کے لوگون کو اسی وضع مین پایا۔

پہلے عرب مسلمان جو یہان پہونچے وہ اگرچہ کرُتے۔ قمیص۔ اور عبا مین پہنتے

تھے گر لباس و وضع میں اُنھیں یہاں کے لوگوں پر کچھ زیادہ فوقیت نہیں حاصل تھی۔ لباس میں ترقی اُس وقت سے شروع ہوئی جب ساسانی معاشرت اختیار کر کے بغداد کے عباسی دربار نے شرفائے عرب کے لیے پائجامے۔ عبا و قبا اور خوش قطع عمامے ایجاد کیے۔ جو لباس کہ کلیۃً یا زیادہ تر ساسانی دربار کے امرا و اعیان کی وضع سے ماخوذ تھا۔ چند ہی روز میں یہی لباس اُن تمام مسلمانوں کا ہو گیا جو مصر سے دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے اور آخر وہ اس لباس کو لیے ہوئے ہندوستان میں آئے۔ تصویروں میں جو لباس عہد اولین کے مسلمان تاجداران ہند کا نظر آتا ہے وہ قریب قریب وہی ہے جو بجھی و عباسی امرا و فرماں رواؤں کا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کے سلاطین ہند اور راجاؤں کی تقلید میں جواہرات بہت زیادہ پہنا کرتے تھے۔

دہلی میں دربار مغلیہ کا آخری لباس جو ہمیں معلوم ہو سکا یہ تھا کہ سر پر پگڑی۔ بدن میں نیمہ جامہ۔ ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا تنگ مُہری کا پائجامہ۔ پاؤں میں اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا۔ اور کمر میں جامے کے اوپر پٹکا۔ بس یہی دہلی کے قدیم شرفا کی وضع تھی۔ جس میں محمد شاہ رنگیلے کے زمانے تک کسی قسم کا رد و بدل نہیں ہوا تھا۔ اور اگر ہوا بھی ہو تو اتنا نہ تھا کہ ہم کو نظر آ سکے۔

اس لباس میں نیمے سے مراد کہنیوں تک کی آدھی آستینوں کا شلوکا تھا۔ اور سینے پر سامنے اُس میں گھنڈیاں لگائی جاتیں۔ اسکو نیچے پہن کے اسکے اوپر جامہ پہنا جاتا۔ جو بجھی قبا میں ترمیم کر کے بنایا گیا تھا۔ اُس میں گریبان نہ ہوتا۔ بلکہ دونوں جانب کے کنارے جو "پردہ" کہلاتے۔ ترچھے ایکدوسرے پر آ کے سینے کو ڈھانک لیتے۔ سینے کا بالائی حصہ جو گلے کے نیچے ہوتا ہے اُسی طرح کھلا رہتا جیسے آجکل انگریزی کوٹوں میں کھلا رہتا ہے۔ اور جس طرح فی الحال قمیص سینے کے اوپر والے حصے کو چھپاتا ہے اُسی طرح اُن دنوں نیمہ اُسکو ڈھانکے رکھتا۔ سینے پر جامے کا وہ پردہ جو بائیں طرف سے آتا نیچے رہتا اور

داہنے پہلو پر بندون سے باندھ دیا جاتا۔ اور اس پر داہنی طرف کا پردہ رہتا۔ جو اوپر بائین پہلو مین باندھا جاتا۔ پھر اُس مین کمر کے پاس سے دامنون کی عوض ایک اسکرٹ سی جوڑ دی جاتی جو ٹخنون کے اوپر تک لٹکتی رہتی۔ اُس مین بہت سی چُنٹ دی جاتی۔ اور اُس کا گھیر بہت بڑا ہوتا۔ جامے کی آستینین آدھی کلائی تک بے سی اور کھلی رہتین۔ اور دونون جانب لٹکا کرتین۔ اُس کے نیچے سیدھی سادھی تنگ مُہریون کا پائجامہ ہوتا جو اُمرا مین مشروع اور گلبدن کا ہوا کرتا۔ پھر جامے کے اوپر کمر مین پٹکا باندھ لیا جاتا۔

دو تین صدی پیشتر ہمارے بزرگون اور ہندوستان کے امیرون اور تمام شریفون کا یہی لباس تھا۔ ٹوپیون۔ پگڑیون۔ اور پائجامون مین جو ترمیمین ہوئین اُن کا مفصل و مشرح حال ہم بعد بیان کرین گے۔ سردست ہم درمیانی حصۂ جسم کے لباس کا ذکر کرتے ہین جو سچ پوچھیے تو اصلی لباس ہے اور اسی سے انسان کی وضع قطع مشخص و معین ہوتی ہے۔ یہی اُس دور کا درباری لباس تھا اور یہی لباس پہنے ہوے نواب بُرہان الملک منصور جنگ اور شجاع الدولہ دہلی سے اودھ مین آئے تھے۔ جامہ عموماً باریک ململ کا ہوتا جو ہندوستان کے مختلف شہرون مین نہایت نفیس۔ باریک۔ اور سبک بنا کرتی اور ساری دنیا مین مشہور تھی۔ ڈھاکے کی ململ اور جامدانی عالی مرتبہ امیرون اور بادشاہون کے لیے مخصوص تھی۔

اسکے بعد ایرانی قبا سے ماخوذ کرکے بالابر ایجاد ہوا۔ جس مین گول گریبان بالکل کھلا رہتا۔ اس لیے کہ سینے کے ڈھاکنے کے لیے نیمہ کافی تھا جو اُسکے نیچے بھی پہنا جاتا۔ وہ چُنٹ اور گھیر اس مین سے نکال دیا گیا۔ اور اس ضرورت سے کہ دامن آگے کی طرف نہ کھلین۔ داہنے دامن مین ایک چوڑی کلی لگا دی جاتی یہی کلی اُس کلی کا نقش اولین ہے جو فی الحال شروانیون مین بائین جانب نیچے لیجا کے بند سے باندھی یا ہُک سے اٹکائی جاتی ہے۔ بالابر بھی دہلی ہی کی ایجاد ہے۔

اسی بالابر پر ترقی کرکے دہلی ہی مین انگرکھا ایجاد کیا گیا جس مین دراصل

جامہ اور بالا بر دونون کو ملا کے ایک نئی قطع پیدا کی گئی - اس مین سینے پر چولی قبا سے لی گئی - مگر سینہ کھلا رکھنے کی جگہ ایک گول اور لمبوترا گریبان بڑھایا گیا - جس کے اوپر گلے کے نیچے ایک ہلال نما کنٹھا لگایا جاتا اور وہ بائین طرف گردن کے پاس گھنڈی تکمے سے اٹکا دیا جاتا - چولی نیچے رہتی جس مین پہلے داہنی طرف کا پردہ نیچے بغل مین بندون سے باندھا جاتا اور پھر اوپر بند ہوتے - جس سے دونون طرف کے پردے سینے کے نیچے بیچو بیچ مین لا کے باندھ دیے جاتے - اُس مین بائین جانب تھوڑا سا سینہ کھلا رہتا - چولی نیچی رہتی - اور نیچے دامن اگرچہ قبا کے سے ہوتے مگر پُرانے جامے کی یادگار مین دونون پہلوؤن پر بغلون کے نیچے چُنٹ ضرور رکھی جاتی -

یہ پُرانا انگرکھا تھا جو دہلی کے آخری دور مین رواج پا چکا تھا اور وہان سے سارے ہندوستان مین پھیل گیا - لکھنؤ مین آنے کے بعد اس انگرکھے مین زیادہ چستی اور قطع داری پیدا کی گئی - چولی خوب گول اونچی اور کھنچی ہوئی چُست ہوگئی - بغلون کی چُنٹ بالکل نکل گئی - دامنون مین بجائے موڑ کے ٹانک دینے کی سنجافی گوٹ لگائی گئی - پھر اُس کے بعد نواب زادون اور شوقین وضعدارون نے ایک کمر توئی کے عوض جو چولی کے نیچے بند لگانے کی جگہ پر ہوتی پلیٹون کی وضع سے تین تین کمر توئیان لگائین - جا بجا گوٹ اور کمر توئیون کے پاس کٹاؤ کا کام بنایا -

دہلی مین انگرکھے کے ایجاد ہونے کے بعد نیمہ چھوٹ گیا تھا - اور بائین جانب سینے کا کھلا رہنا معیوب نہ تھا بلکہ وضعداری خیال کیا جاتا - لکھنؤ مین اُس کے نیچے نیمے کے عوض شلوکا ایجاد ہوا جس مین آگے کی طرف بوتام لگائے جاتے - اس لیے کہ اب یورپ کے بوتام یہان پہونچ گئے تھے - شلوکون مین خاص وضعداریان دکھائی جاتین - نازک مزاج لوگ جالی یا بارلیٹ کے چُست شلوکے پہنتے جن مین کچے سوت سے نقش ونگار کاڑھے جاتے - بعض لوگ رنگین شلوکے پہنتے اس لیے کہ اُس کے بیل بوٹے اور اُس کا رنگ تنزیب کے سپید انگرکھے کے نیچے سے اپنی جھلک دکھا کے خاص لطافت اور خاص نفاست

پیدا کر دئے۔

دوسری ترمیم بالابر میں دربار کے لکھنؤ آنے کے بعد یہ ہوئی کہ چکن کے نام سے ایک چست قبا ایجاد ہوئی۔ اس میں ویسا ہی گول گریبان رکھا گیا۔ اور اُس میں انگرکھے کی طرح سینے پر پردہ بھی لگایا گیا مگر وہ پردہ داہنی جانب قوس نما صورت میں بوتاموں سے اٹکایا جاتا۔ اس میں داہنی جانب گلے کے پاس سے بوتاموں کی ایک خوشنما قوس گولائی لیتی ہوئی کوڑی تک آتی اور اُسکے مقابل دوسری جانب کی قوس میں اصلی قبا میں سی دیا جاتا۔ اُس میں بھی بالابر کی طرح چوڑی کلی اوپر لگائی جاتی جو بغل کے نیچے بائیں طرف بوتام یا گھنڈی سے اٹکا دی جاتی۔ یہ چکن جو شالی یا کسی اور بھاری کپڑے کی ہوتی اور جاڑوں کے موسم کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ ایک زمانے میں یہاں اہل دربار اور خاصتہً اہل کار بار یابان دربار کا معزز لباس تھی۔ اسے انگریزوں نے بھی بہت پسند کیا۔ اور اپنے ملازموں کو ایک مدت تک وہی پہناتے رہے۔

سب کے بعد لکھنؤ کے بالکل آخری عہد میں چکن اور انگرکھے دونوں کے ترتیب دینے سے اچکن ایجاد ہوئی۔ اس میں انگرکھے اور چکن کا سا گریبان قائم رکھا گیا۔ جو بیچ سے سیدھا کاٹ کے آدھا آدھا دونوں جانب سی دیا جاتا۔ اور سلائی کی جگہ پر سنجافی گوٹ کے ذریعہ سے گریبان کی گولائی اور قطع برقرار رکھی جاتی۔ بیچ کے چاک میں جو گلے سے لے کے سیدھا کوڑی تک آتا بوتام لگا دیے جاتے۔ وہ بالابر کی کلی جو اوپر لگائی جاتی تھی اُس میں نیچے کر دی گئی تاکہ دامن بھی نہ کھلیں اور بالابر کی کلی کے اوپر کی طرف لگانے سے جو بدمذاقی ظاہر ہوتی تھی دُور ہو جائے۔ اچکن کا نیچے کا حصہ بالکل چکن اور انگرکھے کا سا ہوتا۔ شوقین لوگ اُس میں بھی ویسی ہی دردامن گوٹ اور اُسی طرح کی تین تین کمر تویاں لگاتے۔ اور کٹاؤ کا کام بناتے۔

یہ آخری ایجاد اچکن لوگوں کو بہت پسند آئی۔ اس کا رواج شہر سے گذر کے دیہاتوں میں بھی شروع ہوا۔ اور آناً فاناً ساری ہندوستان میں پھیل گیا

یہی اچکن حیدرآباد پہونچ کے تھوڑی سی ترمیم کے بعد شروانی بن گئی۔ وہاں اس کی آستینیں انگریزی کوٹ کی سی کر دی گئیں۔ گریبان جو گوٹ لگا کے سینے پر نمایان کیا جاتا تھا نکال ڈالا گیا۔ قطع و بُرید میں انگریزی کوٹ کی وضع دامنوں وغیرہ میں بھی اختیار کی گئی اور وہ لباس ایجاد ہوگیا جو آج کل ہندوستان کے ہندو مسلمان تمام لوگوں کا قومی لباس کہے جانے کے قابل ہے۔ لکھنؤ والوں نے بھی چند روز بعد جب اپنی پُرانی ایجاد میں حیدرآباد کی مناسب اصلاح دیکھی تو اُسے بہت ہی پسند کیا۔ اور تھوڑے ہی زمانے میں شروانی کا رواج ہر شہر اور قریے کی طرح لکھنؤ میں بھی ہو گیا۔

انگرکھے کے نیچے جو شلوکا پہنا جاتا تھا اُس کے عوض پہلے ڈھیلا اور اُونچا کُرتا اختیار کیا گیا۔ اور چند روز بعد مغربی اثر نے کُرتا چھُڑا کے انگریزی قمیص کو رواج دیا جس میں کف اور کالر ہوتے ہیں۔ قمیص اور کالر کے رواج نے شروانی کے تکلفات اور بڑھائے۔ یعنی لازمی ہوگیا کہ سفید کالر اوپر نکلا رہے اور شروانی کا اوپر کا سرا گلے پر ہُک سے اٹکا کے قمیص کے اُس بالائی بوتام کے نیچے رہے جس میں کالر لگایا جاتا ہے۔ آستینیں اتنی رہیں کہ کفوں کا کسی قدر حصہ نکلا رہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں اور متوسط طبقے والوں کا لباس دوسرے شہروں کی طرح فی الحال لکھنؤ میں بھی یہی شروانی ہے۔ مگر اسکو لکھنؤ سے خصوصیت نہیں۔ لکھنؤ کی ایجاد و اختراع کا خاتمہ اچکن پر ہو گیا۔ جو اب قریب قریب بالکل متروک ہو گئی ہے۔

(۳۴)

درمیانی حصۂ جسم کے لباس کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ لہذا اب اس جُزو لباس کی طرف توجہ کرتے ہیں جو سر کے لیے مخصوص ہے۔ اور اسی لباس کی ہندوستان میں زیادہ عزت و حرمت کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جس طرح سر سارے جسم میں ممتاز ہے اُسی طرح اُسکے لباس کو بھی زیادہ ممتاز ہونا چاہیے۔ قدیم الایام سے ہندوستان میں پگڑی باندھنے کا رواج چلا آتا ہے۔ اگرچہ عربی وعجمی بھی عمامے باندھے ہوے یہاں آئے اور اُنکی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے یہاں کی

پگڑیوں میں بہت کچھ تغیر ہوگیا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہاں پگڑی نہ تھی۔

ابتدائی دور کے مسلمان فرمان رواؤں کے عمامے بڑے بڑے تھے۔ اور اسی لحاظ سے اُن دنوں تمام معززین و اُمرا اور دولتمندوں کی پگڑیاں بھی غالباً بڑی بڑی ہوں گی۔ جن کے نیچے قدیم ترکی وضع کی نوکدار مخروطی ٹوپیاں ہوتیں جو افغانستان میں آج تک مروج اور موجود ہیں۔ اور اُنھیں سے لے کے ہماری ہندوستانی فوج کی وردیوں میں شامل کی گئیں ہیں۔

سلطنت مغلیہ کے عہد میں پگڑیاں روز بروز چھوٹی ہونے لگیں۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ سرد ممالک میں جس طرح سردی کی مضرت سے بچنے کے لیے جوں جوں زمانہ گذرتا ہے لباس وزنی اور گُندہ ہوتا جاتا ہے ویسے ہی گرم ملکوں میں سُبک ہلکا اور مختصر ہوتا رہتا ہے۔ اگلے مسلمان فاتح جیسے بھاری اور موٹے کپڑے پہنے ہوے یہاں آئے ہوں گے اُنکے وزنی ہونے کا اندازہ تو ہم فقط قیاس سے کر سکتے ہیں مگر انگریزوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ اُن کا اور اُن کی عورتوں کا لباس روز بروز کس قدر سُبک۔ ہلکا۔ اور مختصر ہوتا جاتا ہے۔

اسی اصول کے مطابق یہاں پگڑیاں روز بروز ہلکی اور چھوٹی ہوتی گئیں۔ اور ملک کا یہ رجحان دربار کی وضع پر بھی اثر کرتا گیا۔ دربار مغلیہ کے آخر عہد میں اُمرا اور منصبداروں کی پگڑیاں بہت ہلکی ہوگئی تھیں۔ اور اسی اختصار پسندی نے یہ بات پیدا کی کہ پگڑیوں کی صدہا قطعیں ہوگئیں۔ اور اکثر اُمرا نے اپنے لیے خاص بندشیں اور خاص وضع کی چھوٹی چھوٹی پگڑیاں ایجاد کرلیں۔

پگڑیوں کے اختصار نے ترکی کلاہ کو ترک کرا دیا۔ اور یہ حالت ہوگئی کہ کسی کی پگڑی کے نیچے ٹوپی ہوتی ہی نہ تھی۔ اور بعض پہنتے بھی تھے تو کسی بہت ہی باریک کپڑے کی ذراسی ٹوپی جو پھونک میں اُڑ جائے۔ ان ٹوپیوں کی نسبت ہمیں وثوق کے ساتھ نہیں معلوم ہے کہ کس وضع کی ہوتی تھیں۔ غالباً اُن ٹوپیوں کی قطع اُن ٹوپیوں کی قطع سے ملتی ہوتی ہو گی جو اب مشائخ اور فقرا اسکے سروں پر ہوتی ہیں۔ یعنی ایک چھ سات اُنگل کی چوڑی پٹی کا سر کے

پر ایک حلقہ بنایا جائے اور اوپر کی جانب چنٹ دے کے وہ سمیٹ دیا جائے۔

لیکن چند روز مین ضرورت محسوس ہوئی کہ گھر مین اور بے تکلفی کی صحبتون مین پگڑی اُتار کے رکھدی جایا کرے۔ لیکن ننگے سر رہنا چونکہ معیوب ہے اسلیے کسی قسم کی ٹوپی سر پہ ضرور رہے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کیلیے دہلی مین تاج کی وضع سے لے کے ایک کمرخی ٹوپی ایجاد ہوئی۔ جس مین اُس گول حلقے کے اوپر جو سر مین پہنا جاتا تھا چار کونے نکلے رہتے۔ اس وضع کی ٹوپی اب بھی بعض بعض امرا و شاہزادگان دہلی کے سرون پر نظر آجایا کرتی ہے۔ یہ ٹوپی صحیح معنون مین چوگوشیہ کہلاتی تھی۔ چند روز کے اندر اس ٹوپی مین بھی ترمیم و تنسیخ کا عمل شروع ہوا۔ اور دہلی ہی مین وہ کمرخی کونے نکال کے ایک گول قبہ نما ٹوپی ایجاد ہو گئی۔ جس مین چار پان ایسی قطع سے کاٹ کے جوڑے جاتے کہ ایک لمبوترا قبہ سر پر نظر آتا۔ یہی ٹوپی پہنے ہوے لوگ لکھنؤ مین آئے۔ اور اُسوقت سے اُس مین دربار لکھنؤ کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ یہان پہلی ترمیم یہ ہوئی کہ پانون کے جوڑون پر لمبی صراحیان بنائی گئین۔ اور اُن صراحیون کے درمیان خوشنما چاند قائم کیے گئے۔ یہ چاند اور صراحیان اس طرح بنائی جاتین کہ باریک تنزیب کے پانون مین نین سکھ کی صراحیان اور چاند کاٹ کے اندر کی طرف ٹانک دیے جاتے جو اوپر نمایان ہو کے ٹوپی مین ایک اچھی نفاست۔ صفائی۔ اور سادگی پیدا کرتے۔ یہ ٹوپی یہان بہت پسند کی گئی۔ عام لوگون نے یکایک پگڑی باندھنا چھوڑ دیا۔ اور ہر مہذب و شایستہ آدمی کے سر پہ یہی ٹوپی نظر آنے لگی۔

عام مقبولیت نے اُسکی قطع اور درست کی۔ لمبوترا پن موقوف ہو کے نہایت مناسب گولائی پیدا کی گئی۔ اور لکڑی اور تانبے کے قالب ایجاد ہوے تاکہ اُن پر کھینچ کے یہ چوگوشیہ ٹوپیان (جو دہلی والی پُرانی کمرخی ٹوپیون کا نام اپنے ساتھ لیتی آئی تھین) خوب قبہ دار اور گول کر لی جائین۔

اتنے مین نصیر الدین حیدر کا زمانہ آیا جبکہ لکھنؤ مین مذہب شیعہ کو خوب فروغ تھا۔ اور مذہب۔ سیاست۔ تمدن۔ اور معاشرت ہر چیز مین اپنے مذاق کے مطابق اصلاحین کر رہا تھا۔ خلفاے اربعہ کی مخالفت اور پنجتن کی محبت نے

لکھنو کی درباری معاشرت نے چار کے عدد کو بُرا اور پانچ کے عدد کو محبوب بنا دیا تھا۔ جس کا اثر ٹوپی پہ یہ پڑا کہ بر بناے بعض مستند روایات خود جہان پناہ کی ہدایت کے مطابق اِس چوگوشیہ ٹوپی مین چار کے عوض پانچ پان کر دیے گئے۔ جس کی وجہ سے اُس مین پانچ صراحیان اور پانچ پان ہوگئے۔ اور نام بھی بجاے چوگوشیہ کے پنجگوشیہ قرار دیا گیا۔ لیکن اصل ٹوپی مین جو ترمیم ہوئی تھی وہ تو اس قدر مستقل ہوگئی۔ چار پانون کی ٹوپیان بالکل فنا ہوگئین۔ اور کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ کبھی اُن مین فقط چار پان ہوا کرتے تھے۔ مگر چوگوشیہ کا نام نہ مٹ سکا۔ آج تک باقی ہے اور زبانون پر وہی ہے اگرچہ بعض لوگ پنجگوشیہ بھی کہتے ہین مگر زیادہ لوگ ایسے ہی ہین جو اس پانچ پانون والی ٹوپی کو آج تک چوگوشیہ کہتے ہین۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے یہ پانچ پانون والی ٹوپی ابتداءً خاص اپنے لیے ایجاد کی تھی۔ اور اُنکی زندگی مین رعایا مین سے کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس ٹوپی کو پہنے۔ مگر اہل شہر کو یہ وضع اس قدر پسند آگئی تھی کہ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی ہر ادنیٰ و اعلیٰ نے اسی کو اختیار کر لیا۔ اور لکھنؤ کے تمام مہذب شایستہ لوگون کے سرون پر یہی گول قبہ نما ٹوپی نظر آتی تھی۔

چند روز بعد جاڑون کی ضرورت سے اسی قسم کی نہایت نفیس کامدار ٹوپیان ایجاد ہو گئین۔ جن مین پانچون پانون مین زربفت یا زری بوٹی کی زمین پر دوسرے رنگ کی ریشمی زمین دے کے قیتون سے چاند اور صراحیان بنائی جاتی تھین۔ اور تمام وضعدار لوگون کے سرون پر جاڑون کے موسم مین اُن کے سوا اور کوئی ٹوپی نہ ہوتی۔ اس کے بعد جب چکن کا رواج ہوا تو موسم گرما کے لیے اُسی کام کی چوگوشیہ ٹوپیان ایسی اعلیٰ درجے کی نفیس و خوشنما بننے لگین جو سال سال بھر کی محنت مین تیار ہوتین اور دس دس بارہ روپئے تک اُن کی قیمت پہونچ گئی۔

اُسی زمانے مین دہلی کے ایک شاہزادے وارد لکھنؤ ہوے۔ جن کی دربار اور سوسائٹی نے بڑی عزت کی۔ وہ دو پلڑی ٹوپی پہنا کرتے تھے جس مین سر کے

لبان کے مناسب دو لمبے پتلے بیضا وی صورت مین کاٹ کے جوڑ دیے جاتے تھے۔ ان کی یہ سادی ٹوپی اکثر لوگون کو پسند آئی۔ اس لیے کہ وہ نسبتہً زیادہ سادی اور تیاری کے اعتبار سے آسان تھی۔ بہت سے لوگون نے یہ ٹوپی اختیار کر لی۔ اور عوام مین اس کا اس قدر رواج ہوا کہ آج یہی دو پلڑی ہندوستان کی قومی ٹوپی ہے۔ وہ شاہزادے یہان کے لوگون مین "دو پلڑی ٹوپی والے شاہزادے" مشہور ہو گئے۔ اور کروڑون خلقت کے سر انکی ایجاد اور تراش کے آج تک زیر بار ہین۔ یہان تک کہ شاہی کے آخری دور مین اسی دو پلڑی سے لے کے یہان ایک بہت چھوٹی تیلی ٹوپی ایجاد ہوئی جس مین آگے پیچھے دونون طرف دو نوکین نکلی ہوتین۔ یہ نکّے دار ٹوپی کہلاتی تھی۔ اور اس قسم کے بھاری کام کی ٹوپیان خاص شاہزادون۔ صاحب دولت رئیسون اعزائے شاہی اور اعلیٰ درجے کے نواب زادون کے ساتھ مخصوص تھین۔

الحاصل غدر کے زمانے تک اہل لکھنؤ مین دو ہی طرح کی ٹوپیون کا رواج تھا۔ اول چو گوشیہ جو مہذب اور ثقہ لوگون کے ساتھ مخصوص تھی۔ اور دوسری دو پلڑی جو شاہزادون سے لے کے ادنیٰ طبقے والون تک تھوڑے تھوڑے تغیر وضع کے ساتھ مروج تھی۔ اور آج عام لباس ہے۔

غالباً غازی الدین حیدر یا نصیر الدین حیدر کے زمانے ہی سے ایک گول ٹوپی کا بھی خاص خاص لوگون مین رواج ہو گیا جو مندیل کہلاتی۔ اس کی قطع ڈفلی کی سی ہوتی۔ اور اکثر کارچوب کے کام کی پسند کی جاتی۔ دولتمندون اور بعض نواب زادون نے اسکو زیادہ موقر و شتین تصور کر کے اختیار کیا۔ اور اُسے یہ خصوصیت دی گئی کہ بادشاہ اور شاہزادون کے سامنے بغیر پگڑی باندھے یا کارچوب کی مندیل پہنے کوئی شخص نہ جا سکتا تھا۔ غرض مندیل کو دربار مین جگہ دے دی گئی۔ اسی مندیل سے ماخوذ وہ گول ٹوپی تھی جس کے اوپر کے کونے ذرا گولائی لیے ہوتے اور جنرلی ٹوپی کہلاتی۔ یہ عموماً سیاہ مخمل کی ہوتی اور اُس پر سنہرے کلابتون کا سچا کام ہوتا۔ اصل مین یہ ٹوپی سرکار انگریزی کی فوج مین گورون کو دی گئی تھی۔ اور بظاہر اُس مین وردی کی شان بھی تھی

مگر انگریزون کی تقلید کا غالباً پہلا نمونہ یہی تھا کہ یہ فوجی اور جنرلی ٹوپی شاہزادون اور خاندانی امیرون کے لباس مین داخل ہوگئی۔

آخری شاہ اودھ واجد علی شاہ نے اپنے دربار کے خطاب یافتہ معززین کے لیے ایک نئی اور عجیب قسم کی درباری ٹوپی ایجاد کی۔ اس مین کاغذ کا مقوا دیکے ایک گول حلقہ سادے اطلس یا کارچوبی کام کا بنایا جاتا جو پیشانی پر زیادہ اونچا ہوتا۔ اُس مین اوپر کی طرف تزئین۔ گرنٹ یا جالی کی ایک بڑی سی جھولی بنا کے جوڑ دیجاتی۔ اور پہننے مین وہ جھولی پیچھے گدّی تک لٹکتی اور سر کے پچھلے حصے پر پڑی رہتی۔ اس درباری ٹوپی کا نام بادشاہ نے "عالم پسند" رکھا تھا۔ اور اکثر عوام اُسے "جھولا" کہتے۔ مگر یہ اس قدر غیر مقبول اور ناپسندیدہ وضع تھی کہ واجد علی شاہ کی زندگی مین بھی اُنکے دربار کے باہر اُن لوگون کے سرون پر بھی نظر نہ آسکتی جن کو وہ عطا ہوئی تھی۔ اور اُنکے بعد تو اس قدر مٹ گئی کہ آج کل کے لوگون نے شاید اُسے کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا۔

غدر کے بعد لکھنؤ مین یکایک ٹوپیون کی دنیا مین ایک انقلاب عظیم شروع ہوگیا۔ چند روز تک تو چوگوشیہ۔ دوپلڑی۔ اور مندیلون یا پگڑیون کے سوا سر کا کوئی لباس نہ تھا۔ اسکے بعد یکایک چوگوشیہ ٹوپی کا رواج چھوٹنا شروع ہوا۔ یہان تک کہ اب اس کے لیے صرف چند پُرانے وضعدار سررہ گئے ہین۔ اِن ٹوپیون سے جو سر خالی ہوگئے اُن مین سے اکثر نے دوپلڑی اختیار کی لیکن بعض جدتین تلاش کرنے لگے۔ چند روز تک میرٹھ کی سوزن کار مندیل نما ٹوپیون کا دور رہا۔ اسکے بعد انگریزون کی نائٹ کیپ یا کشمیر کی اونی لمبی چندوے دار ٹوپیان مروج ہوئین۔ پھر اُن کی وضع سے ماخوذ کرکے گرنٹ یا سٹین کی پتلی پتلی ٹوپیان اختیار کی گئین جو مختصر ہوتے ہوتے دوپلڑی کے قریب پہونچ گئی تھین۔ اب انگریزی عہد کی وضعداریان شروع ہوئین۔ اور سر کے لیے اُن کے لباس سے ملتا جلتا لباس ڈھونڈھا جانے لگا۔ بعض بزرگون نے تو ہر طرف سے آنکھین بند کرکے بلاتامل ہیٹ یا انگریزون کی نائٹ کیپ پہننا شروع کردی۔ لیکن اب ترکی ٹوپی کا دور شروع ہوگیا تھا۔ اس ٹوپی کو سید احمد خان

مرحوم نے اختیار کیا تھا - اور مسلمان جنٹلمین کے لیے کوٹ پتلون مین اُس کا جوڑ لگایا تھا - اس وجہ سے ابتداءً یہ ٹوپی نہایت ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھی گئی - نیچریون کی ٹوپی اُس کا نام پڑ گیا - اخبارون مین اُسپر ہزارون پھبتیان کہی گئین - مگر سر سید کے استقلال نے اُسے مروج کر ہی کے چھوڑا - اُنکی زندگی ہی مین لاکھون آدمی اُسے پہننے لگے - یہان تک کہ لکھنؤ مین بھی آپہونچی - بہتون نے علی رغم مخالفین یہان بھی اسے پہننا شروع کر دیا - لیکن اندر ہی اندر اسکی طرف لوگون کا رجحان اس قدر بڑھا کہ اب سارے ہندوستان مین اکثر تعلیم یافتہ اور مہذب مسلمان اسی ٹوپی کا استعمال کر رہے ہین -

لکھنؤ مین معزز تعلیم یافتہ اور شائستہ شیعہ ہندوستان کے تمام شہرون سے شاید زیادہ ہین - اور اُن مین اس بات کی تحریک بمقابل سنیون کے بڑھی ہوئی ہے کہ ہر بات مین اپنے آپ کو متمائز کرین - اور اپنے شعائر و اوضاع جداگانہ قرار دین - اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جس طرح اہل سنت دولت عثمانیہ کے طرفدار ہین شیعہ دولت قاچاریۂ ایران کے پیرو و جانبدار ہین - لہذا جب لکھنؤ مین ترکی ٹوپی کا رواج بڑھنا شروع ہوا جو ترکون کی ٹوپی ہے تو وضعدار شیعون کو خیال ہوا کہ بجاے ترکی ٹوپی کے دربار عجم کی کلاہ پاپاخ کو اپنے لیے اختیار کرین - یہ تحریک پورا کام کر گئی - اور اب یہ حالت ہے کہ جو مسلمان اپنی پرانی ٹوپیون کو چھوڑ کے نئی ٹوپی اختیار کرتے ہین وہ اگر سُنی ہین تو ترکی ٹوپی پہننے لگتے ہین اور اگر شیعہ ہین تو ایران کی پرشین کیپ کو اختیار کرتے ہین - اگرچہ دونون فریقون مین بعض ایسے روشن خیال بھی موجود ہین جو مسلمانون کی اس اندرونی اعتقادی تفریق کو مٹانا چاہتے ہین - اور باوجود سُنی ہونے کے ایرانی یا باوجود شیعہ ہونے کے ترکی ٹوپی پہنتے ہین - مگر ایسے لوگ کم ہین - مسلمانان شہر کے جدید المذاق لوگون کی عام وضع یہی ہے کہ شیعہ ایرانی اور سُنی ترکی ٹوپی پہنتے ہین -

مسلمانون کی یہ باہمی تفریق دیکھ کے ہندو تعلیم یافتہ لوگون نے علی العموم گول مندیل نما فلٹ کیپ اختیار کر لی - جس کو بعض مسلمان بھی پہنتے ہین - مگر ہندو انگریزی دانون کی وضع مین بکثرت داخل ہو جانے کی وجہ سے انگریزون نے اُس کا نام

یا بوز کیپ" رکھ دیا ہے مگر عوام ہندو ہون یا مسلمان شیعہ ہون یا سُنّی دوپلڑی ہی پہنتے ہین -

غدر کے بعد جو زمانہ گذرا یہ لکھنؤ کی سوسائٹی کے لیے عظیم الشان کون و فساد کا زمانہ تھا - معاشرت اور اخلاق و عادات کے ساتھ لوگون کے لباس اور وضع مین بھی تغیر ہونے لگا - اور تعلیم یافتہ جماعت مین کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنھون نے اپنی معاشرت کے ساتھ اپنی وضع بھی بالکل چھوڑ دی - نہ اُن کی ٹانگون مین پاسجامہ رہا نہ پنڈے پر انگرکھا - نہ پانون مین چڑھوان جوتا رہا نہ سر پر ٹوپی یا پگڑی - بلکہ ایک ہی جست مین وہ ساتون سمندر پھاند کے ہندوستان سے انگلستان مین کود پڑے - اور کوٹ - پتلون - بوٹ - اور ہیٹ اُن کا لباس ہو گیا - لیکن آبادی کے غالب گروہ نے اپنی وضع برقرار رکھنا چاہی - تاہم بغیر اس کے کہ وہ محسوس کرین اُن مین بھی تغیر ہوا - اور انگرکھے کے عوض شروانی اُن کا قومی لباس بن گئی - لیکن سر کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ابھی تک کوئی ایسی ٹوپی نہین منتخب ہو سکی جس کو سب بلا تامل اختیار کر لین -

اس کون و فساد اور رد و بدل کے زمانے مین لکھنؤ مین بیسیون ٹوپیان پیدا ہوئین جو یا خود یہین کی ایجاد تھین یا کسی اور قوم یا مقام سے ماخوذ تھین - اُن مین سے جو چند روز تک ٹھہر سکین اُن پر لکھنؤ کے اصلی مذاق نے بہت کچھ تصرف بھی کیا مگر آخر کو ترک ہو گئین - اہل لکھنؤ کا طبعی رُجحان اس جانب ہے کہ ہر چیز حتی الامکان نازک - نفیس - چھوٹی - چُست - اور سُبک ہو - ہر وضع و لباس مین ان لوگون نے اسی مذاق کا تصرف کیا - اور اکثر ٹوپیون مین بھی اس قسم کا تصرف ہوا - مگر ترکی ٹوپی - ایرانی ٹوپی - اور ہیٹ مین یہ لوگ مطلق تصرف نہ کر سکے - جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ٹوپیان دوسری قومون سے بنی بنائی لیجاتی ہین اور باہر سے آتی ہین - اور اسی تصرف نہ ہو سکنے کی وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ ان ٹوپیون مین سے ایک بھی باوجودیکہ بکثرت مروج ہو گئی ہین لکھنؤ کے مذاق سے جدا ہونے کے باعث یہان کا قومی لباس نہ بن سکے گی - اور ٹوپی کا

مسئلہ تا حال موجدان لباس کی مجلس مین زیر غور و تجویز ہے۔

(۳۴)

اگرچہ ہندوستان خصوصاً لکھنؤ مین سر کا قومی لباس ٹوپی ہے مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہان کی نزاکت پسندی نے پگڑی کو فنا کر دیا۔ دربار مین علی العموم پگڑیون کا رواج تھا۔ وہ دہلی کی باوقعت امیرانہ دستارین تو بیشک یہان نہین باقی رہین۔ اور امرا و اعزاے شاہی کے سرون پر فقط ٹوپیان رہ گئین۔ مگر دربار کے لیے پگڑیان آخر عہد تک مخصوص تھین۔ اور عام ملازمین کا اخلاقی فرض تھا اور اب بھی بڑی وسیع حد تک ہے کہ آقا کے سامنے جائین تو سر پر پگڑی باندھ کے جائین۔

خود حکمرانون کے سرون پر پرانی دستار نواب سعادت علی خان کے زمانے تک رہی۔ نواب برہان الملک۔ نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے سرون پر وہی۔ دہلی کے عہدہ داران سلطنت کی سی سفید دستار ہوا کرتی جس پر بڑے دربارون کے موقعون پر جواہرات کی کلغیان۔ مرصع جیغے اور سرپیچ لگا لیے جاتے۔ مگر فی نفسہ وہ دستارین سادی اور سفید ہوتی تھین۔ مگر نواب سعادت علی خان کے سر پر ہمین ایک نئی قسم کی پگڑی نظر آتی ہے جس کو اہل لکھنؤ اپنی زبان مین شملہ کہتے تھے۔ یہ شملہ یہان اس طرح بنایا جاتا کہ پہلے دفتی یا کاغذ مین کپڑے کا ایک چوڑا اور پتلا گردار حلقہ سر کی ناپ کے برابر بنایا جاتا جو بیچ مین خالی اور کھلا رہتا۔ پھر کسی نفیس ریشمی یا شالی کپڑے کی پتلی پتلی بہت لمبی بتی بنا کے اس کے بیسیون پیچ اس کپڑے کے حلقے پر نیچے اوپر برابر برابر لپیٹ کے ٹانک دیے جاتے۔ اس حلقے مین اوپر کی جانب ایک چوڑی پٹی ویسے ہی ریشمی یا شالی کپڑے کی جوڑ دی جاتی۔ تاکہ وہ اس حلقے کو نیچے اترنے سے روکے رہے۔ مگر اس سے پوری چندیا ڈھنک نہ سکتی تھی۔ اس لیے اس کے نیچے کوئی معمولی دو پلڑی یا چوگوشیہ ٹوپی ضرور رہتی۔ یہ تھا لکھنؤ کا اصلی شملہ جس کو پہلے پہل نواب سعادت علی خان نے پہنا۔ اور غالباً وہ وسط ہند کے ہندو اور مسلمان دربارون کی ان پگڑیون سے ماخوذ تھا جو کسی باریک رنگین کپڑے

کی صدہا گز کی تہیوں کو خاص خاص ترتیبوں سے لپیٹ کے بنائی جاتی تھیں۔ نواب سعادت علی خان نے اس شملے کو خود ہی نہیں پہنا بلکہ معززین دربار اور عمائد سلطنت اور وزرا کو بھی وہی عطا ہوا۔

غازی الدین حیدر کو دولت انگلشیہ نے بادشاہ بنا کے تاج پہنا دیا۔ جو دراصل ہندوستان اور ایشیا کا تاج شاہی نہ تھا بلکہ ایک قسم کا یورپ کا تاج تھا۔ اُسوقت سے فرمان روایان لکھنؤ نے شملے یا دستار کو بالکل چھوڑ دیا۔ اور اُنکے ساتھ تمام شاہزادوں۔ نواب زادوں اور عمائد شہر نے بھی پگڑی کو خیرباد کہدی۔ شاہزادے خاص موقعوں پر تو تاج مگر علی العموم مسالے دار بھاری کام کی گُنٹے دار ٹوپیاں پہنتے اور اُنھیں کی تقلید شہر کے دیگر معززین بھی کرتے۔

لیکن عہدہ داران سلطنت وزرا اور اہل کاروں کو حکم تھا کہ شملہ پہن کے سلاطین و وزرا کے دربار میں آئیں۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے امجد علی شاہ کے عہد تک تمام عہدہ داروں کے سر پر وہی شملہ رہا کرتا تھا جس کی تصویر اپنے ناظرین کو ہم نے لفظوں میں دکھادی ہے۔ واجد علی شاہ نے جب اپنے دربار کی مخصوص ٹوپی عالم پسند (جھولا) ایجاد کی تو معمول ہوگیا کہ جن لوگوں کو زیادہ تقرب حاصل ہوتا اور "دولہ" کے خطاب سے سرفراز ہوتے اُن کو عالم پسند بھی عطا ہوتی۔ اُن کا فرض تھا کہ عالم پسند پہن کے دربار میں آئیں۔ اُن سے کم درجے کے باریابان حضور جو کسی کارخانے یا محکمے کے داروغہ ہوتے اُن کو داروغگی کے خطاب کے ساتھ شملہ عطا ہوتا۔ اور وہ وہی پرانا شملہ پہن کے حاضر ہوتے جو پہلے پہل نواب سعادت علی خان کے سر پر لوگوں کو نظر آیا تھا۔ باقی تمام لوگوں کو حکم تھا کہ کسی قسم کی پگڑی باندھ کے دربار میں آئیں۔ اور پگڑی نہ ہو تو ٹوپی اُتار لیں۔ اہلکاروں کے جس شملے کا ہم نے ذکر کیا ہے اُسی قسم کا شملہ غالباً مرشد آباد کے دربار میں بھی تھا۔ اور اُسی کا اثر تھا کہ آج سے پچاس برس پہلے ہم کلکتہ ہائی کورٹ کے بنگالی وکیلوں کو اسی طرح کا شملہ پہنتے دیکھتے تھے لیکن وہ شملہ دربار اودھ کے شملوں سے

مسئلہ تا حال موجدان لباس کی مجلس مین زیر غور و تجویز ہے۔

(۳۴)

اگرچہ ہندوستان خصوصاً لکھنؤ مین سر کا قومی لباس ٹوپی ہے مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہان کی نزاکت پسندی نے پگڑی کو فنا کر دیا۔ دربار مین علی العموم پگڑیون کا رواج تھا۔ وہ دہلی کی باوقعت امیرانہ دستارین تو بیشک یہان نہین باقی رہین۔ اور امرا و اعزاے شاہی کے سرون پر فقط ٹوپیان رہ گیئن۔ مگر دربار کے لیے پگڑیان آخر عہد تک مخصوص تھین۔ اور عام ملازمین کا اخلاقی فرض تھا اور اب بھی بڑی وسیع حد تک ہے کہ آقا کے سامنے جائین تو سر پر پگڑی باندھ کے جائین۔

خود حکمرانون کے سرون پر پُرانی دستار نواب سعادت علی خان کے زمانے تک رہی۔ نواب برہان الملک۔ نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے سرون پر وہی۔ دہلی کے عہدہ داران سلطنت کی سی سفید دستار ہوا کرتی جس پر بڑے دربارون کے موقعون پر جواہرات کی کلغیان۔ مرصع جیغے اور سرپیچ لگا لیے جاتے۔ مگر فی نفسہ وہ دستارین سادی اور سفید ہوتی تھین۔ مگر نواب سعادت علی خان کے سر پر ہمین ایک نئی قسم کی پگڑی نظر آتی ہے جس کو اہل لکھنؤ اپنی زبان مین شملہ کہتے تھے۔ یہ شملہ یہان اس طرح بنایا جاتا کہ بھراؤ میت کپڑے کا ایک چوڑا اور پتلا گردار حلقہ سر کی ناپ کے برابر بنایا جاتا جو بیچ مین خالی اور کھلا رہتا۔ پھر کسی نفیس ریشمی یا شالی کپڑے کی پتلی پتلی بہت لمبی بتی بنا کے اُس کے بیسیون پیچ اُس کپڑے کے حلقے پر نیچے اور اوپر برابر برابر لپیٹ کے ٹانک دیے جاتے۔ اس حلقے مین اوپر کی جانب ایک چوڑی پٹی ویسے ہی ریشمی یا شالی کپڑے کی جوڑ دی جاتی۔ تاکہ وہ اس حلقے کو نیچے اُترنے سے روکے رہے۔ مگر اُس سے پوری چندیا ڈھنک نہ سکتی تھی۔ اس لیے اُس کے نیچے کوئی معمولی دو پلڑی یا چوگوشیہ ٹوپی ضرور رہتی۔ یہ تھا لکھنؤ کا اصلی شملہ جس کو پہلے پہل نواب سعادت علی خان نے پہنا۔ اور غالباً وہ وسط ہند کے ہندو اور مسلمان دربارون کی اُن پگڑیون سے ماخوذ تھا جو کسی باریک رنگین کپڑے

کی صدہا گز کی تہوں کو خاص خاص ترتیبوں سے لپیٹ کے بنائی جاتی تھیں۔ نواب سعادت علی خان نے اس شملے کو خود ہی نہیں پہنا بلکہ معززین دربار اور عمائد سلطنت اور وزرا کو بھی وہی عطا ہوا۔

غازی الدین حیدر کو دولت انگلشیہ نے بادشاہ بناکے تاج پہنا دیا۔ جو دراصل ہندوستان اور ایشیا کا تاج شاہی نہ تھا بلکہ ایک قسم کا یورپ کا تاج تھا۔ اُسوقت سے فرمان روایان لکھنؤ نے شملے یا دستار کو بالکل چھوڑ دیا، اور اُنکے ساتھ تمام شاہزادوں۔ نواب زادوں اور عمائد شہر نے بھی پگڑی کو خیرباد کہدی۔ شاہزادے خاص موقعوں پہ تو تاج مگر علی العموم سادے دار بھاری کام کی گُنگے دار ٹوپیاں پہنتے اور اُنھیں کی تقلید شہر کے دیگر معززین بھی کرتے۔

لیکن عہدہ داران سلطنت وزرا اور اہل کاروں کو حکم تھا کہ شملہ پہن کے سلاطین و وزرا کے دربار میں آئیں۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے امجد علی شاہ کے عہد تک تمام عہدہ داروں کے سر پہ وہی شملہ رہا کرتا تھا جس کی تصویر اپنے ناظرین کو ہم نے لفظوں میں دکھا دی ہے۔ واجد علی شاہ نے جب اپنے دربار کی مخصوص ٹوپی عالم پسند (جھولا) ایجاد کی تو معمول ہو گیا کہ جن لوگوں کو زیادہ تقرب حاصل ہوتا اور "دولہ" کے خطاب سے سرفراز ہوتے اُن کو عالم پسند بھی عطا ہوتی۔ اُن کا فرض تھا کہ عالم پسند پہن کے دربار میں آئیں۔ اُن سے کم درجے کے باریابان حضور جو کسی کارخانے یا محکمے کے داروغہ ہوتے اُن کو داروغگی کے خطاب کے ساتھ شملہ عطا ہوتا۔ اور وہ وہی پہ اپنا شملہ پہن کے حاضر ہوتے جو پہلے پہل نواب سعادت علی خان کے سر پر لوگوں کو نظر آیا تھا۔ باقی تمام لوگوں کو حکم تھا کہ کسی قسم کی پگڑی باندھ کے دربار میں آئیں۔ اور پگڑی نہ ہو تو ٹوپی اُتار لیں۔ اہلکاروں کے جس شملے کا ہم نے ذکر کیا ہے اُسی قسم کا شملہ غالباً مرشد آباد کے دربار میں بھی تھا۔ اور اُسی کا اثر تھا کہ آج سے پچاس برس پہلے ہم کلکتہ ہائی کورٹ کے بنگالی وکیلوں کو اسی طرح کا شملہ پہنتے دیکھتے تھے لیکن وہ شملہ دربار اودھ کے شملوں سے

سبک اور ہماری نظر مین ذرا اوچھا ہوتا۔
اب پگڑی کو سوا عہدہ دارون کے تمام خوش باش لوگون اور معززین شہر نے مطلقاً ترک کر دیا تھا لیکن اسپر بھی دربار مین اور نیز عوام مین پگڑی کی جو عزت دلون مین قائم تھی اور ہے اُس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ شادیون کے موقع پر ہر ادنیٰ و اعلیٰ طبقے مین دولھا کے سر پر پگڑی ہی ہوا کرتی ہے۔ اور لکھنؤ کے شرفا مین تو عموماً بھاری کمخواب کے شملے کا رواج ہے۔
یہان کے دربار نے مذکورہ پگڑیون کے علاوہ ملازمین کے مختلف طبقون کے لیے جدا جدا وضعون کی پگڑیان بھی مخصوص کر دی تھین۔ اہل قلم یعنی محررون کے لیے اسی مذکورہ شملے کی سی سفید ململ کی پگڑی مخصوص تھی۔ دربار کے ہرکارے اور چوبدار بھی اسی قطع کی پگڑیان پہنتے۔ (اسلیے کہ وہ پگڑیان باندھی نہین بلکہ ٹوپی کی طرح پہنی جاتی تھین) فرق یہ تھا کہ ہرکارون کی پگڑیان سرخ ہوتین اور چوبدارون کی سفید براق۔ جن پر آگے داہنی جانب مقیش کا ایک پھول بھی ٹنکا ہوتا۔ ہرکارون کی پگڑیون سے ملتی جلتی پگڑیان کہارون کی ہوتین۔ اُن کی پگڑیون مین داہنی جانب کی کور پر چاندی کی مچھلیان ٹنکی ہوتین۔ اور جسم پر سرخ بانات کے ڈھیلے ڈھالے چغے ہوتے۔
ان کے علاوہ تمام فوجون اور معزز لوگون کے خدمتگارون مین بھی پگڑیون کا رواج تھا جو اپنی وضع پر جدا اور خود رو سی ہوتین۔
سب سے زیادہ معزز و محترم عمامے علما کے تھے۔ اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر پگڑیون کے سلسلے مین ہم علمائے کرام و مقتدایان اُمت کے عمامون کے ساتھ پورے زمی علما سے بحث کرین۔ لکھنؤ مین مسلمانون کے دو فرقون کے علما ہین۔ اول علمائے اہل سنت۔ دوسرے مجتہدین و افاضل شیعہ۔ ان دونون کی وضع جداگانہ ہے۔ سنیون کو تقدس اور فقاہت کی شان اہل عرب کے لباس مین نظر آتی ہے اور شیعون کو علمائے فارس وعجم کی وضع مین۔ اسی مذاق و رجحان کے مطابق دونون گروہون کے علما کا لباس بھی ہے۔
آنحضرت صلعم کے عہد مبارک مین عربون کا عمامہ صرف اس قدر تھا کہ

کوئی مختصر سا کپڑا سر پر لپیٹ لیا جائے جس کو نہ کسی قطعداری سے علاقہ تھا اور نہ وضعداری سے۔ مگر جب خلفاے عباسیہ کے عہد مین عراق مستقر خلافت قرار پایا تو عجمی و ساسانی لباس عمائد و اکابر عرب کی وضع مین داخل ہو گیا۔ بہرحال جو بڑے بڑے شاندار عمامے اور طیلسان وغیرہ عہد خلافت کے علماے عرب نے اختیار کیے اُن کو عربی لباس مشکل سے کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے علماے اہل سنت نے اگلے دنون وہ عربی لباس چھوڑ کے دہلی کی درباری وضع اختیار کر لی تھی اور اس وضعداری کے ساتھ اُس لباس کو نباہا کہ آج ہندوستان کی سارے ابناے وطن نے اُسے چھوڑ دیا مگر وہ ابھی تک اُسپر قائم ہین۔

چنانچہ آج تک علماے فرنگی محل کی اصلی وضع یہ ہے کہ ایک سیدھا گول عمامہ باندھتے ہین جس کی بندش مین بالکل اس کی کوشش نہین کی جاتی کہ پیشانی پر محراب کی قطع پیدا ہو۔ جسم مین اگلے زمانے کا جامہ ہوتا ہے جو اب جگہ بالکل خواب و خیال ہو گیا۔ پاؤن مین چوڑے اور عرض کے پائنچون کا ٹخنون سے اونچا پائجامہ ہوتا ہے اور گلے مین ایک پتلا سا دوپٹہ پڑا ہوتا ہے۔ اس وضع مین ہمارے دو ایک بزرگان فرنگی محل آج بھی جمعے کی نماز پڑھانے کو آتے ہین۔ مگر گھرون مین وہ معمولی سادی دوپلڑی یا چوگوشیہ ٹوپی۔ لمبا کُرتا جس مین گریبان کا چاک بیچ مین ہو یا انگرکھا اور عرض کے پائنچون کا پائجامہ پہنتے ہین۔ فی الحال حدیث العمر علماے فرنگی محل نے اب اس وضع کو چھوڑ کے علماے حرمین اور مقتدایان شام و مصر کی وضع اختیار کرنا شروع کر دی ہے۔ جسے آخر مین مولانا شبلی نعمانی نے بھی قومی اور سرکاری دربارون کے لیے منتخب کیا تھا۔ ان بزرگون کا جوتا بھی اگلے دنون گھیتلا تھا مگر اب یا تو زیرپائیان ہین اور یا لکھنؤ یا دہلی کا چڑھوان جوتا۔

علماے شیعہ کی وضع اس سے بالکل جدا ہے۔ وہ اول تو سر پر دوپلڑی ٹوپی پہنتے ہین مگر عام لوگون کے خلاف اُس کی سیون بجاے آگے سے پیچھے کی طرف رہنے کے آڑی یعنی ایک کان سے دوسرے کان تک رہتی ہے۔ اسپر بلند اونچے قُبّے کا عمامہ اہل عجم کے عمامے کی بندش سے ملتا ہوتا ہے۔ بدن مین لمبا

کرتا - مگر اسکے گریبان کا چاک بجاے اسکے کہ سینے کے بیچ مین ہو بائین شانے کے پاس ہوتا ہے - اگلے دنون علماے شیعہ کے کرتون مین گریبان کی جگہ دونون شانون پر ہوا کرتی تھی - مگر یہ وضع اب متروک ہو گئی ہے - جو علما ایران و کربلا ہو آے ہین وہ کرتے کے اوپر اگلی طیلسان پہنتے ہین جو یہان قبا کہلاتی ہے - پاؤن مین چوڑے پائنچون کا پائجامہ ہوتا ہے - اور علی العموم کفشین پہنتے ہین جنکا ذکر جوتون کے بیان مین آئے گا -

(۳۵)

سر اور درمیانی حصۂ جسم کے لباس کا حال تفصیل و وضاحت سے ہم بیان کر چکے اب اسفل جسم کے لباس کی طرف توجہ کرتے ہین - پھر اسکے بعد دیگر زوائد لباس اور مختلف گروہون کی خاص خاص وضعون کا اور اُنکے بعد عورتون کے لباس کا تذکرہ کرین گے -

نشیبی حصۂ جسم کے لیے عربون مین سوا تہمت کے کچھ نہ تھا - عربی تہمت اور ہندوون کی دھوتی دونون بے سی ہوئی پتلی چادرین ہوتی ہین - فرق یہ ہے کہ تہمت صرف کمر مین لپیٹ کے اٹکا لیا جاتا ہے - دھوتی ہندوستان کی مختلف قومون مین خاص خاص بندشون سے باندھی جاتی ہے - اُس کا ایک سرا پیچھے سے پھیر دے کے پیٹھ کے نیچے گھرس لیا جاتا ہے اور دوسرے کو بعض لوگ کمر مین لپیٹ لیتے ہین - بعض چنٹ دے کے اور اوپر سے ناف کے پاس گھرس کے آگے لٹکا لیتے ہین - عربون کے تہمت نے بعد کے زمانے مین یہ ترقی کی کہ اُس کے دونون سرے سی کے ایک حلقہ بنا لیا جاتا ہے - اور اُس مین دونون پاؤن ڈال کے اور کمر کے پاس اُسے سمیٹ کے بندش کر دیجاتی ہے -

ظہور اسلام کے وقت اور اُس سے مدتون پیشتر عربون کا قومی لباس زیرین یہی تھا - امیر و غریب بادشاہ و وزیر سب تہمت باندھتے - فرق اس قدر تھا کہ امرا و متکبرین عرب اپنی نخوت اور اپنے غرور کا اظہار اس طرح کرتے کہ یہ تہمت بہت نیچا اور زمین سے ملا ہوا ہوتا - جس مین سارے پاؤن چھپ جاتے - اور اُسکے دونون سرے زمین پر لوٹتے اور رگڑتے ہوے چلتے - چونکہ

اس وضع مین کبر و نخوت کی بو آتی اور جو شخص ایسا نیچا تہمت باندھکے نکلتا دوسرون کو اپنے سامنے ذلیل و حقیر خیال کرتا - اس وجہ سے اسلام نے اس وضع کی سخت ممانعت کی - حکم دے دیا کہ اِزار (تہمت) ٹخنون سے نیچی نہ ہے علماے اسی حکم کی بنا پر فی الحال یہ فتوے دے رکھا ہے کہ پائجامہ یا ٹانگون کا کوئی لباس ٹخنون سے نیچا نہ ہو - حالانکہ پائجامہ نہ اُن دنون تھا اور نہ اس حکم مین شامل ہو سکتا ہے - اس لیے کہ نیچی اور زمین پر لوٹتی ہوئی ازار باندھنے سے جو کبر و نخوت کا خیال امراے عرب مین پیدا ہوتا تھا ہندوستان کے نیچے پائجامہ پہننے والون مین ہرگز نہین ہوتا -

حضرت رسول خدا صلعم کے زمانے ہی مین پائجامہ دیگر ممالک و اقوام سے عرب مین پہونچ گیا تھا - اور بعد کے زمانے مین بغداد کے دربار کا اور اُن عربون کا جو عرب سے نکل کے دیگر ممالک مین متوطن ہو گئے تھے قومی لباس بن گیا - ہندوستان مین مسلمانون سے پہلے دھوتی کے سوا پائجامہ نہ تھا مسلمان فاتح اسے اپنے ساتھ ہندوستان مین لائے - جن مین ملے ہوے چند ایسے عابد و زاہد اور مقتدایان دین تھے جو سنت نبوی کی پیروی مین تہمت ہی باندھے ہوے اس سرزمین پر آ گئے - تہمت چونکہ سنت ہونے کی وجہ سے ایک خالص دینی لباس تھا - اس لیے بے نفس اور دیندار مسلمانون یا طالب علمون ہی کے ساتھ مخصوص رہا مگر پائجامہ یہان کی سوسائٹی مین اس قدر عام ہو گیا کہ مسلمان درکنار ہندوون اور یہان کی دوسری قومون مین اُس کا رواج ہو گیا -

لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ مسلمانون کا پہلا اور اصلی پائجامہ کس وضع کا تھا؟ غالبًا وہ تنگ مُہری کا اُٹنگا پائجامہ جو شرعی پائجامہ کہلاتا ہے اور اتقیاء اہل سنت مین مروج ہے مسلمانون کا پہلا پائجامہ ہے - یہی بغداد مین مروج تھا - اسی کا رواج ایران و ترکستان مین ہوا - اور اسی کو پہنے ہوے مسلمان ہندوستان مین آئے -

ہندوستان کے آخر عہد مین اُس کی قطع مین اتنا تغیر ہوا کہ پائنچے یا مُہری پنڈلی سے لپٹی رہتی - مگر اوپر کا گھیر قریب قریب اُتنا ہی ہوتا جتنا کہ پرانے

شرعی پائجامے کا تھا۔ چند روز بعد مُہری کسی قدر لمبی اور نیچی ہو گئی مگر ٹخنون سے آگے
نہین بڑھی۔ دہلی کے آخر عہد تک وہان اور سارے ہندوستان [illegible] مسلمانون کا
یہی پائجامہ تھا۔ اگرچہ ادنیٰ طبقے کے مسلمان ہندو عوام کی آمیزش سے دھوتیان
باندھتے تھے۔ اور معزز درجے کے ہندو اپنے گھرون مین چاہے دھوتیان باندھے
رہین مگر مہذب صحبتون مین آتے تو پائجامہ پہن کے آتے۔

انھین دنون کابل و قندھار مین دو متضاد قسمون کے پائجامے مروج تھے
کابل والون کا پائجامہ نیچے مُہری کے پاس تنگ اور اُوپر گھیر کے پاس اتنا ڈھیلا
ہوتا کہ نیچے کا جسم ایک بہت بڑے جھولدار غبارے مین غائب ہو جاتا۔ اور ایک
ایک پائجامے مین ایک ایک اور دو دو تھان خرچ ہو جاتے۔ یہ آج بھی
افغانیون کی ٹانگون مین نظر آ سکتا ہے۔ بخلاف اسکے قندھار والے ایسا پائجامہ
پہنتے جس کا اوپر کا گھیر تو زیادہ نہ ہوتا مگر دونون پائینچے کلیان جوڑ جوڑ کے اتنے
بڑے اور اتنے گھیر کے بنا دیے جاتے کہ جب تک انسان اُس کو گھُرس نہ لے یا
ہاتھ سے سنبھالے نہ رہے چلنا دشوار تھا۔

دربار دہلی مین بکثرت قندھاری آ کے فوج مین نوکر ہوے۔ وہ لوگ چونکہ
بڑے بہادر دیکھے جاتے اس لیے یہان کے عام سپہگرون مین اُنکے وضع ولباس
اور عادات و خصائل رواج پانے لگے۔ اور یہ اُنھین کی برکت اور اُنھین کی
[illegible]ے کا اثر تھا کہ دہلی مین بانکے بڑے بڑے کلیون دار پائنچون کے پائجامے
پہنتے۔ [illegible] آخر عہد مین بانکون کی وضعداری و شجاعت اس قدر پسندیدہ ہو گئی
کہ صدہا شریف زادون نے بانکون مین داخل ہو کے اُن کی وضع اختیار کر لی۔ اور
شرفا جن مین اکثر اپنی اصلی وضع پر تھے۔ اور بہت سے بانکے بنے ہوے تھے لکھنؤ
مین آئے۔

لکھنؤ مین آ کے یک بیک ایک ڈھیلا عرض کے پائنچون کا پائجامہ پیدا ہو گیا۔
شجاع الدولہ۔ آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے زمانے تک تو اُس کا پتہ
نہین چلتا۔ مگر معلوم ہوتا ہے غازی الدین حیدر یا اُنکے فرزند نصیر الدین حیدر کے
زمانون مین جب کہ یہان لباس و معاشرت مین تغیر ہو رہا تھا اُسی بانکون کے

کلیون دار پائجامے سے مختصر کرکے یہ پائجامہ بنا لیا گیا - جو نہ اتنا ڈھیلا تھا کہ ایک [illegible] پائجامے مین ایک ایک تھان صرف ہو جائے اور نہ تنگ اور چست مہری والے پُرانے پائجامے کی طرح اتنا تنگ کہ پائنچے اوپر چڑھانا غیر ممکن ہو۔ یہ نیا پائجامہ ہلکا پھُلکا اور ہندوستان کی گرمیون مین نہایت آرام دہ تھا - چند ہی روز مین امرا و مہذب لوگون مین اس قدر مقبول ہو گیا کہ سوا اُن لوگون کے جو بانکپن کا دعوے رکھتے تھے تمام اہل فضل وعلم زہاد و اتقیا اور سارے شرفا و امرا کی وضع مین یہی پائجامہ داخل تھا۔

اب لکھنؤ مین صرف دو پائجامے تھے - ایک تو وہی بانکون کا کلیون دار پائجامہ - دوسرا عرض کے پائنچون کا پائجامہ جو سارے شہر کے مہذب لوگون کی وضع مین داخل ہو گیا تھا - اور اس شان کے ساتھ کہ اکثر مہذب بتعلیم یافتہ لوگ بھی کلیدین اور مشروع کا سلواتے - اور اُسکے پائنچون مین چوڑی گوٹ لگائی جاتی - بانکون والے اول الذکر پائجامے کو خود نصیر الدین حیدر نے اپنی وضع مین داخل کر لیا - اُنکو انگریزی لباس کا بھی شوق تھا - اس لیے یا کوٹ پتلون پہنتے یا کلیون دار پائجامہ - جس کو فی الحال پنجاب والے غرارے دار پائجامہ کہتے ہین - نصیر الدین حیدر کو یہ پائجامہ اس قدر عزیز تھا کہ انگریزون کی گون کے مشابہ دیکھ کے اُنھون نے اُسے اپنے محل کی بیگمون کو بھی پہنانا شروع کیا - اور محل کی وضع مین داخل ہو جانے کا یہ اثر ہوا کہ شہر کی [illegible] عورتین اسی کو پہننے لگین جس کا ذکر عورتون کے لباس کے بیان مین آئے گا -

شاہی مین اودھ کی فوج فتح پنجاب کے موقع پر انگریزون کے ساتھ جا کے سکھون سے لڑی تھی - سکھ لوگ ایک نئی قسم کا اونچی یعنے ترچھی کاٹ کا تنگ اور چست پائجامہ پہنتے تھے جو گھٹنا کہلاتا ہے - بہت سے پنجاب جانے والون نے اس وضع کو بہت پسند کیا - اور گھرون مین واپس آئے تو وہی آڑی کاٹ کے گھٹنے پہنے تھے - یہان کے اکثر لوگون نے یہ پائجامہ بہت پسند کیا - اور یکایک ایسا رواج ہوا کہ لکھنؤ کے تمام بانکے ترچھے شوقین اور امیرزادے گھٹنا پہننے لگے جو خوب چست اور خوب کھنچا ہوتا - اور ستے

پر اُس کی شکنون کی بہت سی چوڑیان رکھی جاتین -

لکھنؤ مین یہی تین پائجامے تھے کہ انگریزی ہو گئی - بڑے پائنچون کا کلیون دار پائجامہ تو بانکون اور اسلحہ کے ساتھ سارے مردون مین سے فنا ہوگیا۔ نصیرالدین حیدر کی عنایت سے فقط عورتون مین باقی ہے - مردون مین فقط دو پائجامے تھے - یعنی عرض کا پائجامہ اور گھٹنا - باستثنی اہل اتقا مین سے بعض بعض پرانا شرعی پائجامہ پہن لیا کرتے - انگریزی دور نے پہلا اثر یہ کیا کہ پائجامون کی وضع قطع تو وہی رہی مگر اطلس گلبدن - اور مشروع کے یا رنگین سوتی پائجامے مردون سے بالکل چھوٹ گئے - چند روز بعد علی گڑھ کالج کے سوشل اسکول سے انگریزی پتلون کی نقل کے پائجامے ایجاد ہوے جو نہ اتنے تنگ ہوتے ہین کہ پنڈلی سے لپٹے رہین اور نہ اتنے ڈھیلے کہ پائنچہ اوپر تک چڑھا لیا جاسکے۔ انگریزی تعلیم پانے والون اور سارے ہندوستان کے اکثر شریعت زدون مین اب اسی پائجامے کا رواج بڑھتا جاتا ہے - اگرچہ اکثر تعلیم یافتہ جو تہذیب جدید کے ملاء اعلی تک پہونچ گئے مین اپنا سارا لباس چھوڑ کے کوٹ پتلون پہننے لگے ہین - لیکن لکھنؤ مین آج بھی بعض گنتی کے ایسے ثقہ لوگ نظر آ سکتے ہین جو پرانی قطع کے عرض کے پائجامے پہنتے ہین اور اپنی وضع نہین چھوڑتے -

(۳۶)

انگرکھے یا چپکن وغیرہ کے اوپر لگے دونون دوشالے کا رواج زیادہ نظر آتا ہے - اور یہی شاہی درباردون سے خلعت مین عطا ہوا کرتا تھا - اسکے ساتھ شالی رومال اوڑھنے کا بھی ایک معمولی حد تک رواج تھا - یہی دونون چیزین دہلی سے لکھنؤ مین آئین - مگر لکھنؤ مین زیادہ رواج رومال اوڑھنے کا تھا - جاڑون مین اکثر شالی رومال اور سردی کے اوقات مین دوشالہ اوڑھا جاتا - لکھنؤ مین دربار قائم ہونے کے بعد جب گرمیون کے لیے لباس مین نفاست و لطافت اور سُبکی کو ترقی ہونے لگی تو بابر لیٹ اور چکن کے رومال ایجاد ہوے - اور تمام سفید پوش شریفون کا یہ لباس ہوگیا کہ سر پر قالب چڑھی چکن کی چوگوشیہ ٹوپی - بدن مین انگرکھا - پاؤن مین عرض کے پائنچون کا پائجامہ اور کندھے پر ہلکا چکن یا

جالی کا رومال۔ شرفائے لکھنؤ کی یہ پہلی عام وضع تھی جس کو میر انیس مرحوم کا خاندان اُنھیں اگلے تکلفات کے ساتھ آج تک نباہ رہا ہے۔

لباس میں سب سے آخری اور بڑی اہم چیز جوتا ہے۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں جوتے کا مطلق رواج نہ تھا۔ اس لیے کہ چمڑے کے استعمال سے ہندو لوگ مذہبًا احتراز کرتے تھے۔ بلکہ جوتے کے عوض یہاں لکڑی کے کھڑاؤں پہنی جاتیں جو آج کل کے بعض فقیروں اور مرتاض رشیوں کے علاوہ قدیم راجاؤں میں بھی مروج تھیں۔ مسلمان اپنے ساتھ یہاں محیط لباس کے ساتھ چمڑے کے جوتے بھی لائے۔

مسلمانوں کا پہلا جوتا عربوں میں فقط ایک چمڑے کا تلا تھا جو پٹّے یا بندھنوں کے ذریعے سے پاؤں میں اٹکا لیا جاتا۔ عجمیوں اور رومیوں کا چمڑے کا موزہ جوتے سے پہلے عرب میں پہونچ گیا تھا۔ پھر جب عربی دربار شام و عراق یعنے روم کے آغوش میں قائم ہوے تو چمڑے کے جوتوں کا رواج شروع ہوا۔ مگر وہ پہلے جوتے بظاہر سیدھی سادی زیر پائیاں تھے۔ انھیں کو پہنے ہوے مسلمان ہندوستان میں آئے۔

دہلی کے امرا اور بادشاہ اگلے دنوں اپنی تصویروں میں اُونچی ایڑی کی کفش نما جوتیاں پہنے نظر آتے ہیں۔ دہلی کے آخر عہد میں چڑھواں جوتا ایجاد ہوا۔ جس کی ابتدائی وضع یہ تھی کہ آدھا پنجہ اور گٹّے سے نیچے تک پاؤں اُس میں چھپ جاتا۔ اُسکے سرے پر چوڑی نوک پنجے پر جھکا کے بٹھا دی جاتی۔ یہ پہلا دلّی وال جوتا تھا۔ جس کا پچاس سال پیشتر زیادہ رواج تھا۔ اس کے بعد سلیم شاہی جوتا نکلا۔ جو غالبًا جہانگیر کے زمانے میں ایجاد ہوا۔ اسکی نوک آگے نکلی اور اُٹھی ہوئی ہوتی۔ اور نوک کا تھوڑا سا باریک سرا اوپر موڑ دیا جاتا۔ ایجاد کے بعد اُس پر کلابتوں کا مضبوط کام بننے لگا۔ جو بالکل سچا اور قیمتی ہوتا۔ اگرچہ یہ کام دلّی وال اور سلیم شاہی دونوں وضع کے جوتوں پر بنایا جاتا مگر سلیم شاہی جوتے کا بہت زیادہ رواج ہوا۔ اور اُس نے چند روز میں پُرانے دلّی وال کو مٹا دیا۔ اور اُس کی سب سے

بڑی خوبی یہ ہے کہ اب جبکہ انگریزی وضع و قطع نے ہمارے سارے لباس اور ہماری تمام چیزون کو مٹا دیا وہ آج تک باقی اور مقبول عام ہے۔ اور اکثر ہندوستانی وضع پسند کرنے والے وضعدار بھاری سے بھاری لباس پر اُسی کو پہنتے ہین اور فی الحال لکھنؤ مین بھی بہت سے لوگ اُس کو پہنتے ہین۔

مگر لکھنؤ مین بعد شاہی ایک نئی قطع کا خورد نوک کا جوتا ایجاد ہوا جس کو یہان کے وضعدارون نے ابتداءً بہت پسند کیا تھا۔ اُس مین نوک بالکل نہ ہوتی۔ بلکہ جو نوک دِتی وال اور سلیم شاہی مین اوپر نکالی جاتی۔ اُس مین سینے کے بعد اُلٹ کے اندر کر دی جاتی۔ نوک کے پاس فقط ایک ذرا سا اُبھار رہتا۔ یہ جوتے لال نری کے نہایت ہی سُبک اور صاف بنائے جاتے اور نفاست و سبکباری کے اگلے مذاق نے اس کو یہان تک سبک کیا کہ بعض موچیون کے ہاتھ کا جوڑا چار پانچ پیسون بھر سے زیادہ نہ ہوتا۔ اگرچہ عوام اور دیہاتیون کے لیے اُسی وضع کے چمڑودھے جوتے اتنے بھاری ہوتے کہ سیر سیر ڈیڑھ ڈیڑھ سیر سے کم نہ ہوتے اور پھر کڑوا تیل پلا پلا کے اور بھاری کر لیے جاتے۔

تھوڑے دنون بعد لکھنؤ مین اس خورد نوکے جوتے کی آرائش و زیبائی کی طرف توجہ ہوئی پہلے جاڑے گرمیون کے خشک موسم کے لیے کاشانی مخمل کے اور برسات کے لیے کیمخت کے بننا شروع ہوے۔ اور اس مین کوئی شک نہین کہ بانات کا جوتا نہایت ہی نفیس۔ سادہ۔ سبک۔ اور خوشنما ہوتا۔ کیمخت سبز زنگاری رنگ کا ہوتا جو گھوڑے یا گدھے کی کھال سے بنتا اور اُس مین کھٹمل کے غارون کی طرح دانے اُبھار کے پیدا کیے جاتے۔ اور تعریف یہ تھی کہ برسات مین چاہے کتنا ہی بھیگے اُسکے رنگ و روپ مین فرق نہ آتا۔ خود کیمخت کے بنانے کا فن اگرچہ باہر سے آیا تھا مگر لکھنؤ مین اُس کے بہت سے کارخانے جاری ہوگئے۔ اور سب جگہ سے اچھا بننے لگا۔

چند روز بعد جوتون کی آرائش مین اور ترقی ہوئی۔ اور سلمے ستارے کے کارچوبی کام کے جوتے بننے شروع ہوے۔ جن مین مقیش کے پھُندنے لگا کے عجب چمک دمک اور آب و تاب پیدا کر دی جاتی۔ اس کے بعد جب جھوٹا سلمہ اور کلابتون آیا تو

جھوٹے کام کے چڑھوین جوتے بننے لگے جو بہت سستے داموں مین عجب بہار دکھا دیا کرتے۔

لیکن چڑھوین کے ساتھ ہی ساتھ یہان ایک گھیتلا جوتا مروج تھا۔ جو در اصل پُرانے کفش نا جوتون سے ماخوذ تھا۔ اور عالی مرتبہ امیرون اور اکثر اعلیٰ طبقے کے شریفون مین علی العموم پہنا جاتا تھا۔ در اصل یہی ہندوستان کا پُرانا قومی جوتا تھا۔ اور اُسی کی یادگار حیدرآباد کی چپّل اور دیگر مقامات کے دیسی جوتے ہین۔ اور یہی اگلے اہل دربار اور وطنی بزرگان سلف کے پانؤن مین نظر آتا ہے۔ گھیتلے مین اتنی ترقی ہوئی کہ اُس کی نوک بجاے مختصر رہنے کے ہاتھی کی سونڈ کی طرح بہت بڑھائے اور پھیلا کے پنجے کے اوپر ایک بڑے حلقے کی صورت مین لپیٹ دی گئی۔ یہ جوتا اودھ کے اگلے بادشاہون اور وزرا و امرا سب کے پانؤن کی زینت ہوا کرتا۔ چڑھوین جوتے نے ایجاد ہونے کے بعد اُس کی جگہ لینا شروع کی۔ یہان تک کہ غدر ہوتے ہوتے گھیتلا فقط عورتون کے پانؤن مین رہ گیا۔ جن کے نازک پانؤن کا وہ عام لباس تھا۔ اور مردون کی پوشاک سے وہ بالکل خارج ہو گیا۔ لیکن کفشین اپنی اصلی صورت پر آج تک باقی ہین جو شیعیان علی کے اتقیا و صلحا خصوصاً مجتہدین کے ساتھ مخصوص ہین۔

گھیتلے جوتون کفشون اور اُن پر کار چوبی کام بنایا جاتا ہے اُس نے مسلمانان لکھنؤ مین دو خاص پیشے پیدا کر دیے جن پر بہت سے لوگون کی معاش کا دارومدار ہو گیا۔ پہلے تو مسلمان موچی جن کی یہان ایک مستقل قوم اور برادری ہے۔ یہ لوگ سوا گھیتلے جوتے بنانے کے اور کسی قسم کا جوتا بنانا اپنی شرافت کے خلاف جانتے ہین۔ لکھنؤ مین ان لوگون کے بہت سے گھر تھے اور سب سچے مسلمان۔ سفید پوش۔ اور بمقابل دوسرے ادنیٰ طبقے والون کے ممتاز تھے۔ اور اگلے دنون نہایت فارغ البالی سے بسر کرتے تھے۔ لیکن اب قدیم وضع و لباس کے بدلنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مردون کے بعد عورتون نے بھی گھیتلا جوتا بالکل چھوڑ دیا۔ اور بازار جو اعلیٰ درجے کے گھیتلے جوتون سے بھرا رہتا تھا اُس مین اب اگر کسی دوکان پر اُس وضع کا ایک آدھ جوڑا مل بھی جاتا ہے تو بہت ہی ذلیل و

وحقیر پرانا۔ ماند۔ اور میلا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان موچیون کا گروہ بالکل تباہ ہوگیا۔ اُن کے بیسیون گھر اُجڑ گئے۔ اور جو باقی ہین قعر فنا کے بالکل کنارے ہین۔ لیکن ان لوگون کی وضعداری کی داد دینا چاہیے کہ لُٹ گئے اور تباہ ہوگئے مگر یہ نہ گوارا کیا کہ گھیتلے جوتون کے عوض سلیپر ین یا بوٹ بنائین۔ اور رفتار زمانہ کا ساتھ دے کے پہلے سے زیادہ ترقی کرین۔

دوسرا گروہ اہل حرفہ جو اُنکی جوتیون کے صدقے مین پیدا ہوا جوتون کی چھوٹی اَوگھیان بنانے والون کا ہے۔ اوگھی کارچوبی کام کے اُن مختلف قطع کے ٹکڑون کو کہتے ہین جو زنانے یا مردانے جوتون پر لگائے جاتے ہین۔ اَوگھیان یہان بہت ہی نفیس زرق برق اعلیٰ درجے کی ایسی نفیس بنتی تھین جیسی کہین نہ بن سکتی تھین۔ اور اُنکی مانگ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ آبادی کا ایک معتدبہ حصہ اُنھین کی تیاری پر زندگی بسر کر رہا تھا۔

بہر حال گھیتلے جوتون کے فنا ہونے سے ان دونون گروہون کو نقصان پہونچا۔ اب گھیتلے کے عوض عورتون مین عموماً سلیپرون کا اور خاص گھرانون یا خاص موقعون کے لیے تمام شریف بیبیون مین اعلیٰ درجے کے پمپ شوز کا رواج ہے۔ دولتمند گھرانون مین گھیتلا جوتا چھوڑ کے ٹاٹ بانی (یعنی کارچوبی کام کے) بوٹ پہننا شروع لیے تھے۔ اُن کے چند ہی روز بعد چمڑے کے بوٹ جو بغیر کھولے پاؤن سے اُتر سکین پہنے جانے لگے۔ اور اب تو علی العموم سب شوز اور جن لوگون نے پوری انگریزی وضع اختیار کر لی ہے اُن کی بیگمین تو ہر قسم کے لیڈیز شوز پہننے لگی ہین۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلے مین عورتون کے عام لباس کو بھی بیان کر کے ہم وضع و لباس کی بحث کو ختم کر دین۔

ہندوستان مین عورتون کا قدیم لباس صرف ایک بے سی ہوئی لمبی چادر تھی جو آدھی کمر سے لپیٹ کے باندھ لی جاتی۔ اور آدھی کندھے یا سر پر ڈال کے اوڑھ لی جاتی۔ اسکے ساتھ سینے کا ایک لباس بھی ہندوؤن کے پُرانے زمانے سے چلا آتا ہے جو بلندی ہند مین "انگیا" اور جنوبی ہند مین "چولی" کہلاتا

یہ لباس سری کرشن جی کے زمانے مین بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجود تھا - آخر زمانے مین چولی اور انگیا کی تفریق یون ہوئی کہ دکھن مین ایک جھول دار پٹی سے پیچھے سے آگے کی طرف لا کے دونون چھاتیون کے درمیان مین گرہ دے کے یا بوتام لگا کے کس دی جاتی ہے - اور دونون چھاتیان اُس جھول مین کسی قدر اُبھار کے ساتھ دبی اور کسی رہتی ہین - یہی دکھن کی چولی ہے - بخلاف اس کے بلندی ہند مین انگیا یون بنتی ہے کہ پستانون کے مناسب ناپ کے کپڑے کی دو کٹوریان بنائی جاتی ہین جو دو تین اُنگل تک باہم سی کے جوڑ دی جاتی ہین اور اُن کے بالائی کونون پر جالی کی دو چھوٹی چھوٹی آستینین لگا دی جاتی ہین - اور اُن آستینون کے نیچے دونون پہلوؤن پر دو دو بند لگا دیے جاتے ہین - اس طرح طیار کر کے اور دونون ہاتھون کو آستینون مین ڈال کے یہ انگیا پہن لی جاتی ہے آستینین بہت ہی چھوٹی آدھے بازوون سے بھی کم رہتی ہین - اور چھاتیون کی کٹوریون مین ڈال کے پیٹھ پر بند کھینچ کے نیچے اوپر دو بندشین دے دی جاتی ہین - بخلاف چولی کے انگیا چھاتیون کو اصل سے زیادہ اُبھار کے نمایان کر دیتی ہے -

بہرحال یہ پُرانا ہندو لباس ہے - اور ہم نہین جانتے کہ مرور زمانہ سے اُس مین کیا اصلاحین یا ترقیان ہوئین - بادی النظر مین انگیا زیادہ ترقی یافتہ اور بعد کی اصلاح معلوم ہوتی ہے -

اسکے سوا ہندو زمانے مین عورتون کا اور کوئی لباس نہین معلوم ہوتا - سیے ہوے کپڑے اور کُرتا پائجامہ مسلمان اپنے ساتھ لائے - مسلمانون کی عورتین ملک عجم سے عرص کے ڈھیلے پائنچون کے پائجامے پہنے ہوے یہان آئین - جو ٹخنون پر چنٹ دے کے باندھ دیے جاتے تھے - چند روز بعد وہ پائجامے تنگ مُہری کے گھٹنے ہو گئے - جن کا گھیر اوپر سے ڈھیلا ڈھالا ہوتا - رفتہ رفتہ اُن مین کھنچاؤ کا شوق بڑھتا گیا - یہان تک کہ اوپر کا گھیر بھی کم ہو گیا - اور پائنچون کی مہریان تو اس قدر تنگ ہو گئین کہ پہننے کے بعد کس کے سی لی جاتین - اور اُتارتے وقت مہری کے ٹانکے توڑنے کی ضرورت لاحق ہوتی - جیسے پائجامے آج بھی بہت سے شہرون مین مروج ہین -

لکھنؤ میں مسلمان بیگموں کی وضع ابتداءً تو یہی تنگ مُہری کا کھنچا ہوا پائجامہ۔ سینے پر چھوٹی اور تنگ آستینوں کی کھنچی ہوئی انگیا۔ اور پیٹ اور پیٹھ چھپانے کے لیے ایک عجیب و غریب کُرتی جو آگے کی طرف اُس حد تک کاٹ دی جاتی جہاں تک جسم پر انگیا کا تصرف رہتا۔ اُس میں نہ آستینیں ہوتیں اور نہ سینے پر اُس کا کوئی حصہ رہتا۔ دولمبے بندوں کے ذریعے سے جو شانوں پر سے ہو کے آتے پیٹ اور پیٹھ پر معلق ہوتی۔ اُس کے اوپر تین گز کا چُنا ہوا باریک دوپٹہ جو سر سے اوڑھا جاتا۔ لیکن آخر میں فقط شانوں پر پڑا رہنے لگا۔

ہندوستان کے موسم اور مزاجوں کی نزاکت نے محرم کُرتی اور دوپٹے سب کو روز بروز سبک کرنا شروع کیا یہان تک کہ لاہی کی انگیا اور کریب کے دوپٹے و صندیرا امیر زادیوں کے فیشن میں داخل ہوگئے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے سے گھٹنے رخصت ہوگئے اور اُن کی جگہ بڑے بڑے گھیردار پائنچوں کے کلیوں دار پائجامے جو کمر کے پاس بہت ہی تنگ ہوتے اور چور کلی یعنی میانی خوب کھنچی رہتی۔ علی العموم رواج پا کے عورتوں کی خاص وضع قرار پا گئے۔ یہ پائنچے آگے کی طرف ایک نفاست و خوشنائی کے انداز سے ناف کے نیچے گھرس لیے جاتے تاکہ چلنے پھرنے میں زمین پر لوٹ کے خراب اور میلے نہ ہوں۔ غدر کے قریب زمانے یا شاہی کے عہد آخر میں باریک کپڑوں اور آدھی آستینوں کے تنگ شلوکوں کا رواج ہوگیا جو کُرتی کے عوض پہلے تو محرم کے اوپر پہنے جانے لگے۔ اور چند روز بعد اُنھوں نے محرم کی ضرورت بھی اُڑا دی۔ مگر اب بھی بہت ہی باریک کپڑوں کے استعمال کیے جانے کی وجہ سے یہ لباس ننگا معلوم ہوتا۔ خصوصاً اس لیے کہ بانہیں بالکل ننگی رہتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شلوکوں کے عوض کسی قدر ڈھیلے کُرتوں کا رواج ہونے لگا۔ لیکن اب یک بیک کرتوں کی جگہ انگریزی جاکٹ اور باڈس پہنے جانے لگے۔

اب ہر صوبے اور ہر شہر کی وضعوں کا مقابلہ اور اسکے ساتھ باہمی اختلاط سے ہونے لگا ہے۔ اور بعض مسلمانوں یا خود خاتونوں کو ساری زیادہ خوشنما نظر آنے لگی۔ جس کی وجہ سے لکھنؤ کی عورتیں آدھے کے قریب پرانی وضع چھوڑ کے ساریاں

باندھنے لگی ہین - اور کہا جاتا ہے کہ اُس مین زیادہ سادگی ہے - مین اگرچہ اسکے خلاف نہین ہون کہ عورتین اپنے حسن مین جدت اور تازگی پیدا کرنے کے لیے مختلف لباسون کو پہنین اور مصداق ع ہر لحظہ بوضع دگر آن یار برآمد - نئی نئی دھجون سے اپنے شوہرون کی دلداری کرین - لیکن مین اسکے سخت خلاف ہون کہ اپنی قومی وضع بالکل چھوڑ دی جائے - اور اپنے معاشرتی خصائص بالکل فنا کردیے جائین - ساری ایک غیر مخیط کپڑا اور تمدن انسانی کے بالکل ابتدائی اور غیر متمدن زمانے کی یادگار ہے - سادگی بیشک دلکش چیز ہے - مگر بہت سی قیدون اور خصوصیتون کے ساتھ - ورنہ پوری سادگی تو عریانی مین ہے - خود لباس فطرت انسانی کو اپنے تفنن کا جامہ پہنانا ہے - اس لیے میری سمجھ مین نہین آتا کہ ساری مین کیا خاص خوبی وخوبصورتی ہے -

جس طرح مرد کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ اپنی حسین ترین منکوحہ سے اُکتا کے دوسری جوان عورتون کی طرف مائل ہوتا ہے اُسی طرح ہمارے نوجوان اپنی بیبیون کی وضع سے سیر ہوکے دوسری قومون کی عورتون کے لباس پر فریفتہ ہوجاتے ہین - مگر خوب یاد رکھیے کہ جس طرح آپ اُن کے لباس پر فریفتہ ہین اُسی طرح دوسری قومون کے مرد آپ کی عورتون کے ترقی یافتہ لباس مین زیادہ دلکشی ورعنائی پاتے ہین - نفسانی خواہشات کا ایک مغالطہ ہے جو فی الحال آپ کی نظر مین اپنی عورتون کے لباس کو معیوب ثابت کرکے بار بار ملک مین یہ بحث پیدا کراتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانون کی بیبیون کے لیے مناسب کیا ہے -

ہم اس مسئلے پر اچھی طرح بحث کرتے اگر ہمین یقین ہوتا کہ خالص عورتون کی اخلاقی ومعاشرتی اصلاح کی غرض سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے - دراصل یہ مسئلہ اُسی تقاضاے طبع سے پیدا ہوا ہے جس نے نوجوانون کو کوٹ پتلون پہنایا - ہیٹ سے اُن کے سرون کو زینت دی - اور سوا رنگت کے اُن مین کوئی چیز اپنی نہین باقی رکھی - لہذا ہم کو یقین ہے کہ یہ مسئلہ فقط اس جوش مین پیدا ہوا ہے کہ مردون کی طرح عورتین بھی انگریزی لباس اختیار کرین - ہم خوب جانتے ہین کہ اس بارے مین لکھنا پڑھنا اور کہنا سننا سب بیکار ہے - اس لیے

کہ جب تک انگریزی سائے اور ہیکوٹ اور پانٹ (انگریزوں کی ٹوپی) پہننے کا فیصلہ نہ کر دیا جائے گا ہمارے مصلحان معاشرت اور نقال موجدان فیشن کو چین نہ آئے گا۔ اسکے سوا چاہے اور کیسی ہی اچھی اصلاح و ترمیم کی جائے گی اُنکا اطمینان نہ ہوگا۔

غرض اس انجام کو سوچ کے اس بارے مین اخباروں اور رسالون کے صفحے سیاہ کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں۔

(۳۷)

لباس کے متعلق لکھنؤ مین تراش وخراش اور کپڑوں کی نوعیت مین روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ گرم ملک ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے ادنی طبقے والے سوا ستر پوشی کے اپنا سارا بدن برہنہ رکھتے ہین یہ صرف اُنکے افلاس اور اہل ملک کی کم مائگی کے باعث نہین بلکہ موسم اور آب ہوا کے تقاضے سے ہے۔ اس کا اثر دہلی مین بھی یہ تھا کہ بجائے کُندہ اور گران کپڑون کے سُبک اور نازک کپڑے اختیار کیے گئے۔ یہان اُس سے بھی زیادہ ترقی ہوئی۔ اور چونکہ اب سپہگری وجنگجوئی کی بہت ہی کم ضرورت باقی تھی۔ عیش پرستی اور عورتون کی صحبت بہت بڑھتی جاتی تھی۔ اس لیے مُردون پر عورتون کی وضع کا اثر پڑنے لگا۔ جو اعتدال سے باہر ہوگیا۔ اور جس قسم کی زینت وآرایش عورتون کے لیے موزون ہے مَردون نے اپنی وضع اور اپنے لباس مین اختیار کرنا شروع کر دی۔

خصوصاً اُس زمانے سے جبکہ یہان کے حکمرانون نے اپنے لیے نواب کا لفظ چھوڑ کے بادشاہ کا لفظ اختیار کیا۔ نیشاپوری اور سالار جنگی خاندان کے لوگ جو معتدبہ وثیقے اور پنشنین پاتے تھے بالکل خانہ نشین کر دیے گئے تو اُنکو سوا عورتون کے کسی کی صحبت ہی نہ نصیب ہوتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ اُنکے وضع ولباس ہی مین زنانہ پن نہین پیدا ہوا بلکہ اُن کی زبان بھی عورتون کی سی ہوگئی۔ اور چونکہ وہی شہر کے رئیس اور وضعدار تصور کیے جاتے۔ لہذا اکثر عوام نے بھی اُنھین کی پیروی شروع کر دی۔ اور بخلاف دیگر مقامات کے رئیسون کے یہان لکھنؤ مین یہ عام وضع ہوگئی کہ سر پر مانگ۔ اُسپر مسالے کی

کامدار ٹوپی - کانون تک بال جن کی کنگھی کرنے مین ماتھے پر دونون جانب پٹیان جمائی جاتین - منہ مین پان - ہونٹون پر لاکھا - پنڈے مین تین تین کرتیون کا چست انگرکھا - اُسکے نیچے گلبدن کا ریشمی کھنچا ہوا گھٹنا - ہاتھون مین مہندی - پائون مین ٹاٹ بانی یعنی کامدار بوٹ - جاڑون مین انگرکھے کی جگہ نیلے - زرد یا سبز و سرخ اطلس یا گرنٹ کا روئی دار دگلا -

جاڑون مین یہان کے بعض معزز لوگ عموماً شال کی قبائین پہنتے مگر دوشالے اور شالی رومال کو سب پسند کرتے - اُسی کا نتیجہ تھا کہ جیسا شال لکھنؤ والون مین اب بھی کہین کہین نکل آتا ہے ویسا شال ہندوستان کیا معنی شاید خود کشمیر مین بھی اب نصیب نہ ہو سکے گا -

شال کا شوق یہان تک بڑھا کہ بہت سے شال بننے والے اور ہزارون رفوگر اور شال کے دھونے والے کشمیری اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ مین آ بسے جن کا گذشتہ پچاس سال مین اب نام و نشان بھی نہ باقی رہا - اُن مین سے کوئی بچا بھی تو اُس نے کوئی اور پیشہ اختیار کر لیا -

محرم چونکہ لکھنؤ مین ایک بڑی اہم چیز اور عزاداری کا زمانہ تھا اس لیے سوگواری اور نفاست و نزاکت کا لحاظ رکھ کے یہان محرم کے لیے خاص لباس اور خاص زیور ایجاد ہو گیا - سیاہ اور نیلے رنگ غم و سوگواری کے رنگ سمجھے گئے - اور سبز رنگ اس لیے کہ بنی عباس کے عہد مین اُن کے سیاہ رنگ کے مقابل بنی فاطمہ کا رنگ سبز تھا - چنانچہ آج بھی ایران و ہند کے بعض فاطمی اپنے سبز عمامون سے سیدون کی اس قدیم وضع کا ثبوت دے دیا کرتے ہین - بہر تقدیر محرم مین سرخ رنگ ممنوع قرار پایا - سبز - نیلا - اور سیاہ رنگ اور اُنکے ساتھ زرد رنگ بھی اُس موسم کے لیے مناسب سمجھے گئے - چنانچہ یہان محرم مین تمام عورتون کا لباس انھین مذکورہ رنگون سے مناسب جوڑ لگا کے منتخب کیا جاتا - سارا زیور بڑھا دیا جاتا حتی کہ چوڑیان تک اُتار ڈالی جاتین - جن کے عوض کلائیون کے لیے ریشم کی سیاہ و سبز پہونچیان اور کانون کے لیے سیاہ و زرد ریشم کے کرن پھول ایجاد ہوے جو سونے چاندی کے زیور سے

کبھی زیادہ نفاست کے ساتھ اُن کی زیبائی و رعنائی بڑھا دیا کرتے ہین۔

محرم تو نہایت ہی اہم مہینہ تھا۔ یہان ہر موسم اور ہر زمانے کے مناسب ایسی ایسی ایجادین عورتون کے لباس مین روز ہوتی رہتی تھین جن کو سارا ہندوستان حیرت کی نگاہون سے دیکھتا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ آج سے پچاس سال پیشتر لکھنؤ مین عورتون کے لباس کی تراش خراش اور روز روز کی تازہ جدتون کو جو دیکھتا وہ فرانس اور لندن کے فیشن بدلنے کو بھول جاتا۔ اور اسی بنا پر اکثر زبانون پر جاری ہو گیا کہ لکھنؤ مشرق کا پیرس ہے۔ آج بہت سے سادگی پسند اور ترقی یافتہ معاشرت سے محروم رہنے والے ان تکلفات پر اعتراض کرتے ہین اور یہ نہین دیکھتے کہ جن دربارون اور شہرون مین تمدن ترقی کرتا ہے وہان معاشرت و صحبت کے ہر شعبے مین ایسی ہی باتین پیدا ہو جایا کرتی ہین۔ جو ایک فلسفی کی نظر مین چاہے لغو و فضول ہون مگر دنیادارون کی صحبتین اور شایستہ لوگون کی محفلین اُنکو نہایت ہی اہم اور ضروری تصور کرتی ہین۔

مردون پر عورتون کی وضع کے غالب آنے کا اثر اگر کپڑون کی نزاکت اور تیز اور بھڑکیلے رنگون تک محدود رہتا تو بہت غنیمت ہوتا یہان تو بہت سے ان لوگون کی یہ حالت ہو گئی کہ میان بیوی کے دگلون۔ دوپٹون۔ دولائیون۔ نہالچون اور پائجامون مین کسی قسم کا فرق ہی نہین رہا۔ بجز اس کے کہ گوٹا پٹھا اور زیور عورتون کے ساتھ مخصوص تھا۔ مرد شوخ رنگون کے نازک ریشمی کپڑے بغیر گوٹے پٹھے کے پہنتے۔ مگر یہ مذاق غدر کے بعد انگریزی اثر سے گھٹنے لگا۔ اور اب صرف چند گنتی کے لوگون کے سوا کسی مین نہین باقی رہا۔

مرد خدمتگارون اور اُنکے مختلف طبقات کی طرح یہان عورتون کے مختلف طبقون کی بھی خاص خاص وضعین قرار پا گئین۔ انگریزون کے خانسامان کوچبان اور سائیس مختلف وردیون مین رہتے ہین۔ مگر وہ وردیان اُن کا اصلی لباس نہین قرار پا سکین کہ اپنے گھرون مین بھی وہ انکو پہنا کرتے ہون۔ بخلاف اسکے لکھنؤ مین زنانے اور مردانے نوکرون اور اندر باہر کے تمام ملازمون کے لیے جو خاص خاص لباس مقرر ہو گئے تھے وہی اُنکی اصلی وضع قرار پا گئے۔ مثلاً جیسے

ڈیوڑھیون کے پہرے والے سپاہیون - اور چوبدارون - ہرکارون وغیرہ کی خاص اور جدا جدا وضعین تھین ویسے ہی زنانی محلسراؤن مین محلدارون - مغلانیون اور کہاریون کی وضعین اس قدر ممتاز تھین کہ دُور سے دیکھتے ہی انسان سمجھ جائے گا کہ یہ عورت محلدار ہے - یہ خواص ہے - یہ مغلانی ہے - اور یہ کہاری ہے - اور پھر لطف یہ کہ اُن کے لباس مین وردی کی شان نہین پیدا ہونے پائی -

خدمتگارون اور اُنھین کی طرح پیش خدمتون کا البتہ وہی لباس تھا جو خود میان بیویون کا لباس تھا - جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونون گروہ اپنے مالک یا مالکہ کا اُتارن یعنی اُنکے اُترے ہوے کپڑے پہنا کرتے ہین -

لباس کے بعد عورتون کے لیے سب سے اہم چیز زیور ہے - اور عورتین اکثر اپنی مخصوص دولت و جائداد اپنے زیور کو سمجھتی ہین - جس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اکثر صوبجات ہند مین بھدّے اور بھاری زیور کا زیادہ رواج ہے - تاکہ وہ قیمت مین زیادہ ہون - زیور کے بھاری ہونے کا شوق ادھر کے دیہات مین اور عموماً ہندوستان کے تمام شہرون مین روز بروز بڑھتا جاتا ہے - مگر لکھنؤ مین دہلی کے شریف خاندانون کی معزز خاتونین آئین تو ابتداءً وہی زیور جس کا سارے ہندوستان اور خود دہلی مین رواج تھا پہنے ہوے تھین - مگر یہان آنے کے چند روز بعد جب یہان کی ترمیم شدہ مخصوص معاشرت قائم ہوئی تو زیور مین فقط زینت و آرائش کا خیال باقی رہ گیا - اور ہر قسم کا زیور روز بروز سُبک - ہلکا - نازک - اور خوشنما ہوتا گیا - یہان تک کہ آخر عہد مین اُمرا اور دولتمند گھرانون کی بیویون کی یہ وضع ہو گئی کہ سادے بغیر سلمے اور گوٹے پٹھے کے کپڑے پہنتین اور زیور کی قسم کی دو ہی ایک چیزون پر جو بہت ہی نازک - سبک - اور قیمتی ہوتین کفایت کرتین - اور اگر گلے اور ناک کان مین متعدد چیزین پہنتین بھی تو وہ بہت ہی ہلکی ہوتین - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا سبک اور ہلکا زیور لکھنؤ مین بننے لگا کہین نہ بن سکتا تھا -

ناک مین نتھ ہندوؤن کے عہد سے نہایت ہی ضروری زیور اور سہاگ

کی نشانی سمجھی جاتی تھی جو خیال باہمی میل جول سے مسلمانون مین بھی پیدا ہو گیا۔ چنانچہ دیہات والیان آج بھی اُس کے بھاری کرنے مین یہان تک مبالغہ کرتی ہین کہ چار چار پانچ پانچ تولے کی نتھین پہن لیتی ہین جن سے اکثر نتھنے پھٹ جاتے ہین مگر دوبارہ ناک چھدوائی جاتی ہے تاکہ ناک نتھ سے خالی نہ رہے۔ لکھنؤ کی بیویون نے نتھ کو اُڑا ہی دیا۔ اور اُس کی جگہ سونے کی مرصع کیل پہننے لگین جو بہت ہی نفیس اور خوبصورت زیور ثابت ہوئی۔ اور نزاکت پسندی نے اِن کیلون کو بھی اتنا مختصر اور سبک کر دیا کہ سبک ناک کی کیلین لکھنؤ کے سنارون اور سادہ کارون کے سوا اور کہین کے کاریگر نہین بنا سکتے۔

اب ادھر پچیس تیس سال سے بُلاق کا رواج بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اگرچہ یہ کوئی پسندیدہ مذاق نہین مگر زیور کے اختصار اور عام پسندی نے اسے اس قدر ترقی دی ہے کہ اب بہت کم عورتین ہین جو بُلاق نہ پہنتی ہون۔

فی الحال مختلف شہرون کے باہمی میل جول سے زیور بنانے کے فن مین ہر جگہ ترقی ہو رہی ہے۔ اور خاص خاص زیورون کے لیے خاص خاص شہر مشہور ہو گئے ہین۔ مگر غدر سے پیشتر جب ریلوے نے بلاد ہند مین یہ باہمی موانست و یکرنگی نہین پیدا کی تھی لکھنؤ سے اچھے سُنار اور کاریگر کہین نہ مل سکتے تھے۔ لیکن اب بہت سے شہر اس فن مین لکھنؤ سے بڑھتے جاتے ہین۔ خصوصاً شہر دہلی منقوش چاندی کے سبک زیور بنانے مین ہندوستان کے تمام شہرون سے سبقت لے گیا ہے۔ مگر پھر بھی اکثر مقامات کے نفیس مزاج گھرانے لکھنؤ ہی کے بنے ہوے زیور اور یہان کے چاندی کے ظروف کو زیادہ پسند کرتے ہین۔ یہ بحث لکھنؤ کی صنعتون مین ہمین بار بار چھیڑنا پڑے گی۔ اس لیے یہان اسی پر قناعت کرتے ہین۔

(۳۸)

کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی بحث ختم کرکے اب ہم اُن چیزون کی طرف توجہ کرتے ہین جن کو سوسائٹی اور میل جول سے خصوصیت ہے۔ اور جن پر شائستہ اور مہذب مذاق کا تصرف کرکے لکھنؤ نے اُنھین اپنا بنا لیا۔

دنیا کے ہر ملک مین میل جول اور معاشرت کا ایک تمدن قائم ہو جاتا ہے جس مین زیادہ تر تعلق وضع قطع - اخلاق وعادات - نشست برخاست - طرزکلام طریقۂ مذاق - مکان اور فرنیچر وغیرہ کو ہوتا ہے - اور ان باتون کے بعد اُس سامان زندگی کو جس کی اس سوسائٹی کو ضرورت ہو - فطری طور پہ یہ چیزین ہر گروہ ہر طبقے اور ہر شہر و قریے مین پیدا ہو جاتی ہین - اور آج بھی دنیا مین پھر کے دیکھیے تو ہر جگہ سوسائٹی کی خاص نوعیت اور اُسکے خصوصیات نظر آ جائین گے - مگر جن مقامون مین کوئی معزز دربار قائم ہو جاتا ہے اور علم و ادب کو ترقی ہوتی ہے وہان کی سوسائٹی ایک بڑے حصہ ملک کو اپنا تابع بنا کے اُسکے ہر شہر و قریے کی معاشرت کا مرجع اور اصول تہذیب کا مرکز بن جاتی ہے -

ہندوستان مین تہذیب و تمدن اور آداب سوسائٹی کا اصلی مرکز یقینی طور پہ دہلی تھی - اس لیے کہ بہت سی صدیون تک وہ ہندوستان مین حکومت کا مرکز اور علم و فضل کا منشا و مستقر رہ چکی ہے - سارا ہندوستان اُسکے زیر نگین تھا - اور وہان کی صحبت کے تربیت یافتہ تمام صوبون کے حاکم اور ادب آموز ہوا کرتے تھے - لکھنؤ کے لیے اُس کے مقابل مین نہ کوئی خصوصیت ہے اور نہ اُسے کوئی امتیاز حاصل ہو سکتا ہے - مگر اس محل پہ لکھنؤ کا نام لیا جانے کی اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ زمانے کے اتفاق سے پچھلی صدی مین وہی دہلی کی معاشرت پوری پوری لکھنؤ مین منتقل ہو آئی - اور وہین کے اُمرا و شرفا - علما و شعرا - اتقیا و صلحا - سب کے سب لکھنؤ مین چلے آئے - اور جو دربار دہلی مین اُجڑتا تھا لکھنؤ مین آکے جمع ہوتا - اس لیے کہ وہان کے تمام وضعدار لوگ ایک ایک کرکے سب یہین چلے آئے - اور یہان اطمینان حاصل ہو جانے کی وجہ سے اپنی ترقی یافتہ معاشرت پر اور ترقیان کرنے لگے - اور پھر لطف یہ کہ دہلی والون کی جو معاشرت اودھ مین آ کے قائم ہوئی تھی اُس مین سوا دہلی والون کے کوئی غیر شخص نہ تھا - حتیٰ کہ لکھنؤ کے پُرانے معزز باشندون کو بھی اُس مین بالکل جگہ نہین ملی -

لہذا لکھنؤ کی معاشرت دراصل دہلی کی معاشرت اور وہین کی ترقی یافتہ سوسائٹی
کا آخری نمونہ ہے۔ اس پچھلی صدی مین دہلی کے پُرانے تمدن کے دو اسکول
ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو خاص دہلی مین موجود تھا اور دوسرا وہ جو لکھنؤ مین
منتقل ہو آیا۔ لیکن اس مین شک نہین کہ زوال سے پیشتر کی آخری صدی
مین اُس اسکول کے لیے جو دہلی مین تھا دربار مغلیہ کے کمزور پڑ جانے اور
دولتمندی کے مٹ جانے کی وجہ سے میدان ترقی مین آگے قدم بڑھانے
کا ویسا موقع نہین نصیب تھا جیسا لکھنؤ والے دہلی کے اسکول کو حاصل تھا
اور یہی وجہ ہوئی کہ اس زمانے مین لکھنؤ کا تمدن ترقی کر رہا تھا۔ اور دہلی
کے قدیم تمدن کی ترقی رُک گئی تھی۔ الغرض یہی ترقیان لکھنؤ کی سوسائٹی کے
خصوصیات ہین۔ بلکہ غور کرنے سے یہ نظر آتا ہے کہ دہلی مین تمدن و معاشرت
کو قدیم شہنشاہی دربار کی برکتون سے جو ترقی حاصل ہوئی تھی پچھلے دَور مین
تجارت پیشہ جاہل قومون کے غلبے اور قدیم خاندانی شرفا کے دیگر بلاد مین منتشر
ہونے۔ یا خانہ نشین ہو جانے کے باعث وہ بھی تشریف لے گئی۔ اور سچ یہ ہے
کہ اودھ کے شاہی دربار کے ٹوٹ جانے کے بعد سے بیرونی لوگون کے میل جول
اور پُرانے مہذب خاندانون اور اُنکے اثر کے مٹ جانے کی وجہ سے جو تہذیب
لکھنؤ مین پیدا ہوئی تھی وہ بھی روز بروز رخصت ہوتی جاتی ہے۔

مگر ہمین اُس بدتمیزی کی سوسائٹی اور اُن متمردانہ اخلاق و آداب سے
بحث نہین جو غدر کے بعد سے لکھنؤ مین پیدا ہونا شروع ہوے اور ترقی کرتے
جاتے ہین۔ ہماری غرض محض اُس تہذیب کو بتانا ہے جو لکھنؤ کے شاہی دربار
کے آغوش مین پرورش پا کے یہان کی صحبتون مین پیدا ہو گئی تھی۔

یہان کی معاشرت کے متعلق اپنے اس مضمون کے سلسلے مین ہم مندرجۂ ذیل
امور کو بیان کرنا چاہتے ہین۔ (۱) مکان (۲) فرنیچر (۳) وضع قطع (۴) اخلاق
و عادات (۵) نشست برخاست (۶) صاحب سلامت و مزاج پرسی (۷)
طرز کلام (۸) طریقۂ مذاق (۹) شادی و غمی کی محفلین (۱۰) مجلسین (۱۱) مولد شریف
کی محفلین۔ پھر اُن کے بعد ہم اُن چیزون کو بیان کرینگے جو لوازم صحبت اور

سامان معاشرت ہین۔

(۱) مکان۔ دہلی اور لکھنؤ مین مکانون کے متعلق پُرانا مذاق یہ تھا کہ ظاہری نمائش اور شاندار ی صرف شاہی قصرون اور ایوانون کے لیے مخصوص تھی۔ امرا و تجار اپنے رہنے کے لیے جو مکان تعمیر کراتے وہ اندر اندر سے چاہے کیسے ہی وسیع اور نفیس ہون مگر اُن کی ظاہری حالت بالکل معمولی مکان کی سی ہوتی۔ اور اس مین مصلحت یہ تھی کہ جو مکان ظاہر مین شاندار ہوتے اکثر بادشاہون کو پسند آجاتے۔ اور بنوانے والون کو اُن مین رہنا بہت کم نصیب ہوتا۔ ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ رعایا مین سے کسی کا تعمیر مکان مین شاہانہ اُلوالعزمی دکھانا تمرد و سرکشی پر محمول کیا جاتا۔ اور اُسے سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا۔

اسی وجہ سے آپ کو دہلی مین مقبرون کے سوا قدیم الایام کی ایک بھی ایسی عمارت نہ نظر آئے گی جو عالیشان ہو اور رعایا مین سے کسی عالی مرتبہ امیر یا دولت مند تاجر کی بنوائی ہوئی ہو۔ لکھنؤ مین بھی ابتدائً یہی حال تھا۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خان کے زمانون مین دولتمند فرانسیسی تاجر مسٹیو مارٹن سے لئے دو ایک عالیشان عمارتین تعمیر کین مگر اُن کی تعمیر مین اصلی منشا یہ تھا کہ فرمان روائے شہر کو پسند آئین اور اُسکے ہاتھ فروخت کر ڈالی جائین۔ اُنھین عمارتون مین لا مارٹینیز کالج ہے جس پر نواب سعادت علی خان کی جُزرسی کی وجہ سے اسٹیٹ کا قبضہ نہ ہو سکا۔ یہ وہی کوٹھی ہے جو فی الحال عوام مین مارٹین صاحب کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے بعد یہان کے ایک وزیر روشن الدولہ نے اپنے رہنے کے لیے ایک عمدہ عمارت بنوائی تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ سلطنت کے حکم سے ضبط کر لی گئی۔ اور انتزاع سلطنت کے وقت اُس کا شمار مقبوضات شاہی مین تھا چنانچہ انگریزی دور مین وہ سرکاری جائداد ہونے کے باعث گورنمنٹ کے قبضے مین آ گئی اور روشن الدولہ کے ورثا کو نہین دی گئی۔ مگر آج تک وہ روشن الدولہ ہی کی کوٹھی کہلاتی ہے گو کہ اُس مین صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اور اُنکے اسسٹنٹ

اجلاس کرتے ہین -

رعایا کے عام مکانون کی وضع یہان یورپ کے کوٹھی نما مکانون سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے - یورپ مین مکان کے اندر صحن کی ضرورت نہین ہے - اسلیے کہ مردون کی طرح عورتین بھی پردہ نہ کرنے کی وجہ سے باہر جا کے کھُلی فضا مین ہوا کھا لیتی ہین - لہذا وہان کے خلاف یہان ضرورت ہے کہ مکان کے اندر صحن ہوا کرے - تاکہ عورتین گھر کے اندر ہی کھُلی فضا کا لطف اُٹھا سکین -

اس ضرورت اور یہان کی معاشرت کے دیگر تقاضون سے یہان کے مکانون کی عام قطع یہ کر دی ہے کہ بیچ مین صحن اُسکے گرد عمارت - اس عمارت مین ایک رُخ صدر قرار دے دیا جاتا ہے - اور اُدھر اینٹ چونے کے ستونون پر کم از کم تین اور کبھی اس سے زیادہ محراب دار در قائم کیے جاتے ہین - محرابین عموماً شاہجہانی محرابون کے نمونے کی ہوتی ہین - یعنی اُس مین چھوٹی چھوٹی قوسون کو خوشنمائی سے جوڑ کے بڑی محراب بنائی جاتی ہے - صدر مین اکثر ایسی محرابون کے دوہرے تہرے ہال ہوا کرتے ہین - پچھلا ہال کبھی دروازے لگا کے ایک بڑا کمرہ بنا دیا جاتا ہے - اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ تقریباً کمر کمر تک اُس کی کرسی بلند کر کے وہ شہ نشین بنا دیا جاتا ہے -

ان بڑے ہالون کے دونون پہلوون پر کمرے ہوتے ہین - اور ہال کی چھت اتنی اونچی ہوتی ہے کہ پہلو مین تلے اوپر دو کمرے ہال کی ایک چھت کے اندر آ جاتے ہین -

اب صحن کے دونون پہلوون پر اُسکے طول کے مناسب دالان - کمرے اور کوٹھریان بنا دی جاتی ہین - جن مین باورچی خانہ - پائخانہ - سودی خانہ - زینہ - کنوان - اور ماما اصیلون کے رہنے کے مقامات ہوتے ہین - صدر دالان کے مقابل جانب بھی اگر ضرورت معلوم ہوئی یا استطاعت ہوئی تو ویسے ہی عالیشان دالان اُدھر بھی بنا دیے جاتے ہین جیسے کہ صدر جانب ہوتے ہین - دروازہ اکثر پہلو مین یعنی اُن سمتون مین ہوتا ہے جدھر باورچی خانہ اور شاگرد پیشہ کے رہنے کے کمرے ہوتے ہین - جس کے سامنے اندر کے رخ پر مقابل اور ایک پہلو مین قدآدم

سے ذرا بلند ایک دیوار قائم کر دی جاتی ہے تاکہ دروازے سے اندر کا سامنا نہ ہے۔
غریبوں اور اوسط درجے والوں کے مکانوں مین اکثر پختہ محرابوں کے عوض
اُسی وضع کے چوبی سہ درے قائم کر کے دالان بنا دیے جاتے ہین جن مین
صدر مین اور کبھی اُس کے مقابل جانب بھی دالان در دالان ہوتے ہین -
اس قسم کے جو مکان زیادہ مکمل ہوتے ہین اُن مین چارون طرف سہ درے
اور دالان ہوتے ہین - اور اُنکے پہلوؤن مین ایک ایک دروازے کی کوٹھریان
نکلتی ہین جو مختلف ضروریات کا کام دیتی ہین - اور اُنھین مین سے کسی مین باہر
کا دروازہ ہوتا ہے -
یہ یہان کے مکانون کا ایک عام خاکہ تھا - مگر اسی مجموعی وضع کو قائم رکھ
کے اکثر مکانون مین نیچے اور ہر جگہ ایسی حکمت اور خوش اسلوبی سے کیدرے کمرے
اور کوٹھریان نکالی جاتی ہین کہ تعجب معلوم ہوتا ہے اتنی تھوڑی سی جگہ مین اتنی
مکانیت کیونکر آ گئی -
فن عمارت کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو نظر آئے گا کہ ابتداءً سپٹ عمارتین بنتی
تھین - پھر بلند اور مضبوط مگر سادی عمارتین بننے لگین - اسکے بعد زیب و زینت
کے لیے اُن پر نقش و نگار بننے لگے - پچی کاری کی ایجاد ہوئی - اور عجیب و غریب
طریقے سے رنگ آمیزیان کی جانے لگین - لیکن باوجود ان سب کمالون کے
اب تک بڑے بڑے چوڑے آثارون کی دیوارین ہوتین - اور اُن مین بڑے
بڑے ہال - اور دیوان خانے بنا دیے جاتے -
سب سے بعد کا کمال ہندوستانی عمارت مین یہ تھا کہ درزی کی سی کتر بیونت
کر کے تھوڑی سی زمین مین بہت زیادہ مکانیت نکال دی جائے - عمارت کا
یہ کمال خاص دہلی سے شروع ہوا - وہین اُس نے بڑے اعلیٰ درجے تک
ترقی کر لی - وہان سے سب جگہ پھیلا - اور لکھنؤ مین اُس نے سب مقامات سے
زیادہ ترقی کی -
آج کل بڑے بڑے اُستاد انجینیر موجود ہین - جنھون نے بڑی بڑی عالیشان
عمارتین بنائی ہین - وہ نمائشی طور پر عمارت کی ایک نہایت ہی خوبصورت

اور شاندار شکل قائم کر دیں گے ۔ لیکن یہ کام فقط پُرانے کاریگروں کا حصہ ہے۔ کہ زمین کے ایک چھوٹے ٹکڑے پر عالیشان عمارت بنا کے کھڑی کر دیں۔ اور اُس میں ہندسانہ کمال سے اتنے دالان کمرے کوٹھریاں اور صحنچیاں نکالدیں کہ دیکھنے والے کی عقل چکر میں آ جائے۔ اندرونی پردے کی دیواریں اتنی پتلی نازک سبک اور اُسکے ساتھ مضبوط ہوں کہ معلوم ہو اینٹ چونے کی دیواریں نہیں لکڑی کی اسکرینیں ہیں۔

عمارت میں لکھنؤ کی یہی خصوصیت تھی جس کو اگلے دربار نے نشو و نما دیا ۔ مگر اب انگریزی عہد میں یہ کمال ناقدری کی وجہ سے مٹتا جاتا ہے ۔ پُرانے کاریگر فنا ہو گئے اور جو دو ایک باقی ہیں اُن کی قدر نہیں

مگر پُرانے ہی زمانے سے ہندو مسلمانوں کے مکانوں میں ایک بیّن فرق چلا آتا ہے جو آج تک موجود ہے ۔ ہندو اپنے مکانوں میں صحن بہت چھوٹا اور تنگ رکھتے ہیں ۔ اور بلا لحاظ اسکے کہ ہوا اور روشنی کا گذر ہوگا یا نہیں مکانیت بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے مسلمان کھلے ہوادار مکان چاہتے ہیں۔ اور مکانیت اُسی درجے تک بڑھاتے ہیں جہاں تک کہ ہواداری اور روشن رہنے میں فرق نہ آئے ۔ لیکن باوجود مسلمانوں کے اس مذاق کے اگلے کاریگروں نے اُنکے ہوادار مکانوں میں بھی اس قدر مکانیت نکالی ہے کہ دیکھنے والے عش عش کر جاتے ہیں ۔

اسکے علاوہ اُس زمانے کے باکمال معمار دروازوں کمروں کی محرابوں اور دالانوں اور کمروں کی دیواروں پر مختلف رنگوں سے ایسے نفیس اور اعلیٰ درجے کے نقش و نگار بناتے تھے جیسے اب مشکل سے بن سکتے ہیں ۔ اور آج کل مصوری کا فن بیشک ترقی کر گیا ہے ۔ مگر معمار جیسی نقاشی در و دیوار پر کیا کرتے تھے وہ مٹ گئی اور عہد جدید کی سادگی پسندی کی وجہ سے روز بروز گھٹتی جاتی ہے ۔ تاہم اب بھی یہاں اس کام کے بعض اُستاد معمار ایسے پڑے ہیں کہ اُنکی سی نقاشی شاید کسی شہر کے معمار نہ کر سکیں گے ۔ نقش و نگار ہی نہیں وہ چھتوں اور دیواروں پر اعلیٰ درجے کی تصویریں بھی بنا سکتے ہیں ۔

معماروں ہی پر منحصر نہیں اُس وقت کے بڑھئیوں کو بھی یہی کمال حاصل تھا۔ وہ چاہے اعلیٰ درجے کی میزیں کرسیاں اور الماریاں یا ریلوے ٹرین کی گاڑیاں نہ بنا سکیں۔ مگر ستونوں محرابوں اور دروازوں کے چوکھٹ بازووں پر ایسے نفیس و نازک نقش و نگار کھود کے بنا دیا کرتے تھے جیسے آج مشکل سے بن سکیں گے۔

(۳۹)

معاشرت میں دوسری چیز مکانوں کا فرنیچر یعنی وہ سامان ہے جس سے مکان آراستہ کیے جاتے ہیں۔ اُن دنوں آج کل کی سی میز کرسیاں نہ تھیں بلکہ خاص ہندوستانی اور اسلامی مذاق کا سامان تھا۔ مکانوں میں تختوں کے چوکے ہوتے۔ پلنگ ہوتے۔ یا تختوں کے اوپر بچھانے کے لیے نازک اور خوشنما پلنگڑیاں ہوتیں۔ غریبوں اور متوسط حیثیت والوں کے یہاں بانوں کے پلنگ ہوتے اور امرا کے گھروں میں علی العموم نواڑ کے پلنگ ہوا کرتے۔

نفیس طبع لوگوں کے گھروں کی یہ شان ہوتی کہ جھاڑو دی ہوئی ہے۔ دیواروں پر سفیدی پھری ہے۔ چھت پر اُجلی سفید چھت گیری کھنچی ہوئی ہے جس کے چاروں طرف چھینٹ دی ہوئی جھالر لٹک رہی ہے۔ دالان کمرے یا صحن میں تختوں کا چوکا ہے اُس پر دری ہے اور دری پر سفید براق چاندنی۔ جو اس نفاست سے کھینچ کے بچھائی گئی ہے کہ شکن کا کہیں نام نہیں۔ چاروں کونوں پر سنگ مرمر کے گنبد نما میر فرش فرش کے کونوں کو دبائے ہوے ہیں تاکہ ہوا میں چاندنی اُڑنے نہ پائے یا اُس میں شکنیں نہ پڑیں۔

اوپر اُجلا فرشی پنکھا ہے۔ اُس کا بھی بعد کے زمانے میں رواج ہوا ورنہ دراصل ان مکانوں کی زینت دستی پنکھوں سے ہوتی جو حسب مرتبہ اور درجہ رُتبہ بڑے تکلف و اہتمام سے بنائے جاتے۔ اور اُن کا حال ہم آیندہ کسی موقع پر بیان کریں گے۔ اُس چوکے اور فرش پر خواہ کمرے کے اندر ہو یا باہر ایک جانب جو صدر مقام قرار پا جاتا نواڑ کا نفیس اور خوبصورت پلنگ بچھا ہوتا۔ پلنگ کے اوپر گرمیوں میں دری اور جاڑوں میں توشک ہوتی۔ اور اُس کے اوپر

ایک اُجلی چادر بچھی رہتی - پلنگ کی چادروں میں شاہی محلوں یا اُنکے ہم رتبہ محلسراؤں میں ایک نیچی زمین کے قریب تک کی چھینٹ دار جھالر چاروں طرف ٹنکی ہوتی جو پلنگ میں ایک خاص شان پیدا کردیتی - چاروں پاؤں پر بچھونے کے چاروں کونے ریشم کی رنگین ڈوریوں سے ایک خوشنما بندش سے باندھ دیے جاتے تاکہ لیٹنے اور کروٹیں بدلنے میں بچھونا کھنچنے اور اپنی جگہ سے سرکنے اور ہٹنے نہ پائے۔

سرہانے پلنگ کے عرض کے برابر مربع مستطیل قطع کے پتلے پتلے چار نہایت ہی نرم تکیے ہوتے - یہ تکیے اکثر شالباف (ٹول) کے ہوتے اور اُن پر ترتیب یا بیل میں ململ کے سفید غلاف چڑھے ہوتے - جن میں ٹول کی سرخی اپنی جھلک دکھاتی اور وہ پراٹھے کی پرتوں کی طرح تلے اوپر رکھے جاتے - پھر اُنکے اوپر اِدھر اُدھر اُسی کپڑے کے دو ننھے ننھے نرم گل تکیے ہوتے تاکہ کروٹ سے لیٹنے میں گالوں کے نیچے رہیں - یہ گل تکیے ہاتھ کی ہتھیلی سے زیادہ بڑے نہ ہوتے - اسکے بعد بچھونے پر دونوں جانب دونوں پٹیوں کی جانب دو گول تکیاں رہتیں جن کو کروٹ لیتے وقت رانوں کے نیچے دبا لینے میں آرام ملتا - پائنتی دولائی رضائی یا لحاف موسم کے مناسب لگا دیے جاتے - اور دن کو جب کوئی لیٹنے والا نہ ہوتا سارے پلنگ پر ایک پلنگ پوش پڑا رہتا۔

چوکے پر پلنگ کے آگے صدر نشینی کے لیے فرش کے اوپر ایک قالین سند کی وضع میں بچھا دیا جاتا - اور قالین پر پلنگ سے ملا ہوا گاؤ ہوتا جس پر روز کے استعمال کے لیے تو سفید غلاف رہتا مگر اعلیٰ تقریبوں کے موقعوں پر نہایت قیمتی ریشمی اور اکثر کارچوبی کام کے غلاف چڑھا دیے جاتے۔

اور اگر چوکے پر پلنگ نہ ہوتا تو اُس کے کسی ایک رُخ پر جو مناسب معلوم ہو سند تکیہ ہوتا اور اُسپر نشست ہوتی۔

دیواروں پر اگرچہ کبھی کبھی تصویریں ہوتیں مگر تصویروں کا جس قدر اب رواج ہے اُن دنوں نہ تھا - بلکہ تصویروں کے عوض عمدہ قطعات جن پر بڑی نفاست سے نقش و نگار بنائے جاتے فریم میں جڑ کے دیواروں پر لگا دیے جاتے

ان قطعات کا اُس زمانے مین رؤساء کو اس قدر شوق تھا کہ اُنھین کے لکھنے اور تیار کرنے پر خوشنویسون کی زندگی بسر ہوتی - اور سچ یہ ہے کہ اسی شوق نے اُس زمانے مین وہ نامور و باکمال خوشنویس پیدا کر دیے جو سوا قطعات لکھنے کے کتابت کو اپنے لیے ننگ اور اپنے معمولی شاگردون کا کام سمجھتے -

تختون کے علاوہ صحن ڈیوڑھی اور دروازے کی باہر کی نشست کے لیے مونڈھے ہوتے جو اگرچہ اب بھی کہین کہین نظر آ جاتے ہین - مگر ان دنون شریفون کا کوئی گھر اُن سے خالی نہ تھا - یہ سینٹھے اور بانس سے بنائے جاتے اور جن گھرون مین اُن کا زیادہ اہتمام ہوتا اُن مین ان مونڈھون پر بکری کی خشک کھال جس مین بال موجود ہوتے چڑھا دی جاتی - یا مضبوطی کے لیے وہی بالدار چمڑا فقط اُن کے کنارون پر چڑھا ہوتا - یہ مونڈھے اُن دنون بڑی بکار آمد چیز تھے -

امرا کے سوا جو زنانے اور مردانے دو مکان رکھتے تھے - عوام اور اکثر متوسط طبقے والے فقط ایک ہی مکان پر زندگی بسر کرتے - اب علی العموم کوشش کی جاتی ہے کہ ہر مکان مین دروازے کے پاس کوئی بیرونی کمرہ ضرور موجود ہو اُن دنون اس کا چندان خیال نہ تھا - بلکہ ڈیوڑھی مین اور اُس مین گنجایش نہ ہوتی تو دروازے کے باہر ہی مونڈھے ڈال کے لوگ احباب سے ملتے - اور اُس مین کوئی مضائقہ نہ سمجھا جاتا -

کمرون اور دالانون کے اندر اکثر طاقون پر خوشنمائی و زیبایش کے لیے کاغذ کے گلدستے رکھ دیے جاتے -

دالانون کی محرابون کے لیے عموماً پردے ضروری سمجھے جاتے مگر آج کل سینٹھون سرکیون یا ٹاٹ کے پردون کا جو رواج ہے اُن دنون نہ تھا بلکہ اس قسم کے پردے معیوب سمجھے جاتے - اور اُن کی جگہ تول یا جاجم کے روئی دار پردے تیار کرائے جاتے - جو اکثر بندھے رہتے - فقط ضرورت کے اوقات مین کھول کے لٹکا دیے جاتے - زنانی محلسراؤن کے بیرونی دروازون پر بھی اسی قسم کے پردے ہوتے - جس کے پاس کوئی ماما یا کہاری اکثر کھڑی نظر آتی -

(۳۹) وضع قطع ۔ اس کا ذکر لباس کے سلسلے مین آ چکا ہے ۔ مگر اسی قدر
پر ہمین یہ بتانا ہے کہ اُن دنون شرفا کے مذاق مین اپنے گھر پر اندر یا باہر
پورے کپڑے پہننے کی ضرورت نہین سمجھی جاتی ۔ بلکہ سر سے پانون تک برہنہ رہنا
اور فقط ایک تول کی غرقی یعنی مختصر سی لنگی باندھے رہنا معیوب نہ تھا ۔ یہ غرقی
اس قطع کی ہوتی کہ جانگھیا کی طرح بجز ستر پوشی کے ٹانگین بھی ننگی رہتین ۔
فی الحال ہمارے شرفا اپنے گھر پر بھی اندر یا باہر پیراہن ۔ کرتا ۔ اور پائجامہ
پہنے رہنا لازمی سمجھتے ہین ۔ مگر جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہین اُن دنون بظاہر
ہر گھر مین اتنے کپڑے پہنے رہنا وضعداری کے خلاف تھا ۔ اُسوقت بہت سے
ایسے لوگ تھے جو فقط گھر سے نکلتے وقت انگرکھا پائجامہ پہن لیتے ۔ اور اس
طریقے سے ایک شوب کو مہینون تک نباہ لے جاتے ۔ اور کپڑون کی یہ حالت
ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ آج ہی دھلو کے آئے ہین ۔ معمول تھا کہ دھوبی کے
وہان سے آیا ہوا انگرکھا پہنا جاتا تو اُس کی دامن ۔ گوٹ ۔ اور آستینین
چُنی جاتین ۔ اس چناوٹ کے نشان مہینون اُسی طرح برقرار رہتے ۔
ہان عورتون کے لباس مین البتہ کوئی فرق نہ آتا ۔ وہ اپنے گھر مین
اُتنے ہی کپڑے پہنے رہتین جتنے کہین مہمان جانے مین پہنتین ۔ یہ اور بات تھی
کہ آنے جانے کا جوڑا بھاری اور قیمتی ہوتا ۔ اور گھر مین پہننے کا معمولی ۔ کسی کے
وہان مہمان جانے کی صورت مین مرد اور عورت دونون عمدہ نفیس اور بھاری
پوشاکین پہن کے جاتے ۔ اور لباس کی عمدگی کی وجہ سے مردانی و زنانی دونون
صحبتین بہت صاف ستھری اور بارونق رہتین ۔

(۴۰)

مردون کی وضع مسلمانون مین قدیم الایام سے یہ چلی آتی تھی کہ سر پہ بال ۔
کتری ہوئی مونچھین ۔ اور ڈاڑھی گول اور مقطع ۔ مذہبی لوگ علما و زہاد ڈاڑھی
کو حسب سنت نبوی بالکل چھوڑ دیا کرتے تھے ۔ اور مونچھون کے قصر مین کبھی اتنا
مبالغہ کرتے کہ منڈوا ڈالتے ۔ لیکن امرا و شرفا کی وضع یہ تھی کہ ڈاڑھی کے بیچ
نیچے گلے کے پاس اور اوپر گالون پہ حدین قائم کی جاتین ۔ اور جو بال زیادہ

بڑھ جاتے اُن کو کاٹ کے ڈاڑھی مین گولائی پیدا کر کے اُسکی درازی کی ایک حد مقرر کردی جاتی - سب سے پہلے شہنشاہ اکبر نے ڈاڑھی کو خیرباد کہی - اور اُسکے بعد جہانگیر کے منہ پر بھی ڈاڑھی نہ تھی - اکبر و جہانگیر کے درباریون پر اس کا چاہے کسی حد تک اثر پڑ گیا ہو مگر امراے اسلام کی عام وضع وہی رہی جو پہلے سے چلی آتی تھی -

لکھنؤ مین دربار قائم ہونے کے بعد ڈاڑھی مین قصر شروع ہوا - اور ہوتے ہوتے اکثر کے مُنہون پر سے ڈاڑھیان غائب ہو گئین - غالباً اس کا یہ اثر ہو کہ ہم مذہبی کی وجہ سے یہان کے دربار پر ایرانیون کا اثر پڑ رہا تھا - اور وہان شاہان صفویہ کے عہد سے بادشاہون اور امیرون مین ڈاڑھی کی وہ اہمیت نہین باقی رہی تھی جو آغاز اسلام سے چلی آتی تھی - یا تو مسلمانون مین کسی کی ڈاڑھی مونڈ دینا سزا دینے یا اُسکی تذلیل و تحقیر کرنے کے لیے تھا یا ایران مین ڈاڑھی نہ رکھنا شان امارت و حکومت مین داخل ہو گیا - لکھنؤ کے خاندان نیشاپوری کے پہلے بانی نواب برہان الملک کے منہ پر مقطع ڈاڑھی تھی شجاع الدولہ نے ڈاڑھی منڈائی - اور اُسکے بعد سے یہان کے تمام اُمرا اور بادشاہ ڈاڑھیان مُنڈاتے رہے - اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عام شیعون سے ڈاڑھی کا رواج اُٹھ گیا - پھر بعد کے زمانے مین بہت سے سُنیون نے بھی ڈاڑھیان کترواٸین یا مُنڈا ڈالین - ڈاڑھی مُنڈانے کا شوق پیدا ہونے کے بعد طرح طرح کی وضعین نکلنے لگین - کسی نے کانون کے نیچے چھوٹی چھوٹی قلمین نکالین - کسی نے گلمچھے رکھوائے - کسی نے بڑے بڑے گلپچھے رکھے - اطراف و جوانب لکھنؤ کے قصباتیون اور بعض شہر کے سنیون نے بھی یہ وضع اختیار کی کہ ڈاڑھی رکھتے مگر راجپوتون اور ہندی پٹھانون کے مذاق کے مطابق ڈاڑھی کے بیچ مین ٹھڈی کے پاس مانگ نکال کے دونون طرف کے بالون کو کانون کی طرف چڑھاتے - اور اس وضع پر ڈاڑھی کے قائم رکھنے کے لیے گھنٹون ڈھاٹا باندھے رہتے - پھر اُس چڑھی ہوئی ڈاڑھی کے ساتھ مونچھین بھی کنگھی کر کے اور باندھ باندھ کے اوپر کے رخ پر چڑھائی جاتین

چنانچہ یہی وضع یہاں اور سارے ہندوستان میں سپہگری اور شجاعت کی علامت تصور کی جاتی۔

سر کے متعلق حضرت سرورِ کائنات صلعم کے مبارک عہد میں عام مذاق تھا کہ سر پہ بڑے بڑے بال ہوتے جو حج کے زمانے میں منڈا یا کتروا دیے جاتے۔ مگر عرب ہی میں ظہورِ اسلام کے چند روز بعد سر منڈانے کا عام رواج ہوگیا اور یہی رواج ایران میں معلوم ہوتا ہے۔ اور مسلمان ابتداءً جب ہندوستان میں آئے ہیں اُس وقت اُن کی وضع عموماً یہی تھی کہ منڈے ہوئے سر اور اُن پہ عمامے۔ ہندوؤں میں مسلمانوں کے آنے کے وقت سر پہ بال رکھنے کا رواج تھا۔ یہی وضع یہاں کے مسلمانوں کو پسند آئی۔ چنانچہ آخر عہد میں علما و اتقیا اور مشائخ و صوفیہ کے سوا دہلی کے شریف و وضیع کی عام وضع یہ تھی کہ سر پہ بال ہوتے جو کانوں تک رہا کرتے۔ سوا بانکوں کے جو نئی نئی دھجیں نکالا کرتے۔

اسی وضع میں شرفائے دہلی لکھنؤ میں آئے۔ یہاں آ کے نازک مزاجیاں بڑھیں۔ خود آرائی کے شوق میں ترقی ہوئی۔ اور نہایت نزاکت اور صفائی سے کنگھی کر کے ماتھے پر عورتوں کی طرح پٹیاں جمائی جانے لگیں۔ اور ایسی دھج پیدا ہوگئی کہ نوخیز لڑکوں میں عورتوں کی سی دلکشی پیدا ہوگئی۔ پھر چند روز کے بعد جب انگریزوں سے سیکھ کے عورتوں نے ماتھا خوب کھول کے بال اُلٹنا شروع کیے تو یہ وضع بھی بعض بعض مردوں نے اختیار کر لی۔

اب غدر کے بعد جب انگریزی وضع قطع اختیار کی جانے لگی تو سارے ہندوستان کے لوگوں کی طرح یہاں بھی بال کٹ کے انگریزی فیشنوں کے ہوگئے اور جتنے منھوں پر داڑھیاں باقی رہ گئی تھیں وہ بھی تشریف لے گئیں۔

عورتوں کے بالوں کی وضع غالباً لکھنؤ میں وہی ہوگی جو دہلی میں تھی۔ لیکن یہاں شاہی میں دولھنوں اور بناؤ چناؤ کرنے والی عورتوں کی چوٹیوں میں بڑے بڑے رنگین دوپٹوں کے موباف ہوتے جو خوب پیچ دے کے مؤخرِ دماغ سے کمر تک بٹ کے لٹکا دیے جاتے۔ اور زیادہ تکلف کے وقت اُن میں چوڑا (چُ

لپیٹ دیا جاتا اور معلوم ہوتا کہ بڑی بھاری موٹی چوٹی سرتا پا چاندی کی ہے۔ ماتھے پر محراب دار پٹیاں جمائی جاتین۔ اور اُنکے بیچ مین چاند ٹیکلی کے گرد سنہری یا روپہلی افشان اور ستارون سے نقش و نگار بنائے جاتے۔

ہاتھون پانوئن مین مہندی عورتون کے لیے لازمی تھی۔ مگر اُن کے ساتھ رنگین مزاج مَردون نے بھی کثرت سے مہندی لگانا شروع کردی تھی۔ جسکو دیکھ کے باہر والے لکھنؤ کے مَردون مین زنانہ پن پاتے اور اُن کا نام رکھتے۔

(۴) معاشرت مین چوتھی چیز اخلاق و عادات ہین۔ اس بات مین لکھنؤ والون نے خصوصیت کے ساتھ نمود حاصل کی۔ یہی چیز لکھنؤ مین خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ اور اسپر بحث کرنا سب سے زیادہ اہم ہے۔ دراصل لکھنؤ مین ایشیائی تہذیب کو انتہائی ترقی ہوگئی۔ اور کسی مقام کے لوگون مین معاشرت کے وہ قواعد نہین ملحوظ خاطر رہتے جن کے اہل لکھنؤ عادی ہوگئے ہین۔

تہذیب دراصل اُن اخلاقی تکلفات کا نام ہے جن کو کوئی قوم تقاضائے شرافت سمجھنے لگے۔ آج کل ہم اکثر لوگون کو یہ کہتے دیکھتے ہین کہ ملنے جلنے مین چنان و چنین اور معاشرت کے تکلفات ایک قسم کی فضول ریاکاری ہین۔ مگر یہ اُن کی غلطی ہے۔ یون تو فضول ریاکاری لباس اور بود و باش کا انتظام بھی ہے اور بہیمیت کی زندگی کو چھوڑ کے انسانیت کی زندگی اختیار کرنے کے تمام امور فضول ریاکاری کہے جا سکتے ہین۔ اصل یہ ہے کہ جن لوگون کو انسانی تہذیب نہین آتی اور مہذب لوگون سے ملنے کا سلیقہ نہین ہوتا انھون نے اپنے لیے عذرداری کا بہانہ اس بات کو قرار دے لیا ہے کہ ہمین شہر والون یا مہذب لوگون کی ایسی دکھاوے کی باتین نہین آتین۔ مگر غور کرو تو انسانیت ہی دکھاوا ہے۔ اچھا پہننا۔ اچھا سامان معیشت رکھنا۔ اچھا کھانا۔ اور ہر کام مین صفائی کا خیال کرنا۔ سب دکھاوا ہے۔

تہذیب اخلاق کا پہلا اصول یہ ہے کہ میل جول مین دوسرے کو ہر لطف اور نفع کی بات مین اپنے اوپر فوقیت دی جائے۔ اور آپ کو اُس کے پیچھے اور اُس سے ادنیٰ درجے پر رکھا جائے۔ کسی کی تعظیم کے لیے

اُٹھ کھڑا ہونا - اُس کے لیے صدر کی جگہ کو خالی کرنا - اور اُسے صدر مین بٹھانا۔ اُسکے سامنے ادب سے دوزانو بیٹھنا - اُس کی باتون کو توجہ سے سننا اور عاجزی کے لہجے مین جواب دینا - یہ سب باتین دوسرے کو اپنے اوپر فوقیت دینے کی ہین - اور یہ جس درجے تک وضعدار شرفاے لکھنؤ مین مروج تھین لکھنؤ کے عہد شباب کے زمانے مین اور کہین نہ تھین -

یہ تو وہ باتین ہین جن کو ملنے جلنے کے طرز عمل سے تعلق ہے - مگر یہی چیزین جب اخلاق و عادات مین پوری طرح پیدا ہو جاتی ہین تو انسان مین ایثار نفس کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے - اور وہ آمادہ ہو جاتا ہے کہ دوستون کے ساتھ ہر طرح کی رفاقت اور ہر بات مین اُن کی اعانت کرے - عہد شاہی مین یہ چیز اہل لکھنؤ مین پورے کمال کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی - اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہان کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے جن کا بظاہر کوئی ذریعۂ معیشت نہ تھا - اُن کے احباب ایسے مخفی طریقون سے اُن کی کفالت کرتے کہ کسی کو کبھی پتہ بھی نہ چل سکتا - اور ذرائع معاش کے مخفی رہنے کے باعث وہ سفید پوشی اور امیرانہ وضع کے ساتھ بڑے بڑے امیرون کی صحبتون مین شریک ہوتے اور کسی کے سامنے اُن کی آنکھ نیچی نہ ہوتی - لکھنؤ ایسے لوگون سے بھرا ہوا تھا کہ انقلاب سلطنت ہو گیا - اور یک بیک اُنکے بسر کرنے کے ذریعے مفقود ہو گئے -

امرا کے ایثار کی اس شان نے یہان شرافت کا یہی معیار قرار دے دیا تھا کہ دوسرون کے ساتھ ایسے اخلاق سے پیش آئین اور اُنکی خاطر داشت مین ایسی فیاضی دکھائین جس مین احسان رکھنے کا نام کو بھی شائبہ نہ ہو - دنیا کے تمام بڑے شہرون مین بڑے بڑے تاجر اور دولتمند موجود ہین - جو لاکھون روپیہ مستحقون کو دے ڈالتے ہین - مگر اُنکے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہی کہ ایک پیسہ بھی اُنھون نے بے غرضی سے نہین صرف کیا - بخلاف اسکے لکھنؤ والون کی دوست پروری اور شریف نوازی ایسی تھی کہ دُنیا کو دینے اور لینے والے مین کوئی فرق نہ نظر آتا -

اس مین شک نہین کہ جب بعد انقلاب سلطنت بڑے بڑے اُمرا مفلس

نادار ہوگئے۔ اور وہ گروہ جو مخفی ذرائع معاش پر بسر کر رہا تھا فاقے کرنے لگا تو امرا فیاضی و ایثار نفس کا جوہر دکھانے سے معذور ہو گئے۔ مگر ظاہری اخلاق جو سرشت مین داخل ہوگیا تھا ویسا ہی باقی رہا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگون کی یہ حالت ہوگئی کہ اپنی باتون سے تو اعلی درجے کی مہمان نوازی کی اُمید دلاتے ہین۔ مگر اُن کے مہمان ہوجیے تو اُسکے خلاف ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کو اکثر لوگون نے ریاکاری و لفاظی سمجھ رکھا ہے۔ مگر افسوس یہ ریاکاری نہین بلکہ حوصلہ مندی ہے جس کی استطاعت نہین۔ ایسے لوگون پر اعتراض نہ کیجیے بلکہ اُن کی حالت پر ترس کھائیے۔

لیکن اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ دولتمندی کے زمانے مین چونکہ شہر کی آبادی کا زیادہ حصہ امرا و شرفا اور احباب کی مخفی دستگیری پر بسر کر رہا تھا اُس کی وجہ سے محنت۔ جفاکشی۔ اور وقت کی قدر و قیمت جاننے کا مادہ علی العموم اہل لکھنؤ مین فنا ہوگیا۔ اور جو مشاغل اُنھون نے اختیار کیے وہ اُن کو ترقی قومی کی شاہراہ سے روز بروز دور کرتے گئے۔ اُنکے مشغلے لہو و لعب کے سوا کچھ نہ تھے۔ بیفکری اور فکر معاش سے سبکدوش ہونے نے اُنھین کبوتر بازی۔ بٹیر بازی۔ مرغ بازی۔ چوسر۔ گنجفے۔ اور شطرنج کا شائق بنایا۔ جن کامون پہ وہ آمدنی کا زیادہ تر حصہ صرف کرنے لگے۔ اور "اندیشۂ فردا" کے لفظ سے ساری آبادی نا آشنا تھی۔ کوئی امیر نہ تھا جو ان مزخرف کامون مین سے کسی ایک کا دلدادہ نہ ہو۔ اور اُسکے شوق نے اور بہتون کو بھی اس کام مین نہ لگایا ہو۔

عیاشی اور تماشبینی سے دنیا کا کوئی شہر خالی نہین۔ خصوصاً یورپ کی سی بدتمیزی اور بدسلیقگی کی عیاشی خدا نہ کرے کہ ہمارے شہرون مین پیدا ہو۔ لیکن لکھنؤ مین شجاع الدولہ کے زمانے مین رنڈیون سے تعلقات پیدا کرنے کی جو بنیا پڑی تو روز بروز اُسے ترقی ہی ہوتی گئی۔ امیرون کی وضع مین داخل ہوگیا کہ اپنا شوق پورا کرنے یا اپنی شان دکھانے کے لیے کسی نہ کسی بازاری حُسن فروش سے ضرور تعلق رکھتے۔ حکیم مہدی کا سا قابل، ہوشیار اور مہذب

وشایستہ شخص جو وزیر اعظم کے رتبے تک پہونچ گیا تھا اُس کی ترقی کی بنیاد پیارو نام ایک رنڈی سے پڑی۔ جس نے دھڑوٹ کی رقم اپنے پاس سے ادا کر کے اُسے ایک صوبے کی نظامت کا عہدہ دلوایا تھا۔ ان بے اعتدالیوں کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ لکھنؤ میں مشہور تھا کہ "جب تک انسان کو رنڈیون کی صحبت نہ نصیب ہو آدمی نہیں بنتا"۔ آخر لوگون کی اخلاقی حالت بگڑ گئی۔ اور ہمارے زمانے تک لکھنؤ مین بعض ایسی رنڈیان موجود تھین جن کے گھر مین علانیہ دربیا کی سے چلا جاتا۔ اور اُن کی صحبت مین رہنا معیوب نہ سمجھا جاتا۔ ہر تقدیر اس چیز نے ایک بڑی حد تک اُنکے عادات وخصائل بگاڑ دیے۔ گو کہ اسکے نتیجے مین اُنھین نشست و برخاست کا سلیقہ بھی آ گیا۔

رہے عورتون کے اخلاق وعادات۔ اس بارے مین ہمارا عام دعویٰ ہے کہ جن لوگون مین زناکاری کا شوق ہو اُن کی عورتین پارسا نہین ہو سکتین۔ تاہم اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ لکھنؤ مین عورتون کے اخلاق اتنے خراب نہین ہوے جتنے کہ مردون کے خراب ہوے تھے ملنساری اور اپنی ملنے والیون کے ساتھ ادب وتعظیم سے ملنا عورتون مین بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ مردون مین تھا۔ کسی زمانے مین چرخہ کاتنا شریف عورتون کا شریفانہ مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ اب اگرچہ سوت کی کلون نے اس مشغلے کو بالکل بیکار اور بے نتیجہ کر دیا۔ مگر شوقینی وامارت نے اس سے پہلے ہی یہ مشغلہ یہان کی عورتون سے چھڑا دیا تھا۔ یہان اُس کے عوض عورتون کو سینے پرونے۔ کاڑھنے۔ گھرون کی صفائی کا انتظام کرنے ماماؤن لونڈیون اور پیش خدمتون سے کام لینے اور بننے سنورنے کا زیادہ شوق تھا۔ اور بیویون کو گھر کے کامون اور شوہر اور بچون کے کپڑون سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ جن لہو ولعب کے کامون مین مرد مبتلا ہو گئے تھے اُن مین وہ بھی مبتلا ہون۔ درحقیقت اُس دور مین مرد گھرون مین بیٹھے کھیلا کرتے تھے۔ گھربار اور دنیا کا سارا کارخانہ فقط عورتون کے دم سے چل رہا تھا۔

مگر امیرون کے محلون مین جب سارا کاروبار ماماؤن۔ مغلانیون پیش خدمتون

اور انّاؤن کے ہاتھ مین ہو گیا تو عالی مرتبہ بیگمون کے سامنے مجرا کرنے کے لیے ڈومنیون کے طائفے ملازم ہوے۔ اور چونکہ محلون مین مستقل طور پر ڈومنیان نوکر تھین وہان شہر کی عام ڈومنیون کی جلد جلد آمد و رفت رہتی اور آئے دن وہ طبلہ سارنگی لیے ڈیوڑھی پر کھڑی ہی رہتین۔ اس لیے اُن کے سیکڑون طائفے شہر مین موجود تھے۔ ڈومنیون کا مذاق جہان تک مجھے معلوم ہے نہایت فحش اور بیہودہ ہوا کرتا ہے۔ اور اُن کی صحبت عورتون پر کوئی اچھا اثر نہین ڈال سکتی ہے۔ چنانچہ جس طرح مردون کی بداخلاقی کی باعث رنڈیان تھین عورتون کا اخلاق بگاڑنے کی باعث ڈومنیان ہو گئین۔

لیکن شرفا کے خاندان ڈومنیون کی صحبت سے بچے ہوے تھے اور اسلیے اُن کی عورتین اس مضرت سے بچی رہین جو عمدہ خصائل و اخلاق کا بہترین نمونہ ہین۔ لکھنؤ کی عورتون کا کیرکٹر ہے کہ وہ شوہر پر اپنی ہر چیز کو قربان کرنے کو تیار رہتی ہین۔ اپنی ہستی کو شوہر کی ہستی کا ایک ضمیمہ تصور کرتی ہین۔ اور بعض اور شہرون کی عورتون کی طرح جو خانہ داری کے سلیقے مین لکھنؤ والیون سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہین یہان کی عورتون کو کبھی یہ خیال نہین پیدا ہوا کہ اپنا روپیہ شوہر سے چھپا کے الگ جمع کرین اور شوہر کی بیماری مین بھی اپنی دولت صرف کرنے مین تامل کرین۔ لکھنؤ کی عورتین وہان کی عورتون کی سی ہنرمند نہین اور گھر گرستی کے کام مین اُن کے مقابل پھوہڑ ہین۔ حد درجے کی مُسرف ہین۔ چٹوری ہین۔ مگر شوہر کا ساتھ دینے اور اُس پر اپنی جان قربان کر دینے مین سب سے اول ہین۔

(۴۱)

(۵) معاشرت مین پانچوین چیز نشست و برخاست ہے۔ ہر متمدن قوم مین نشست و برخاست کے مختلف قوانین اور اصول موضوعہ ہوا کرتے ہین۔ اور اُنھین سے اُس قوم کی ترقی و تہذیب کا درجہ قائم ہوا کرتا ہے۔ اگر آپ عیسائیون کے متمدن شہرون پیرس۔ لندن اور برلن مین یا مسلمانون کے مہذب بلاد قسطنطنیہ۔ طہران اور شیراز مین جائیے اور وہان کے مہذب لوگون کی

صحبت مین شریک ہو جیئے تو نظر آئے گا کہ اُن مین نشست و برخاست کے اخلاقی قوانین کس قدر سخت ہین۔ مگر ہندوستان کے بڑے تاجرانہ شہرون مین آپ جائین اور وہان کے امرا و معززین سے ملین تو آپ کو اخلاقی قوانین تہذیب کا بالکل پتہ نہ چلے گا۔ مگر اُن شہرون مین جہان کوئی خاص دربار قائم ہے یا رہ چکا ہے۔ مثلاً حیدرآباد دکن بھوپال اور رام پور وغیرہ معزز وطنی دربارون کے قائم ہونے کی برکت سے عوام و خواص سب مین حفظ مراتب کے قواعد نظر آئین گے۔ بخلاف تاجرانہ شہرون کے جہان تمیزداری ادب اور حفظ مراتب کا نام و نشان بھی نہ ہوگا۔

دہلی مین اگلے دنون یہ اخلاقی اصول یقیناً سب جگہ سے زیادہ بڑھے ہوے ہون گے۔ اس لیے کہ وہان کا دربار سب سے بڑا تھا اور صدیون سے قائم چلا آتا تھا۔ مگر وہان تجارت پیشہ اقوام کے سوسائٹی پر غالب آنے کی وجہ سے اگلی ساری تہذیب خاک مین مل گئی۔ نشست و برخاست کی بنیاد امارت ریاست اور حکومت سے پڑتی ہے۔ حکومت و ریاست بتاتی ہے کہ چھوٹون کو بڑون سے اور بڑون کو چھوٹون سے کیونکر ملنا چاہیے۔ اور برابر والون سے کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔ مگر تجارت کو ان امارت کے چوچلون اور اخلاقی تکلیفون سے دشمنی ہے۔ وہ معاملت اور خود غرضی کے آغوش مین پلتی ہے۔ اور سلف سیکری نا کسر یعنی اپنے وقت اور اپنے روپے اپنے ہنر اور اپنی دولت کو بے وجہ کسی پر قربان کر دینے کو حماقت اور لغویت بتاتی ہے بخلاف اس کے ریاست کا جوہر یہ ہے کہ بے غرضی کے ساتھ اپنے طرفدارون یا قابل لوگون سے مراعات کیجائے اور اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ جہان تجارت کو فروغ ہوگا اور تاجرون کی معاشرت خوش باش امیرون اور شریفون کی معاشرت پر غالب آجائے گی وہان کوئی اخلاقی قانون نہین باقی رہ سکتا۔ چنانچہ اس چیز نے دہلی کے اگلے عظیم الشان دربارون کی ساری آن بان مٹا کے رکھ دی۔ اور وہ بات نہین باقی رہی جو اس کی ناموری کی تاریخ کے شایان تھی۔

دہلی کی تہذیب کو جب تاجرون کا ہجوم تباہ کرنے لگا تو اُس نے اپنے قدیم

وطن سے بھاگ کے لکھنؤ کے چھوٹے دربار میں پناہ لی جو اگرچہ چھوٹا تھا مگر اُسکی سواد میں داخل ہو کے بعد کسی کو نہ نظر آ سکتا تھا کہ دنیا میں یہاں سے بڑا کوئی اور دربار بھی ہے۔ پھر یہاں آزادی سے بیٹھ کے شرفائے دہلی نے اپنے قوانین نشست و برخاست کو برتنا شروع کیا تو چند ہی روز میں یہ حالت ہو گئی کہ اکیلا لکھنؤ ہی سارے ہندوستان میں تہذیب و شایستگی اور آداب نشست و برخاست کا مرکز تھا۔ اور تمام شہروں کے مہذب لوگ اہل لکھنؤ کی تقلید اور پیروی کر رہے تھے۔ ان مراتب کا قائم کرنا کہ کس شخص کا استقبال دروازے تک آ کے کرنا چاہیے۔ کس کے لیے فقط کھڑے ہو جانے کی ضرورت ہے۔ کس کے لیے نیم خیز ہو کے اور کس کے لیے اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے "آئیے۔ تشریف لائیے" کہدینا کافی ہے۔ زیادہ تر اپنے دلی فیصلے اور اجتہاد پر موقوف ہے اور اس اجتہاد کا جیسا ملکہ لکھنؤ کے مہذب شرفا کو حاصل ہے کسی کو نہیں۔

یہاں کوئی برابر والا آئے گا تو کھڑے ہو کے تعظیم دیں گے۔ اُس کے لیے بہترین جگہ خالی کریں گے۔ اور جب تک وہ بیٹھ نہ جائے گا خود نہ بیٹھیں گے۔ اُس کے سامنے ادب اور تمیزداری سے بیٹھیں گے۔ چہرہ بشاش رکھیں گے۔ تاکہ اُسکو کسی قسم کا تنغص نہ ہو۔ جب وہ کوئی چیز دے گا تو ادب سے تسلیم کر کے لیں گے۔ اس کا پورا خیال رکھیں گے کہ ہماری کوئی حرکت اُسے ناگوار نہ ہو۔ اور اُس کی صحبت میں کسی اور ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے تو اُس سے معذرت خواہ ہو کے اور معافی مانگ کے توجہ کریں گے۔ کہیں اُٹھ کے جانے کی ضرورت پیش آئے گی تو اُس سے اجازت لے کے جائیں گے۔ اگر اُس کے ساتھ جانے کی نوبت آئے تو راستے میں اُس کے پیچھے رہیں گے۔ اور اُسے آگے بڑھائیں گے۔ اصول تہذیب کی پابندی میں وہ بھی اصرار کریگا کہ "پہلے آپ تشریف لے چلیں"۔ لیکن اِدھر سے بار بار یہی کہا جائیگا کہ "جناب آگے تشریف لے چلیں۔ میں کس قابل ہوں" اور اگر وہ کسی طرح نہ مانے اور مجبور ہی کر دے تو شکر گذاری میں آداب بجا کے آگے قدم بڑھائیں گے بھی تو اس انداز سے کہ اُس کی طرف پیٹھ نہ ہو۔

اکثر لوگ ان آداب کا مضحکہ اُڑاتے ہیں اور ضرب المثل ہو گیا ہے کہ دو لکھنؤ والے "پہلے آپ" "پہلے آپ" کہتے رہے اور ریل چھوٹ گئی۔ چنانچہ دونوں اسٹیشن پر پڑے رہ گئے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر چیز کا اعتدال سے گذر جانا بُرا اور مضر ہو جاتا ہے۔ مگر کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آداب معاشرت کی نگہداشت اہل لکھنؤ کے اخلاق میں اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ اُنکے برتنے میں اُنھیں ضرر پہونچ جانے کا بھی خیال نہیں رہتا؟ جو لوگ تہذیب و شائستگی سے معرّیٰ ہیں جو اعتراض چاہیں لیکن ایک مہذب و شائستہ آدمی ان باتوں کو بجائے عیب کے اخلاقی جوہر تسلیم کرے گا۔

اب تو سب شہروں کی طرح یہاں بھی میز کرسیوں اور انگریزی فرنیچر کا رواج ہو گیا ہے مگر پہلے نشست فرش کی تھی جو حسب حیثیت و دولت قیمتی اور پُر تکلف ہوا کرتا۔ اگر کوئی ہمرتبہ غیر یا بزرگ اور واجب التعظیم شخص آ جاتا تو اُسے گاؤ کے آگے بٹھا کے سب لوگ حاضرین صحبت کی تعداد کے مطابق چھوٹا یا بڑا حلقہ باندھ کے مؤدب اور دو زانو بیٹھ جاتے۔ جس کسی سے وہ بات کرتا وہ شخص ہاتھ جوڑ کے نہایت ہی فروتنی سے جواب دیتا۔ اور اُسکے سامنے زیادہ باتیں کرنا یا اپنی آواز کو اُس کی آواز پر بلند کرنا اخلاقی جرم خیال کرتا۔

لیکن اگر سب برابر والے حریفان صحبت اور یاران ہم مذاق ہوتے تو نشست میں بے تکلفی رہتی۔ اور باوجود ہمرتبہ و ہم سن ہونے کے بے تکلفی پر بھی سب ایک دوسرے کا ادب کرتے۔ اس کا خیال رہتا کہ کسی کی طرف پیٹھ نہ ہو۔ اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے کسی کی سُبکی یا اُس کی عزت کرنے سے بے پروائی ثابت ہو۔ نوکر اور خدمتگار پاس یا اُس فرش پر نہ بیٹھ سکتے جس پر یاران صحبت بیٹھے ہوتے۔ وہ تعمیل احکام کے لیے سامنے ادب سے کھڑے ہوتے یا نظر سے غائب کسی قریب ہی ایسے مقام پر ٹھہرتے جہاں تک آواز پہونچ جائے اور اُن کا ہر وقت کھڑا رہنا یا زیادہ باتیں کرنا بد تمیزی سمجھا جاتا۔

وہ خاصدان یا حقہ لا کے لگاتے تو صاحب خانہ اپنے ہاتھ سے دوستوں کے سامنے بڑھاتا اور وہ اُٹھ کے اور تسلیم کر کے لیتے۔ بے تکلفی کی صحبتوں میں

خردوں کا بے ضرورت آنا نامناسب تھا۔ اگر کبھی ضرورت سے وہ آ جاتے تو باپ کے آگے وہ ستون کو نہایت ہی ادب سے جھک کے آداب بجا لاتے۔ اور اُنکے آتے ہی بزرگوں کی صحبت بے تکلف سے مہذب بن جاتی۔ اور جس طرح وہ خرد سب کی بزرگی کا ادب کرتا اُسی طرح بزرگ اُس کی خردی کا پاس کرکے اپنی بے تکلفیاں چھوڑ دیتے۔

یہاں کی صحبت میں روز کے ملنے والوں سے مصافحے یا معانقے کا رواج نہ تھا۔ مصافحہ مقتدایان قوم کی دست بوسی تک محدود تھا۔ اور معانقہ صرف اُن دوستوں کے لیے تھا جو کسی سفر سے واپس آئیں یا مدت کے بعد ملیں۔

زنانے میں مرد جاتے تو عورتوں کا احترام کرتے۔ اُنکے سامنے ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ بے تکلفی برتیں یا اُن میں زیادہ نشست رکھیں۔ میاں بیوی میں بے تکلفی لازمی تھی۔ لیکن گھر کی بزرگ عورتوں کے سامنے وہ بھی ہرگز بے تکلف نہ ہوتے۔ دیہات کے شرفا میں معمول تھا کہ نئی دُلھن جب تک چار پانچ بچوں کی ماں نہ ہو جائے گھر کی تمام عورتوں کے سامنے شوہر سے پردہ کرتی اور مجال نہ تھی کہ کوئی عزیز مرد یا عورت اُسے شوہر کے پاس یا شوہر کو اُس کے پاس جاتے دیکھ لے۔ یہ سختی شہر کے شرفا میں نہ تھی۔ شہر کے خاندانوں میں میاں بیوی ابتدا ہی سے ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے۔ مگر یہ معیوب تھا کہ ماؤں اور پیش خدمتوں کے سامنے بھی باہم بے تکلفی اختیار کریں۔

عورتوں کی باہمی صحبت سوا بڑے بڑے امیروں کے گھرانے کے نسبتہً بے تکلف رہتی۔ اُن میں مہمان آنے والی بیویوں کے ساتھ ایک معتدل درجے تک تکلف رہتا۔ مگر اُس تکلف کے ساتھ خلوص اور یکجہتی کا اظہار زیادہ ہوتا۔

(۴۲)

نشست برخاست ہی کے سلسلے میں ہمیں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ یورپ یا عرب و عجم کی طرح ہندوستان میں باہم ملنے جلنے اور لطف صحبت اُٹھانے کے لیے کلبوں اور سوسائٹیوں کا رواج نہ تھا۔ یورپ میں ہر جگہ ایسے کلب یا ایسی سوسائٹیاں قائم ہیں جن میں جا کے لوگ احباب اور ہم مذاق لوگوں سے

ملتے اور اُن کی صحبت سے لطف اُٹھاتے ہین - عربون - ایرانیون اور ترکون مین چاء خانے یا قہوہ خانے میل جول اور مبادلۂ خیالات کا ذریعہ بن گئے ہین جس طرح آپ دیکھتے ہین کہ جس جگہ دو چار انگریز ہوتے ہین وہان اپنا ایک کلب قائم کر لیتے ہین اور فرصت کے اوقات ہین وہان جا کے اخبار پڑھتے اور احباب سے ملتے ہین - اُسی طرح جس شہر مین ایرانیون اور عربون کی کافی تعداد ہوتی ہے وہان اُنکا کوئی چاء خانہ یا قہوہ خانہ کھُل جاتا ہے - اور اُس مین جس وقت دیکھیے اُن کا کوئی نہ کوئی گروہ ضرور موجود ہوتا ہے جو وہان چاء اور حقے پیتے - کھانے کھاتے اور ساتھ بیٹھ کے گپین اُڑاتے ہین -

بخلاف اسکے ہندوستان مین کبھی اس قسم کے کلبون یا چاء خانون کا رواج نہ تھا اور نہ آج تک ہے - سرکار انگریزی نے جا بجا شہرون مین اس مذاق کے پیدا کرنے کی کوشش کی - بڑے بڑے مصارف کا بار اُٹھا کے چاء خانے کھُلوائے - مگر کامیابی نہ ہوئی - آج سے تیس پینتیس سال پیشتر خاص لکھنؤ کے چوک مین میر محمد حسین صاحب مرحوم ڈائرکٹر زراعت و تجارت ریاست نظام نے حیدرآباد جانے سے پہلے گورنمنٹ کی اعانت سے ایک چاء خانہ کھُلوایا تھا جس مین فرنیچر بھی اچھا تھا - اور سوا ناجائز چیزون کے ہر قسم کے مشروبات تیار رہتے تھے - مگر کسی نے توجہ نہ کی - اور آخر میر صاحب کو نقصان اُٹھا کے اُسے بند کر دینا پڑا -

یہان کا پُرانا مذاق صحبت یہ ہے کہ ہر محلے مین یا آبادی کے ہر حلقے مین کوئی خوشحال یا دولتمند شخص اپنے گھر مین لوگون کے آنے اور اُٹھنے بیٹھنے کا سامان کرتا ہے - احباب کی تواضع و خاطر داشت کے لیے حُقّے پان وغیرہ ضروری چیزون کو وہ اپنے ذاتی صرف سے مہیا کرتا ہے - اور اُس کے ہم مذاق بلا ناغہ اور پابندی سے آتے ہین - دیر تک صحبت رہتی ہے - بذلہ سنجیان اور لطیفہ گوئیان ہوتی ہین - اور جب تک صحبت قائم رہے حقے پان سے تواضع ہوتی رہتی ہے - اور پھر ندیمان صحبت کے مذاق کے اعتبار سے اُن کی محفلون کا رنگ بھی بدل جاتا ہے - ارکان محفل اگر ادب اور شعر و سخن کا مذاق رکھتے ہین تو شاعری - نثاری - اور سخن فہمی و سخن سنجی کا چرچا رہتا ہے - اگر وہ علما و فضلا ہین تو عالمانہ مذاق کے ساتھ علمی

مباحث چھڑتے ہین - اگر مہذب امرا کی صحبت ہے تو وضع و لباس - سامان عیش
کھانے پینے - اور ہر چیز کے برتنے اور ہر مذاق کے اختیار کرنے مین انتہا درجے
کی نفاست و شایستگی اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ تمیزداری ظاہر کی جاتی ہے - اگر
رنگین مزاج عیاشون کی صحبت ہے تو اُس مین بازاری مہ لقائین بھی شریک
ہوتی ہین اور ناز آفرینی و ناز برداری کی ادائین نظر آتی ہین - یہ خیال رکھنا
چاہیے کہ یورپ کی طرح یہان مردون کی کسی صحبت مین شریف و پاکدامن
عورتین نہین شریک ہو سکتین - اور احباب کی محفل مین جب کوئی عورت نظر آجائے
تو یقین جان لیجیے کہ وہ عصمت فروش بازاری رنڈی ہے - اس کا نتیجہ یہ ہے کہ
یورپ کی صحبتون مین شریف و شایستہ عورتون کے شریک ہونے کی وجہ سے بازاری
عورتون کا درجہ اور مرتبہ سوسائٹی مین اس قدر گر گیا کہ کسی شریف خاندان کا
دروازہ ان کے لیے نہین کھل سکتا - اور نہ شرفا کے کلبون اور سوسائٹیون مین
وہ قدم رکھ سکتی ہین - بخلاف اسکے ایک حد تک سارے ہندوستان مین اور
اسی طرح لکھنؤ مین بازاری عورتون کو یہ رتبہ حاصل ہو گیا کہ مہذب و شایستہ
امرا کی محفلون مین اُن کے پہلو بہ پہلو بیٹھین - اور یہان اس مذاق مین یہان تک
ترقی ہوئی کہ بعض معزز رنڈیون نے بھی اپنے گھرون مین ایسی ہی نشست و برخاست
کی صحبتین قائم کر دین - جن مین جاتے بہت سے مہذب لوگون کو بھی شرم نہین آتی -
لکھنؤ مین چودھرائن - بی حیدر جان اور اسی پائے کی چند اور رنڈیون کے مکان
اچھے خاصے شرفا کے کلب تھے - جن مین صاحب محفل یعنی اُن بی صاحب کی
طرف سے حقے پان کی بخوبی خاطر کیجاتی - انگریزی مذاق نے اب اتنی اصلاح
ضرور کی ہے کہ اگرچہ طرح طرح کی نئی بداخلاقیان پیدا ہو گئی ہین مگر رنڈیون
کے گھرون مین علانیہ بیٹھ کے لطف صحبت اُٹھانا ذرا معیوب سمجھا جانے لگا ہے -

بہرحال لکھنؤ کے کلب خوش باش لوگون اور امیرون کے گھر تھے - یہان یہ
طریقہ نہایت ہی معیوب تھا اور اب تک ہے کہ ساجھے کی ہانڈی پکائی جائے - یا
حاضرین محفل چندہ دے کے اور اپنے اپنے دامون کا حقہ پان یا کھانا پانی ایک
ساتھ بیٹھ کے کھائین پیئین - یہان چندے کے ڈنر قوم کے لیے مایۂ شرم اور خلاف

شرافت تھے - اور یہان کی تمام دعوتین عام اس سے کہ خوشی کی تقریب مین ہون یا محض دوستانہ ہم صحبتی کے لیے فقط ایک شخص کی طرف سے ہوا کرتین - دوسرا اگر استطاعت رکھتا ہو تو اپنی طرف سے پوری دعوت دے سکتا ہے - یہ نہین کر سکتا کہ اپنی دعوت مین مجھ سے کھلانے کے پانچ روپے لے کے مجھے بھی شریک کر لیجیے -

دہلی کے تاجرون مین پتّی پڑنے کا رواج ہے - یعنی بہت سے تاجر ل کے چندہ جمع کرتے ہین اور اس رقم سے کوئی دعوت یا رقص وسرود کی صحبت کسی گھر مین یا باہر کی تفرج گاہون مین کی جاتی ہے - مگر ہمین یقین ہے کہ یہ طریقہ وہان کی تجارت نے زوال سلطنت کے بعد نکال لیا ہے - شرفاے دہلی کا یہ مذاق ہرگز نہ تھا - اس لیے کہ وہان کے شرفا مین ہوتا تو لکھنؤ مین بھی ہوتا - جو معاشرت مین دہلی کا شاگرد اور اُسی کے اگلے کھرے مذاق کا نام لیوا ہے -

(۶) صاحب سلامت اور مزاج پُرسی - آداب معاشرت مین چھٹی چیز جو سب باتون سے زیادہ اہم اور ضروری ہے سلام کرنا اور جس سے ملین اُس کا مزاج پوچھنا ہے - اسلام کا قدیم مذہبی اور سیدھا سادہ سلام السلام علیک - اور بہت سے لوگ ہون تو "السّلام علیکم" ہے - اسکے ساتھ ہی وہ لوگ اس سلام کے بعد ہر ملنے والے سے صبح کو ملین تو "صبحکم اللہ بالخیر" یعنی اللہ تمھاری صبح خیریت سے گذارے - اور شام کو ملین تو "مساکم اللہ بالخیر" کہا کرتے تھے - یہی سلام اور مزاج پُرسی عربون کی تھی جسے تعلیم دیتے ہوے وہ مغرب مین اُندلس تک چلے گئے - اور مشرق مین ہندوستان تک چلے آئے - یورپ مین یہی طریقۂ صاحب سلامت اُن سے اہل فرنگ نے سیکھا - اور مشرق مین ایرانیون - تورانیون - اور ہندوستانیون نے سیکھا - چنانچہ یورپ مین اصلی سلام جو اسلام کا خصیصہ تھا وہ تو غائب ہوگیا - فقط سلام کے بعد والی دعائین "صبحکم اللہ بالخیر" اور "مساکم اللہ بالخیر" باقی رہ گئین - اُنھین کا ترجمہ "گڈ مارننگ" اور "گڈ ایوننگ" آج تک ہم صاحب سلامت مین انگریزون کی زبان سے سنتے ہین - فرانسیسی مین "بون ہنین" "بون ژور" اور "بون سُوار" یعنی تمھاری صبح - دن - اور شام اچھی ہو کہا جاتا ہے - اس مین کوئی شک نہین کہ ان مغربی قومون کو صاحب سلامت کا یہ

سبق اندلس کے عرب فاتحوں سے ملا ہے۔

ہندوستان اور ایران مین چونکہ بزرگون کی پرستش کا رواج تھا اور یہ چیز ان مشرقی لوگون کے رگ و پے مین سمائی ہوئی تھی اس لیے خالی خولی "السّلام علیکم" کے الفاظ جو افرادِ قوم کی مساوات کو قائم کرتے تھے دولتمندون کو اپنے تکبّر اور اپنی نخوت کے جوش مین بہت پھیکے اور اپنی شان سے کم نظر آئے۔ خصوصاً جب یہان شاہنشاہی دربار قائم ہوا اور تاجدارون نے اپنی تعظیم و تکریم کرانے مین سارے اسلامی آداب کو مٹا دیا۔ درباریون کو اپنے سامنے اُسی طرح ہاتھ باندھ کے کھڑے ہونے اور اپنی تعظیم مین جھکنے کا حکم دیا جس طرح کہ بندے خدا کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہوتے اور رکوع و سجود کرتے ہین تو شاہی درباروں کی پیروی مین عام امرا اور دولتمندون نے بھی بجائے "السلام علیکم" کے دیگر تعظیمی الفاظ سلام کے لیے مقرر کیے۔ مثلاً "تسلیم" "کورنش" "آداب" "بندگی"۔ اور خود پرست و خدا فراموش امرائے اسلام کی برکت سے فی الحال یہ سب الفاظ ہمارے سلام ہین۔ عرب مین "السلام علیکم" کہنے کے ساتھ سوا خندہ جبینی کے اور کوئی حرکت نہین کی جاتی تھی۔ فقط سلام کے بعد ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا جاتا۔ مصافحے مین ہاتھ کو حرکت دی جاتی اور اُسی کے ساتھ "صبحکم اللہ بالخیر" یا "مساکم اللہ بالخیر" کہا جاتا۔ اس عربی طرز صاحب سلامت کی یادگار مین اب یورپ مین سر کی ایک خفیف حرکت کے ساتھ "گڈ مارننگ" وغیرہ کہتے اور ہاتھ کو ملا کے جھٹکا دیتے ہین۔ بخلاف اسکے ہندوستان مین اب پورا سلام یہ ہے کہ مذکورۂ بالا الفاظ کہنے کے ساتھ ہاتھ کو سر یا پیشانی پر رکھتے اور رکوع کے درجے تک یا اس سے کسی قدر کم جھکتے ہین یہ جھکنا اور پیشانی پر ہاتھ رکھنا خالص ہندوانہ اور مشرکانہ جذبات کی یادگار ہے ان دونون باتون مین اشارہ ہے کہ ہم آپ کے قدمون پر سر جھکاتے اور آپکے سامنے زمین بوس ہوتے ہین۔

اسی قدر نہین بادشاہون اور امیرون کے دربارون مین سلامون کی تعداد مقرر تھی۔ کہین سات سلام کیے جاتے اور کہین تین۔ عام بزرگون اور دوستون

سے ملنے مین ایک سلام کافی تھا۔ لکھنؤ مین چونکہ آداب وحفظ مراتب کا زیادہ خیال تھا اس سبب سے خُردون کا سلام بزرگون سے اور نیز متوسط درجے والون کا معزز لوگون سے یہ ہے کہ الفاظ مذکورہ مین سے کسی ایک کو زبان سے ادا کرنے کے ساتھ داہنے ہاتھ کو سینے یا چہرے کے سامنے تک اُٹھا کے کئی بار حرکت دیجائے خُردون کے لیے آج تک یہ نہایت ہی پسندیدہ اور سعادتمندانہ سلام ہے۔ یہ ہاتھ کو کئی بار حرکت دینا متعدد سلامون کا اشارہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اکثر لوگ تسلیم اور کورنش کو جمع کے صیغون مین استعمال کر کے کہتے ہین "تسلیمات" اور "کورنشات" یہ بھی سلام کے تعدد کی یادگار ہے۔

اب ہم مذکورۂ بالا مروجہ الفاظ سلام کے معنی اور اُنکی شان و اصلیت جدا جدا بیان کرتے ہین۔ تسلیم کے معنی عربی مین "سلام کرنا" ہین۔ بلحاظ ہر "السلام علیکم" کو چھوڑ کے فعل کا صیغہ استعمال کرنا لغو سا معلوم ہوتا ہے مگر دربار کی سوسائٹی مین یہ سمجھا گیا کہ بجائے سلام کرنے کے "مین سلام کر رہا ہون" کہنے مین زیادہ اظہار تعظیم ہوتا ہے۔ کورنش ترکی زبان کا لفظ ہے جو ترکی فاتحان ہند کے ساتھ یہان آیا۔ اس کے معنی سلام کے لیے جھکنے کے ہین۔ لہذا اس مین بھی جھک کے زمین بوس اور قدمبوس ہونے کا خیال موجود ہے۔ آداب فقط ادب کی جمع سلام کے محل پر اُسکے زبان پر لانے کا منشا یہ ہے کہ ادب و تعظیم کے جتنے طریقے ہین اُن سب کو بجا لاتا ہون۔ بندگی۔ یہ تمام الفاظ سلام سے زیادہ ذلیل اور مشرکانہ لفظ ہے۔ بندگی کے معنی پوجنے اور عبادت کرنے کے ہین۔ سلام مین اس کا منشا اسکے سوا اور کوئی نہین ہو سکتا کہ مین حق عبودیت بجا لاتا ہون۔ جو مسلمانو کے عقائد کی رُو سے خدا کے سوا اور کسی کے مقابل نہین کہا جا سکتا۔

بخلاف ان ہندوستانی سلامون کے عرب مین جو الفاظ "السلام علیکم" کہے جاتے ہین اُن کا لغوی ترجمہ یہ ہے کہ "تم پر سلامتی" یا صاف اُردو مین یون کہ "تم سلامت رہو" یعنی سلام کرنا دراصل ہر ملنے والے کو سلامتی کی دعا ہے۔ اسلام نے اس پر ترقی یہ کی کہ "سلام" خدا کا پیام ہے جو رسول خدا صلعم نے مسلمانون کو پہونچایا۔ اور قیامت تک آپ کا یہ پیام ہر مسلمان دوسرے مسلما

کو پہونچتا رہے گا۔ السلام علیکم مین سلام پر جو الف لام لگا ہوا ہے اُس سے صاف اسی جانب اشارہ ہے کہ وہی سلام جو حضرت رسالت کا پیام ہے تم کو پہونچے۔

اسلام کی اصلی سلام کے ان معنون اور اسکے مقصد کو سمجھ کے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ سلام قومی مساوات کا خیال دلانے اور تمام پیروان رسالت محمدی مین قومیت و اخوت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ مگر افسوس مسلمانون نے اُسکو چھوڑ دیا۔ اور ہمارا فضول تنخر اب ہمین یہ خیال دلاتا ہے کہ کسی معمولی مسلمان کا ہم سے ملتے وقت السلام علیکم کہنا ہماری توہین کرنا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ شیعہ سُنّی کے اختلاف نے چونکہ یہ شان پیدا کر دی ہے کہ دونون بجاے ایک قوم بننے اور ایک جماعت ثابت ہونے کے ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز رہنا چاہتے ہین۔ عوام ہی نہین دونون فریقون کے متاخر علما و مصنفین تک نے اپنے اپنے فریق کو دوسرے کے عادات و اطوار سے نفرت کرنے کا سبق دیا ہے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب و عجم تک مین تو شیعہ و سُنّی دونون کا سلام "السلام علیکم" تھا مگر ہندوستان خصوصاً لکھنؤ کے شیعون نے السلام علیکم کو سنیون کے سر مار کے اپنے لیے "سلامٌ علیکم" کے الفاظ مخصوص کر لیے ہین۔ وہ زیارت ائمہ پڑھنے مین تو وہی پرانے الفاظ مثلاً "السلام علیک یا ابا عبد اللہ علیہ السلام" کہتے ہین مگر ملنے جلنے والون سے جب صاحب سلامت کرتے ہین تو کہتے ہین "سلامٌ علیکم"۔ اس لیے کہ "السلام علیکم" سنیون کا سلام ہے۔

تاہم زیادہ تر یہ اگلا عربی سلام سُنّی اور شیعہ دونون مین مذہبی لوگون کے لیے مخصوص ہو گیا ہے یا مذہبی شان و وضع مین داخل ہے۔ ورنہ اُمرا کی سوسائٹی مین "آداب" و "تسلیم" کا عام رواج ہے۔ بندگی بھی اکثر لوگ کہتے ہین مگر یہ لفظ عورتون مین زیادہ مروّج ہے۔

لکھنؤ مین پرانا مہذب اور شائستہ لوگون کا سلام یہ تھا کہ چھوٹا بڑے سے یا غریب امیر سے نہایت جُھک کے تسلیم یا آداب کہے۔ جواب مین بزرگ خوردون سے کہین "جیتے رہو" "بڑے ہو" "صاحب اقبال ہو"۔ امرا غریبون کے لیے

بغیر جھکے فقط ہاتھ اُٹھا دین یا ہاتھ اُٹھانے کے ساتھ اُنھین الفاظ تسلیم و آداب و تسلیم کا اعادہ کر دین یا بندگی کہدین۔ مگر برابر والون کا طریقہ جواب کو یئے مین یہ تھا کہ راہ چلتے مین صاحب سلامت ہو تو اُسی طرح جُھک کے تسلیم یا آداب کہین۔ اور اگر کسی محفل مین بیٹھے ہون تو پوری طرح اُٹھ کھڑے ہون اور جھک کے جواب دین۔

سلام کے بعد ایک دوسرے سے کہے "مزاج شریف" یا "مزاج اقدس" یا "مزاج عالی" "یا مزاج مبارک" یا "مزاج معلّٰے" اور دوسرا ہاتھ جوڑ کے کہے "دعا کرتا ہون"۔ تقریبًا سارے ہندوستان مین مہذب و شایستہ لوگون کا طریقۂ سلام و مزاج پُرسی یہی ہے۔ مگر لکھنؤ مین اور چند شہرون مین جہان ہندوستانی ریاست قائم ہے اور کوئی دربار موجود ہے اُن طریقون کے ادا کرنے مین زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور اس مین کمی ہونا بدتمیزی خیال کی جاتی ہے۔

مگر اب چند روز سے خصوصًا لکھنؤ مین عوام اہل حرفہ اور ادنے طبقے والون مین اگلے دربار اور اُسکے آداب کے مٹ جانے سے "السلام علیکم" کہنے کا بہت رواج ہو گیا ہے۔ خدا کرتا اُمرا بھی اسکی پیروی کرتے اور اونے و اعلےٰ کا امتیاز بالکل اُٹھ جاتا۔

(۴۳)

(۷) طرز کلام۔ آداب معاشرت مین ساتوین اہم چیز گفتگو اور طرز کلام ہے۔ دُنیا مین ہر شخص کی شایستگی اور ادبی قابلیت کا پہلا اندازہ اُسکے الفاظ اور اُسکے انداز گفتگو سے ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر اقبالمند قوم سب سے پہلے اپنی زبان کی اصلاح کرتی اور اُسے ترقی دیتی ہے۔

تہذیب و شایستگی کا تقاضا یہ ہے کہ زبان پر کردہ و فحش الفاظ نہ آئین۔ جو الفاظ و خیالات مخاطب کو ناگوار گذرین اُس کے سامنے زبان سے نہ نکلین اور اگر کبھی ناگوار مضامین کے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش بھی آئے تو وہ ایسے الفاظ اور ایسے عنوان سے ادا کیے جائین کہ مخاطب کو گران نہ گذرین اور اگر گران گذرین بھی تو اُن کی گرانی مین ایک گونہ گوارائی و لطف پیدا ہو جائے

...ن بارۂ خاص مین اہل زبان لکھنؤ اور یہان کے شایستہ لوگون کو جو کمال
...اصل ہے ہندوستان کے اور کسی شہر والون مین نہ نظر آئے گا۔ اگرچہ موجودہ
...تعلیم و تہذیب نے ایک حد تک یہ خوبی ہر جگہ انداز گفتگو مین پیدا کر دی ہے
...ر انگریزی اثر سے معرّے کر کے دیکھیے تو بالذات یہ شایستگی و شستگی زبان
...اہل لکھنؤ ہی کا حصہ نظر آئے گی۔
باہر کے لوگ اس کا یہان تک لوہا مانے ہوے ہین کہ لکھنؤ والون کے
...سامنے گفتگو کرتے جھیپتے اور جس قدر شایستگی اُن مین ہے اُسکو بھی بھول جاتے
...ہین۔ اور اسکے بعد جب اپنی صحبتون مین بیٹھتے ہین تو یہ کہکے اپنی کمزوری کا
...الزام دُور کرتے ہین کہ "ہم سادگی سے صاف صاف باتین کرتے ہین اور ہمین
...لکھنؤ والون کی سی چنان چنین نہین آتی"۔ مگر دراصل یہ عذر بدتر از گناہ ہے
...مین نے ایرانیون کو دیکھا کہ اُن کے سامنے ہندوستانی بات کرنا بھول جاتے
...ہین۔ انگلستان مین دیکھا کہ فرانسیسیون کے سامنے انگریزون کی زبان سے
...ایک لفظ نکلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عربون کی طلاقت لسانی کی کبھی
...یہ حالت تھی کہ اُنکے سامنے غیر ملک والون کی زبان نہ کھُل سکتی تھی۔ اور
...عرب لوگون کا خیال ہو گیا تھا کہ "زبان خدا نے فقط ہم کو دی ہے۔ اور ساری
...دُنیا ہمارے مقابل گونگی ہے"۔ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ ماسوا عرب کے تمام دُنیا
...کے لوگون کو وہ "عجم" کہتے۔ جس کے لغوی معنی گونگے کے ہین۔ بعینہ یہی حال
...ہندوستان مین ہر شہر کے لوگون کے مقابل لکھنؤ والون کا ہے کہ وہ فصاحت و
...بذلہ سنجی مین سب کو دبا کے صحبت پر چھا جاتے ہین۔ اور اپنے سامنے کسی اور کو
...زبان نہین کھولنے دیتے۔
شایستگی زبان مین سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مخاطب کو کن ضمائر سے یاد
...کیا جائے۔ اور سب زبانون مین مخاطب کے لیے دو ضمیرین ہین۔ ایک واحد کی
...اور ایک جمع کی۔ اور معزز مخاطب کے لیے واحد کی جگہ ہر زبان مین تعظیماً جمع کی
...ضمیر استعمال کی جاتی ہے۔ فارسی مین واحد مخاطب کی ضمیر "تو" ہے اور جمع کی
..."شما"۔ عربی مین واحد کی "ک" اور "اَنت" اور جمع کی "کُم" اور "انتم"۔ انگریزی

ہین "یو" کے لفظ سے معزز شخص مخاطب کیا جاتا ہے ۔ منجملہ ان سب زبانون
کے اُردو مین مخاطب کے لیے واحد کی تو ایک ہی ضمیر "تو" ہے مگر جمع کی دو ضمیرین
ہین "تم" اور "آپ" ۔ اور ان تینون ضمیرون کے لیے مخاطب کا درجہ اور مرتبہ
مقرر ہے ۔ ایک بہت ادنی شخص کو "تو" کہین گے ۔ اوسط درجے کے لوگون
مین جو ذرا امتیاز رکھتا ہو اُسے اور اپنے خُردون کو "تُم" کہین گے ۔ اور جو ہر مرتبہ
معزز و تعلیم یافتہ شریف ہو اُسے "آپ" کہین گے ۔ اگرچہ معزز درجے کے لوگ
کبھی بے تکلفی مین اپنے اقران و امثال اور اپنے ہم سِنون کو بھی "تم" کہنے لگتے ہین
مگر جن لوگون سے بے تکلفی نہ ہو اُن کو تم کہنا اُردو مین خصوصاً اہل لکھنؤ مین اخلاقی
و ادبی جُرم ہے ۔

اُردو زبان مین اور خاص لکھنؤ والون مین مخاطب کے اتنے ہی درجے
نہین بلکہ ان سے بھی بڑھ کے بہت سے الفاظ ہین جن کا شرفا و معززین کے
مقابلے مین استعمال کرنا لازمی ہے ۔ جناب ۔ جناب والا ۔ جناب عالی ۔ حضرت
حضرت والا ۔ حضور ۔ حضور والا ۔ حضور عالی ۔ قبلہ ۔ قبلۂ و کعبہ ۔ سرکار ۔
اور اسی قسم کے چند اور الفاظ اُردو مین معزز مخاطب کی نسبت حسب درجہ
استعمال کیے جاتے ہین ۔ جو لکھنؤ والون کی زبان پر چڑھے ہوے ہین اور اُن کا
صحیح استعمال جس قدر اہل لکھنؤ جانتے ہین اور کسی دوسرے شہر کے لوگ نہین
جانتے ۔

ہمارا دعوے ہے کہ اتنے تعظیمی الفاظ خطاب دُنیا کی کسی زبان مین نہین
ہین ۔ ہندوستان مین وہ زمانہ گذر گیا جب اُردو یہان کی تمام زبانون کی
ادب آموز تھی ۔ اور اب وہ اُردو کی شاگردی سے آزاد ہو کے سب زبانین
کوس لمن الملکی بجا رہی ہین ۔ بنگالی ۔ پنجابی ۔ گجراتی ۔ سندھی ۔ مرہٹی ۔ کنڑی ۔
تلنگی وغیرہ سب کو اپنی ادبی ترقی و فصاحت کا دعویٰ ہے ۔ مگر ہم مذکورہ
ہندوستانی زبانون کو اور اُنکے ساتھ ساری دنیا کی مشہور زبانون فارسی ۔
عربی ۔ انگریزی اور فرانسیسی کو بھی چیلنج دیتے ہین کہ اگر ان کو اُردو سے
زیادہ ادبی وسعت و فصاحت کا دعوے ہے تو مخاطب کے لیے اپنی لُغتون مین

اتنے لفظ نکال دیں جتنے کہ اُردو میں موجود ہیں۔ سچ یہ ہے کہ باوجود اپنی کم عمری اور اپنے محدود رقبۂ تصرف کے اُردو چند ہی روز میں شائستگی۔ لطافت۔ اور مناسبات علم مجلس کے اعتبار سے اس درجۂ کمال کو پہونچ گئی تھی جو دنیا کی کسی زبان کو نہیں حاصل ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اُردو کسی ملک کسی صوبے کسی گروہ کسی مذہب کی زبان نہ تھی۔ بلکہ یہ وہ زبان تھی جو شاہی دربار سے شروع ہو کے ہندوستان کے ہر شہر میں مہذب و شائستہ لوگوں۔ ستھری صحبت والوں۔ صاحبانِ علم و فضل۔ شاعروں اور ادب و اخلاق کے شیداؤں کی زبانوں پر جاری ہوگئی تھی۔ لہذا اس کی بنیاد ہی تہذیب و شائستگی کے ہاتھوں سے پڑی۔ اور آخر تک ستھرے مذاق والوں اور شیدایانِ سخن کے ساتھ مخصوص رہی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اُردو بولنے والوں کی مجارٹی کسی صوبے میں نہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہر جگہ کے مہذب و شائستہ لوگ اُس کے بولنے والے ہیں۔ یہ پیدا اسی لیے ہوئی تھی کہ ہندوستان میں ایک اعلیٰ درجے کی اور ساری دنیا سے زیادہ شائستہ سوسائٹی پیدا کر دے۔ مگر بدنصیبی سے انگریزی دَور میں جب مغربی معاشرت و ادب نے جگہ پکڑی تو ہندوستانیوں کے باہمی اور قدیم فطری تعصبات نے یہ رنگ دکھایا کہ مسلمان اس پر ناز کرنے لگے کہ ہماری زبان ہے اور ہندوؤں نے یہ خیال کر کے کہ اس زبان میں ہم مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اُسے مسلمانوں ہی کے سر مارا اور دامن جھٹک کے علیٰحدہ ہو گئے۔ اس سے اُردو کو نقصان پہونچا۔ اور روز بروز زیادہ نقصان پہونچے گا۔ مگر باوجود اسکے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو رسیلا پن۔ جو ادبی خوبیاں اس میں ہیں نہ نئی پیدا کی ہوئی ہندی زبان میں ہیں اور نہ ہندوستان کی کسی اور زبان میں۔

انگریز ہوں یا عرب۔ افغانی ہوں یا ایرانی جب اُردو بولتے ہیں تو مخاطب کے لیے سوا "تم" کے اور کوئی لفظ اُن کے خیال میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس قسم کا اور کوئی لفظ جو "تم" سے زیادہ شائستہ و ترقی یافتہ ہو اُن کی زبان میں موجود ہی نہیں ہے۔

انگریزی میں خطاب کے اور الفاظ ہیں مثلاً یور آنر۔ یور اکسلنسی۔ یور ہائنس

یور مجسٹی وغیرہ - مگر وہ اعلیٰ درجے کے امرا اور بادشاہون کے لیے خاص ہین۔ اُن کے سوا اور کسی کی نسبت نہین استعمال کیے جا سکتے - اس قسم کے مختص الاشخاص الفاظ اُردو مین بھی ہین - مثلاً جہان پناہ - صاحب عالم - مرشدزادہ - نواب صاحب - نواب زادہ - صاحبزادہ - یہ خاص اعلیٰ طبقے کے لوگون کے خطابات ہین - جن کے ساتھ جناب یا حضور کے الفاظ ملا کے خطاب کیا جا سکتا ہے - اور غالباً اس قسم کے مخصوص خطابات ہر زبان مین موجود ہون گے - مگر مذکورۂ بالا تعظیمی الفاظ جو اُردو زبان مین ہر معزز و شایستہ انسان کی نسبت استعمال کیے جا سکتے ہین اُردو کے سوا کسی اور زبان مین نہین نظر آتے۔

مزاج پرسی کو دیکھیے - ہر زبان مین اس کے لیے معمولی الفاظ ہین مگر اُردو مین ادب و احترام کی نگہداشت کے لیے - مزاج عالی - مزاج مبارک - مزاج اقدس - مزاج مقدس - مزاج معلّی وغیرہ کہکے معزز مخاطب کی خیریت دریافت کرتے ہین - یہ الفاظ اگرچہ اب ترقی اُردو کے ساتھ ہر جگہ اور ہر شہر مین پھیل رہے ہین مگر اُن کے استعمال مین جو اجتہادی ملکہ شرفاے لکھنؤ کو حاصل ہے اور کسی جگہ کے لوگون کو نہین نصیب ہو سکتا۔

شرفاے لکھنؤ مین ایک خاص بات یہ ہے کہ "ش" "ق" درست رہنگے اور تمام عربی حرفون کو حتی الامکان اُن کے اصلی مخرج سے ادا کرین گے - فارسی ترکیبون مین اضافت نمایان طور پر ادا کی جائے گی - علما اور ذی علم لوگون سے باتین کرین گے تو عربی و فارسی الفاظ کو زیادہ استعمال کرین گے - اور اُن صحیح تلفظ سے ادا کرین گے - اطبا سے گفتگو ہوگی تو عربی کے طبی مصطلحات گفتگو مین لائین گے - جاہل نوکرون اور عوام سے بات کرین گے تو عربی الفاظ بچین گے - عورتون سے بات چیت ہوگی تو اُن کے مذاق کے محاورون اور ...
کو گفتگو مین صرف کرین گے۔

خُرد بزرگ سے - ادنیٰ اعلیٰ سے - یا عامی عالم سے گفتگو کرے گا تو ہر لفظ اور ہر فقرے مین ادب و تعظیم کا خیال رکھے گا - آواز مناسب درجے تک پست اور نیچی رہے گی - اسی طرح بزرگ خُردون سے - اعلیٰ طبقے والے ادنیٰ

ہے۔ علما عوام سے بات کرین گے تو اُن کے لہجے۔ اُنکے انداز اور اُنکے الفاظ مین شفقت ومحبت کے جذبات مضمر ہون گے۔

ان باتون کا لحاظ رکھنے اور مذکورۂ بالا ادب وتعظیم کے الفاظ وضمائر استعمال کرنے سے اہل لکھنؤ کی زبان اس قدر شایستہ اور شستہ ورفتہ ہو گئی ہے کہ یہان کے عوام اور جُہلا دوسرے شہرون کے اکثر شعرا وفصحا سے زیادہ اچھی اُردو بولتے ہین۔ اور جو شایستگی وتمیزداری اُن سے ظاہر ہو جاتی ہے کسی اور مقام کے قابل وذی علم لوگون سے بھی نہین ظاہر ہو سکتی۔ مگر افسوس لکھنؤ مٹتا جاتا ہے۔ اب یہان بیرونی لوگون کا ایسا طوفان بے تمیزی بپا ہے۔ یہان کے شایستہ لوگ اس طرح بیکار ہو کے کونے مین مٹھ گئے ہین۔ اور قانونی آزادی نے جہلا وعوام کو اس درجہ بیباک وبدتمیز بنا دیا ہے کہ یہ تمام ادبی خوبیان خاک مین مل رہی ہین اور چند روز بعد شاید اُن کا پتہ بھی نہ ہو۔

(۴۴)

(۸) آداب معاشرت مین آٹھوین چیز طریقۂ مذاق ہے۔ عرب کا پُرانا مقولہ بلکہ مشہور حدیث نبویؐ ہے کہ "کلام مین ظرافت ویسی ہی ہے جیسے کھانے مین نمک" سچ یہ ہے کہ شوخی وظرافت کے بغیر نہ کلام مین مزہ پیدا ہوتا ہے اور نہ صحبت مین جان پڑتی ہے۔ مگر اُسی ظرافت مین اگر بے احتیاطی ہو جائے تو وہی سخت فتنۂ وفساد کا باعث ہو جاتی ہے ظرافت نے باتون باتون مین اکثر تلوار چلوادی ہے۔ اور پُرانے جانی دوستون کو گھڑی بھر مین دشمن بنا دیا ہے۔ غور سے دیکھو تو صاف نظر آ جائے گا کہ ان خرابیون کا باعث ظرافت نہین بلکہ ظرافت مین بے احتیاطی کرنا یا اعتدال سے باہر ہو جانا ہوا کرتا ہے۔

جو زبان جتنی زیادہ ترقی کرتی ہے اُسی قدر اُس مین مذاق وظرافت کے پہلو بڑھتے جاتے ہین۔ کلام مین ظرافت جن طریقون سے پیدا ہو جاتی ہے اُن کا محصور کرنا بہت دشوار ہے۔ صدہا طریقے ہین جن سے ایک فصیح البیان شخص اجتہادی طور پر فائدہ اُٹھا لیا کرتا ہے۔ اور اُن کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب چاہیئے۔ ہمین اس موقع پر فقط اس قدر کہنا ہے کہ زیادہ تر بناے ظرافت ایسے

الفاظ ہوا کرتے ہین جو مختلف معنی رکھتے ہون - اور بعض معنون سے کسی پر تعریض ہوتی ہو- اور کبھی ظرافت مین ایسے الفاظ سے بھی کام نہین لیا جاتا بلکہ کسی انسان یا چیز کو کسی ایسی شے سے تشبیہ دی جاتی ہے جو با وجود غیر تناسب ہونے کے مشابہ ہو- پھر اُس تشبیہ کو ایسے عنوان اور پہلو سے ادا کرتا کہ اُس مین بعوض تشبیہ کے استعارے کی شان پیدا ہو جائے - علی ہذا القیاس کبھی اپنے آپ کو یا کسی اور کو اس قدر بڑھاتا یا اتنا گھٹاتا کہ اصلی درجے سے بہت دُور ہو جائے -ان سب باتون کے لیے سلیقے کی ضرورت ہے - اچھا سلیقہ رکھنے والا سخت سے سخت تعریض کر جاتا ہے اور ناگوار سے ناگوار تشبیہ دے دیتا ہے مگر کسی کا دل میلا نہین ہوتا - یا کسی کو اظہار ناگواری کی گنجایش نہین ملتی - بخلاف اسکے اگر کسی بد سلیقہ شخص نے یہ کام کرنا چاہا تو لوگ بگڑ کھڑے ہوتے ہین اور عداوت پر آمادہ ہو جاتے ہین - اس کا جیسا اچھا سلیقہ لکھنؤ کے عوام الناس کو ہے اور جگہ کے خاص لوگون مین بھی نہین نظر آتا -

ایک بنگالی عالم ڈاکٹر اگھور ناتھ ہے جو بڑے عالم و فاضل - فلسفے مین یکتاے روزگار - لٹریچر کے ڈاکٹر اور اُردو کے اچھے ماہر تھے زبان اُردو پر اعتراض کرنے کے عنوان سے مجھ سے کہا" صاحب یہ کون سی زبان کی خوبی ہے کہ ایک دفعہ مین نے ایک صحبت مین کہا - ہم آج کل دودھ پیا کرتے ہین - اس پر سب لوگ بیساختہ ہنس پڑے"۔ مین نے کہا اُردو کا یہی اعلیٰ درجے کا حُسن ہے -آپ چونکہ اس زبان مین ناقص ہین اس لیے آپ کو بجاے اپنے عیب کے یہ زبان کا عیب نظر آیا ہر زبان مین ذو معنی لفظ ہوا کرتے ہین - اور زباندانون کا کام یہ ہے کہ تمام ذم کے پہلو دن کو بچاکے لفظون کو استعمال کیا کرین - انگریزی مین لفظ" کنسیو" کے معنے خیال کرنے کے بھی ہین اور حاملہ ہونے کے بھی - ایک مشہور لاٹ صاحب نے پارلیمنٹ مین تین بار کہا" آئی کنسیو" اور آگے سوچنے لگے - کسی نے پکار کے کہدیا جناب نے تین بار آئی کنسیو کہا اور ہوا کچھ نہین - یعنی تین بار حمل رہا اور پیدا کچھ نہ ہوا - اسپر سب نے قہقہہ لگایا اور وہ لاٹ صاحب جھینپ گئے - اسی طرح اُردو مین ہزارہا الفاظ ہین جن مین مختلف پہلو نکلتے ہین - بولنے والا اُنکے استعمال کا صحیح سلیقہ نہ رکھتا

ہوگا تو بات بات پر ہنسا جائے گا۔

یہی مذکورۂ بالا "دودھ پینے" کا جملہ ہے۔ ہندوستان میں "دودھ پینا" شیرخوار بچون کا کام ہے۔ اور کسی عاقل بالغ کے لیے کہنا کہ "یہ دودھ پیتے ہیں" عیب ہونے کے علاوہ اِن معنون میں مستعمل ہوتا ہے کہ یہ ابھی ناسمجھ اور ناواقف ہیں۔ اس پہلو کے بچانے کے خیال سے اہل لکھنؤ یہ کبھی نہ کہیں گے کہ "میں دودھ پیتا ہوں" بلکہ اس مضمون کو یہ عیب کا پہلو بچا کے مختلف عنوانوں سے ادا کریں گے۔ کہیں گے کہ "میں آج کل دودھ کو استعمال کرتا ہوں" "آج کل میری غذا دودھ ہے" "دودھ چاول کھاتا ہوں"۔ لکھنؤ والوں کی ان احتیاطوں کو دیکھ کے آگرے کے ایک قابل و زبان دان شاعر کو دھوکا ہوا کہ لکھنؤ کی زبان دودھ کھانا ہے دودھ پینا نہیں۔ لکھنؤ کے ایک صاحب سے اُن سے اس بارے میں اختلاف ہوا۔ اور حَکَم کے طور پر مجھ سے دریافت کیا گیا۔ میں نے کہا "دودھ پینے کی چیز ہے۔ کوئی اُس کی نسبت کھانے کا لفظ کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ذم کا پہلو بچانے کے لیے اہل لکھنؤ" دودھ پینے کا لفظ اپنی نسبت استعمال نہ کریں گے۔

ایک اسی محاورے پر منحصر نہیں اُردو میں صدہا الفاظ میں مختلف محاورون اور معنون کی وجہ سے ذم کے پہلو پیدا ہوگئے ہیں۔ اور ہر اہل زبان کا کام ہے کہ اُن سے بچے۔ یا کوئی شخص کسی کی نسبت مذاقاً استعمال کر جائے تو اُس کا فرض ہے کہ سمجھے اور جواب دے۔ ورنہ سمجھ لیا جائے گا کہ وہ زبان سے ناواقف ہے۔

اہل لکھنؤ میں شوخی و ظرافت بہت ہے۔ وہ اپنے کلام میں صدہا عنوانون سے ظرافت پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ اور جو اس فن میں جتنا زیادہ کمال رکھتا ہے اُتنا ہی زیادہ اہل سخن کی محفلوں میں چمکتا اور ممتاز ثابت ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اور مقامات کے لوگون میں یہ ملکہ نہیں ہے اور کثرت سے ہے۔ اور اب اُردو زبان سارے ہندوستان میں اس طرح ترقی کر رہی ہے کہ ہر جگہ اعلیٰ درجے کے ظریف پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور سخن دانی و سخن فہمی کا شعور بڑھ رہا ہے مگر لکھنؤ والون میں یہ ملکہ طبیعت ثانیہ بن کے اُن کی فطرت و جبلت

بن گیا ہے۔ اور لطافت کلام کے ساتھ بذلہ سنجی و ظرافت مین جیسا بے تکلف
اور ستھرا مذاق اُن کا نظر آئے گا اَوروں کا نہین ہو سکتا۔
(۹) آداب معاشرت ہین نوین چیز شادی اور غمی کی محفلین ہین بسلمانون
کی اگلی دولتمندی و حکومت نے اُن کی عورتون کی ارمانین بمقابل اکثر مقامات
کے یہان بہت بڑھا دی ہین۔ ولادت سے لے کے شادی تک لڑکے کی ہر
خوشی و کامیابی ایک تقریب بن جاتی ہے۔ پیدایش کے بعد ہی چھٹی چلّہ اور
درمیان کے نہان۔ عقیقہ۔ کھیر چٹائی۔ دودھ بڑھائی۔ بسم اللہ۔ ختنہ۔ اور
سب سے بڑھ کے عقد نکاح۔ یہ سب بجائے خود شادی کی تقریبین ہین۔ اکثر
بچون کی سالگرہ ہوا کرتی ہے۔ مذکورہ تقریبون کے علاوہ غسل صحت یا کسی خاص مقصد
کے پورے ہونے پر بھی خوشی کی غیر معمولی تقریبین ہو جاتی ہین۔
ان سب تقریبون مین قرابت والی بیویان اور پاس پڑوس کی بہت سی شناسا
عورتین جمع ہو جاتی ہین۔ زنانی محفلین مرتب ہوتی ہین جن مین تختون کے چوکون
پر اور زیادہ مہمان ہوے تو زمین پر دری چاندنی کا اُجلا فرش بچھتا ہے۔ دولتمند
گھرون مین چاندنی پر تین طرف یا فقط صدر مین پُر تکلف قیمتی قالین بچھتے ہین۔
کنول اور مردنگین روشن ہوتی ہین۔ اور ڈومنیون کا طائفہ سامنے بیٹھ کے مجرا
کرتا ہے۔ ناچنے والی ڈومنی گھونگھرو باندھ کے ناچتی اور بھاؤ بتاتی ہے مجرے
کے درمیان مین وقتاً فوقتاً ڈومنیان ہنسانے والی نقلین کرتی ہین۔ بہرحال مسرت
کے ولولے اور خوشی کے چہچہے ہوتے ہین۔ اور ڈومنیان اگرچہ مجرے مین اکثر بے
اعتدالیان کرنے لگتی ہین اور صحبت مین بیحیائی و بے شرمی کو بڑھا دیتی ہین مگر نشست
برخاست کے سلیقے۔ بیویون کے باہمی ربط و ضبط۔ اور اُسکے ساتھ حفظ مراتب
مین کوئی فرق نہین آنے پاتا۔ ہر تقریب کے متعلق صدہا رسمین ہین جن کا انجام
پانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اُن رسمون کی محافظ اور برقرار رکھنے والی بڑی بوڑھی
عورتین اور اُنکے ساتھ ڈومنیان ہوا کرتی ہین۔ جن کو اُن رسمون کے بہانے بہت
کچھ مل جاتا ہے۔
اکثر تقریبون مین رتجگا ضرور ہوا کرتا ہے۔ اور یہی ایک چیز ہے جو ہندوستانی

عورتوں کے اعتقاد میں خالصۃً لوجہ اللہ ہے۔ اور جس میں ڈومنیاں "اللہ میاں کی سلامتی" کا نغمہ گاتی ہیں۔ شب زندہ داری ہوتی ہے۔ مگر عبادت کے لیے نہیں بلکہ گانے بجانے رات بھر دھما چوکڑی مچانے اور صبح ہوتے مسجد میں جا کے اللہ میاں کا طاق بھرنے کے لیے۔ جن کی نذر کے لیے گلگلے اور خدا رحم مخصوص چیزیں ہیں۔ ان تقریبوں میں یہی کارروائی دیہات میں بھی ہوا کرتی ہے مگر وہاں بدتمیزی و بدسلیقگی ہوتی ہے تو شہر والیوں میں نفاست۔ صفائی، خوش ترتیبی۔ اور شائستگی۔

(۴۵)

جن شادی کی تقریبوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور اُن کی زنانی محفلوں کی ایک عام تصویر گذشتہ موقع پر دکھا دی ہے اُن کی مفصل تشریح یہ ہے کہ چھٹی اُس تقریب کا نام ہے جبکہ زچگی کے بعد ماں اور بچے کو پہلی دفعہ نہلایا جاتا ہے۔ زچہ کو تیز گرم پانی سے نہلانا ایک طبی علاج ہے۔ مگر یہ غسلِ ولادت چونکہ ایک خوشی کے موقع پر ہوتا ہے۔ اس لیے اُس کو نہایت اہمیت دی جاتی ہے۔ اور چونکہ عموماً زچگی کے چھٹے روز یہ پہلا نہان ہوتا ہے اس لیے اس کا نام ہی چھٹی پڑ گیا۔ اور اس میں زچہ بڑے اہتمام سے نہلائی جاتی ہے۔ پھر بچہ نہلایا جاتا ہے۔ اور اُسکے بعد تمام عورتیں جو مہمان ہوتی ہیں یکے بعد دیگرے سب نہاتی ہیں۔ زچہ اور بچے کے لیے نئے بھاری جوڑے حسب حیثیت تیار کیے جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی سب عورتیں کپڑے بدلتی ہیں۔ اس نہان میں جو طرح طرح کی رسمیں برتی جاتی ہیں وہ بے حد و بے شمار ہیں۔ اور غالباً ہر شہر و قریے بلکہ ہر خاندان میں کلیۃً یکساں اور جزءً مختلف اور نئی ہیں۔

دولھن کے میکے یا دیگر اعزا کی طرف سے اس موقع پر زچہ اور بچے کے جوڑے طوق۔ ہنسلی اور کڑے۔ ننھے بچے کے قابل کھلونے جھنجھنے۔ چھوٹے۔ ان کے ساتھ مرغیاں اور خدا جانے کیا کیا چیزیں بڑی دھوم دھام جلوس اور باجوں کے ساتھ آتی ہیں۔ زنانے میں رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔ اور اتنی استطاعت نہ ہو تو خود گھر والی عورتیں ڈھول سامنے رکھ کے گا بجا لیتی ہیں۔

یہی شان بعد کے دو نہانون یعنی بیسوین اور چلّے کے نہانون کی ہوتی ہے۔اگر خدا نے اطمینان دیا ہے تو دونون موقعون پر محفل عیش ونشاط گرم ہوتی ہے۔ورنہ فقط چلّے کے نہان مین زیادہ دھوم دھام ہوتی ہے۔اور بیسوین کے نہان کی تقریب معمولی ہوتی ہے۔

عقیقہ مسلمانون کی خالص مذہبی رسم ہے جس کا آغاز بنی اسرائیل کے زمانے سے آل ابراہیمؑ مین چلا آتا ہے۔یہود پیدائش کے آٹھوین دن بچے کو مسجد اقصیٰ مین لے جاکے اُس کا سر مُنڈاتے اور قربانی کرتے تھے۔اور اُن کا مقتدا خاص طریقون سے اُس کے لیے برکت کی دعا کیا کرتا تھا۔یہی طریقہ مسلمانون مین بھی رسم ابراہیمیؑ اور سنتِ محمدیؐ کی حیثیت سے آج تک جاری چلا آتا ہے۔اگرچہ اب ولادت کے بعد آٹھوین دن عقیقے کی قید اُٹھ گئی ہے مگر اکثر بچے کی عمر کے پہلے ہی سال مین ہوجایا کرتا ہے۔اس مین بچے کو نہلا کے نئے کپڑے پہنائے جاتے ہین۔اور اسکے بعد اعزا و احباب کے مجمع مین نائی اُس کا سر مونڈتا ہے۔اور جیسے ہی وہ سر مین اُسترا لگاتا ہے بچہ اگر لڑکا ہے تو دو اور لڑکی ہے تو ایک بکرا قربانی کیا جاتا ہے۔مُنڈ جانے کے بعد سر مین صندل لگایا جاتا ہے۔اعزا و اقارب حسب حیثیت بچے کو کچھ رونمائی دیتے ہین۔قربانی کا گوشت غربا اور اعزا مین تقسیم کردیا جاتا ہے۔اور گھر مین خوشی کا جلسہ ہوتا ہے۔اور اُسی قسم کی محفل مرتب ہوجاتی ہے جیسی کہ اور تقریبون مین ہوتی ہے۔

کھیر چٹائی۔ اس تقریب سے بچے کو دودھ کے علاوہ اور غذاؤن کے دینے کا آغاز ہوتا ہے جو اکثر اُسوقت ہوا کرتی ہے جب بچہ چار پانچ مہینے کا ہوچکتا ہے۔اکثر گھرون مین غذا کا آغاز کھیر سے کیا جاتا ہے۔جو خاص اہتمام سے پکائی جاتی ہے اور خاص طور پر قرابت دار رفاقتون کی موجودگی مین بچے کو چٹائی جاتی ہے۔جبکہ وہ نئے کپڑے پہنے ہوتا ہے۔اور سب بیویان ترقی عمر کی دعاؤن کے ساتھ اُسکے ہاتھ مین روپے دیتی ہین۔اور وہی محفل طرب قائم ہوجاتی ہے جو ہر تقریب مین نظر آتی ہے۔

دودھ بڑھائی۔ یہ تقریب اُس موقع پر ہوتی ہے جب بچے کا دودھ چھڑایا جا

ہے۔ اس میں عموماً کھجوریں پکائی جاتی ہیں تاکہ بچہ اگر دودھ کے لیے ضد کرے تو بہلانے کے طور پر اُس کے ہاتھ میں دیدی جایا کریں۔ مگر عموماً رواج ہے کہ اتنی مقدار میں پکائی جاتی ہیں کہ جن جن گھروں سے حصہ داری ہے اُن میں تقسیم بھی ہو سکیں۔ دودھ کے چھڑانے کا عام طریقہ یہ ہے کہ ماں یا مُرضعہ کی چھاتیوں میں پانی میں گھول کے ایلوا یا اور کوئی کڑوی چیز لگادی جاتی ہے جس کی کڑواہٹ سے گھبرا کے بچہ دودھ چھوڑ دیتا ہے۔ اور جب پینے کے لیے ضد کرتا اور بہلانے نہیں بہلتا تو پھر یہی کارروائی کی جاتی ہے۔ اور دو ایک دفعہ میں اُسے دودھ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ دودھ بڑھائی کا زمانہ علی العموم اُس وقت ہوتا ہے جب بچہ دو سال کا ہو جائے۔ حنفیوں میں مدت رضاعت اڑھائی برس ہیں۔ یعنی اڑھائی برس کے بعد دودھ چھڑانا لازمی ہے لیکن رواج اس سے کم ہی زمانے کا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض عورتیں تین تین چار چار سال دودھ پلاتی رہتی ہیں۔ مگر یہ بات عموماً نفرت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اس لیے کہ شرع کے خلاف ہے۔ اس تقریب میں بھی جن گھروں کو خدا نے استطاعت دی ہے اُن میں بہت اچھی چہل پہل ہو جاتی ہے۔ اور رقص و سرود کی محفل گرم ہوتی ہے۔

بسم اللہ۔ یہ تقریب اُس دن ہوتی ہے جس روز لڑکے کو پہلے پہل پڑھنے کے لیے بٹھاتے ہیں۔ اور اُس کا زمانہ از روے رسوم مروجہ وہ خیال کیا گیا ہے جب بچہ چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہو جائے۔ اور اس چار کے عدد نے اس تقریب میں اس قدر خصوصیت پیدا کر لی ہے کہ چار سال چار مہینے چار دن کے بعد چار گھنٹے اور چار منٹ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ وقت مقررہ پر کوئی محترم مولوی صاحب یا کوئی بزرگ خاندان لڑکے کو جو نہلا دُھلا کے اور نئے کپڑے پہنا کے دولھا بنا دیا جاتا ہے۔ پڑھانے کے لیے لے کے بیٹھتے ہیں۔ الف بے کی کتاب اُس کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور بسم اللہ کہلا کے وہی کے دعائیہ الفاظ "رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر" کہلاتے ہیں۔ جن کے معنی یہ ہیں کہ "خداوندا آسان کر اور دشوار نہ کر۔ اور خیریت سے ختم کر۔" پھر الف بے کہلا کے مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔

عزیز و قریب لڑکے کو حسب توفیق دیتے ہین - اور اُس دن سے اُس کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے -

ختنہ - یہ بھی سنتِ ابراہیمی اور آلِ ابراہیمؑ کی پرانی اور ضروری رسم ہے - اور چونکہ ہندوستان مین صرف مسلمانون کے ساتھ مخصوص ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کارروائی کے بعد سے لڑکا مسلمان ہو جاتا ہے اس لیے اس رسم کا عام نام ہی "مسلمانی" پڑ گیا ہے - اس مین بچے کے عضو مخصوص کے مُنہ پر کی کھال کاٹ لی جاتی ہے - جس کا کاٹنا طبی اور ڈاکٹری اصول سے بھی بعض امراض و شکایات سے بچنے کے لیے نہایت مفید ہے - یہ ایک قسم کا اپریشن ہے جس کو ہمارے قدیم سرجن (جراح) جو عموماً نائی ہوتے ہین نہایت خوبی اور غیر معمولی پُھرتی سے انجام دیتے ہین - اُنکو اچھا معاوضہ اور انعام دیا جاتا ہے - اور اس رسم کے انجام دیتے وقت مردانے مین اکثر اعزا و احباب بُلا کے بٹھالیے جاتے ہین اور زنانے مین مہان بیویون کا مجمع ہوتا ہے - ختنہ ہوتے ہی مٹھائی تقسیم ہوتی ہے - جن کو استطاعت ہوتی ہے دعوت کرتے ہین - اور پھر اُس روز خوشی کی تقریب ہوتی ہے - جب زخم اچھا ہونے کے بعد لڑکا غسل صحت کرے - اکثر خاندانون اور منت مراد والے گھرانون مین اس روز لڑکا دولہا بنا کے گھوڑے پر چڑھایا جاتا ہے - اور برات بڑے جلوس اور دھوم دھام کے ساتھ کسی درگاہ مین جاتی ہے جہان چادر اور مٹھائی چڑھا کے لڑکا اُسی شان سے گھر واپس آتا ہے - جہان خوشی کے چہچہے اور عیش و شادمانی کے جلسے نظر آتے ہین اس رسم کے ادا ہونے کا زمانہ مختلف ہے - بعض لوگ چھٹی یا چلے ہی مین بچے کا ختنہ کرا دیتے ہین - مگر عام رواج اُس وقت ہے جب لڑکا چھ سات برس کا ہو جائے -

ایک اور تقریب روزہ کشائی کی بھی ہے - یہ اُس وقت ہوتی ہے جب لڑکا یا لڑکی نو دس برس کی عمر کو پہونچ جائے - اور اُسے پہلے پہل روزہ رکھوایا جائے - اس مین علی العموم بہت سے روزہ دارون کی دعوت کی جاتی ہے جن کے لیے کثرت سے افطاریان تیار کی جاتی ہین - اور لڑکا اُن کے ساتھ بیٹھ کے فطار

کرتا ہے۔ اور لڑکی ہے تو زنانے مین مہمان روزہ دار بیویون کے ساتھ روزہ کھولتی ہے۔ اس مین گانا بجانا کم ہوتا ہے۔ مگر شوقین اور رنگین مزاج لوگون کے لیے یہ بہانہ بھی محفل رقص وسرود گرم کرنے کے واسطے کافی ہوجاتا ہے۔

اسی قسم کی کارروائیان غسل صحت کی تقریبون اور منت مراد پوری ہونے کے موقعون پر ہوا کرتی ہین۔ اور سوا اُن خاص باتون کے جو اُس تقریب سے تعلق رکھتی ہون باقی سب باتین اُن مین بھی وہی ہوتی ہین جو اور تقریبون مین بیان کی گئین۔

سب سے بڑی اور اہم تقریب شادی یا عقد نکاح ہے۔ یہ وہ ضروری تقریب ہے جس کی بے اعتدالیون کی بدولت سیکڑون خاندان تباہ وبرباد ہوتے چلے جاتے ہین۔ اور وجہ یہ کہ خوشی کے جوش اور شاد آرزو سے ہمکنار ہونے کی محویت مین کسی کو نہ اپنی حالت واستطاعت کا خیال رہتا ہے نہ اپنے انجام وتآل کار کا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرض لے کے۔ جائدادین بیچ کے۔ دوستون اور عزیزون سے مانگ کے۔ یا جس طرح کوئی رقم مل سکے فراہم کر کے ارمانین پوری کی جاتی ہین۔ اور شادی کے ختم ہوتے ہی یہ حالت ہوتی ہے کہ اکثر گھرون مین فاقے کی نوبت آجاتی ہے۔

شادی اور نکاح چونکہ انسانی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے اس لیے اسکو ہم ذرا زیادہ تفصیل وتشریح سے بیان کرنا چاہتے ہین۔ شادی کی نسبت اکثر مشاطاؤن کے ذریعے سے ٹھہرتی ہے۔ ہندوستان کے تمام بڑے شہرون مین خصوصاً اُن مین جہان اگلے تمدن نے ترقی کی تھی عورتون کا ایک خاص پیشہ ہے مشاطہ گری۔ شعرا کے کلام اور لغت مین مشاطہ اُس عورت سے مراد ہے جو عالی مرتبہ خاتونون کے کنگھی چوٹی کرتی۔ کپڑے اور زیور پہناتی۔ اور اُنھین بنا چُنا کے سنوارتی اور آراستہ کرتی ہے۔ مگر سوسائٹی مین مشاطہ اُن عورتون کو کہتے ہین جو شادی کے پیام لیجاتی۔ نسبتین ٹھہراتی اور شادیان کراتی ہین۔ غالباً اس پیشے کی ابتدا اُنھین عورتون سے پڑی جو حسینون کو بنایا سنوارا کرتی ہین اور آخر مین شادی ٹھہرانے والی عورتون کا نام مشاطہ پڑ گیا۔ یہ بڑی چالاک

اور مکار عورتین ہوا کرتی ہین - ہر لڑکے کا پیام جب کسی گھر مین لیجاتی ہین تو اسکی دولتمندی - تعلیم - سعادتمندی - خوش اخلاقی اور خوبصورتی کی اس قدر لطف کرتی ہین کہ لڑکی والون کی نظر مین اُسے مثنوی میر حسن کا شاہزادۂ بے نظیر ثابت کیے بغیر دم نہین لیتی ہین - اسی طرح جب کسی لڑکی کی بات لڑکے والون کے یہان لے جاتی ہین تو اُسکے حسن و جمال - ناز و انداز - اور خوبی و رعنائی کے بیان مین ایسے نقشے باندھ دیتی ہین کہ معلوم ہوتا ہے جس لڑکی کا ذکر کر رہی ہین وہ انسان نہین کوہ قاف کی پری یا شاہزادی بدر منیر ہے -

مشاطہ کی پیام رسانیون کے بعد اگرچہ تحقیق و جستجو مرد ہی کرتے ہین مگر نسبت ٹھہرنے مین زیادہ دخل دونون گھرون کی عورتون ہی کو ہوا کرتا ہے جو اپنا اطمینان کر کے مردون کی رضامندی حاصل کرتی ہین - اور نسبت ٹھہر جاتی ہے - دونون خاندانون مین بچون کے پیدا ہوتے ہی ارمان بھری مائین نسبت ٹھہرا لیا کرتی ہین اُنا کے لیے مشاطہ کی ضرورت نہین پیش آتی - بلکہ دولھا کو بے عقل و عشق کھٹکے کی منگی دُلھن مل جاتی ہے - اور شادی سے پیشتر کی رسمین جن کو نسبت ٹھہرنے سے تعلق ہے اُن کی نوبت نہین آتی - گویا پیدا ہوتے ہی منگنی ہو جاتی ہے -

نئے گھرون مین جب پیام جاتا ہے تو اکثر لڑکا اپنے چند عزیزون اور مخصوص دوستون کے ساتھ "بَرِدِکھوّا" کے نام سے دولھن والون کے وہان بلایا اور ایسی جگہ بٹھایا جاتا ہے جہان سے عورتین بھی اُسے تاک جھانک کے دیکھ سکین گھر والے مرد جمع ہو کے اُس سے ملتے اور حسب حیثیت خاطر مدارات کرتے ہین - اسی طرح لڑکے کی مان بہنین ایک مقررہ تاریخ پر دولھن کے گھر مین جاتی اور مٹھائی کھلانے یا کسی اور بہانے سے دولھن کا چہرہ دیکھتی ہین جو عام طور پر اُن سے چھپائی اور پردے مین رکھی جاتی ہے - مگر بعض شریف گھرون مین دولھا نہین بلایا جاتا بلکہ خاندان کے مرد کسی نہ کسی عنوان سے لڑکے کی لاعلمی مین اُسے دیکھتے اور اُس کا حال دریافت کر لیتے ہین - اور یونہین لڑکی کی حالت کا بھی پتہ لگا لیا جاتا ہے -

ان طریقون سے جب لڑکے والے لڑکی کو اور لڑکی والے لڑکے کو پسند کر لیتے ہین جس مین صورت شکل۔ حالت وحیثیت کے علاوہ شرافت خاندان کو بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے تو منگنی کی رسم عمل مین آتی ہے۔ اُس مین دولھا کی طرف سے مٹھائی جاتی ہے۔ پھولون کا گہنا جاتا ہے اور ایک سونے کی انگوٹھی جاتی ہے جسے بعض گھرانون مین دولھا کی عزیز عورتین خود جا کے پہناتی ہین۔

منگنی کی رسم ادا ہو جانے کے بعد سمجھا جاتا ہے کہ نسبت ٹھہر گئی۔ اور اُس وقت سے دونون جانب معمول ہو جاتا ہے کہ جب کوئی تقریب ہو تو سمدھیانے مین خاص اہتمام سے حصے جائین۔ اور جو حصہ لڑکے یا لڑکی کے لیے ہوتا ہے وہ بڑا ہوتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ مُشَیَّن و باوقعت بنا دیا جاتا ہے۔ اسی اثنا مین اگر محرم آ گیا تو دونون جانب سے اہتمام اور تکلیف کے ساتھ گوٹا۔ الائچیان۔ چکنی ڈلیان۔ اور اعلیٰ درجے کے کارچوبی اور ریشمی بٹوے سمدھیانے مین بھیجے جاتے ہین۔

برات یعنی نکاح کے دن سے چند روز پہلے دولھن مانجھے بٹھا دی جاتی ہے جبکہ اُسے مانجھے کا زرد جوڑا پہنایا جاتا ہے۔ اُس وقت سے روز اُس کے ابٹنا لگتا ہے۔ اور بجز خاص ضرورتون کے وہ پردے سے باہر نہین نکلتی جس دن وہ مانجھے بیٹھتی ہے اُسی روز رسم ہے کہ اُس کا جھوٹا بٹنا۔ اُسکی چھوٹی مہندی مصری کا کوزہ۔ اور بہت سی پنڈیان ایک شاندار جلوس اور باجے کے ساتھ دولھا کے گھر بھیجی جاتی ہین۔ جو پنڈیان خاص دولھا کے لیے ہوتی ہین وہ جداگانہ خوانون مین ممتاز و مخصوص ہوتی۔ اُنھین کے ساتھ دولھا کے لیے مانجھے کا زرد بھاری جوڑا۔ ایک رنگی ہوئی منقش چوکی۔ اور لوٹا۔ کٹورا بھی ہوتا ہے۔ لوٹا کٹورا چوکی پر ناڑے سے کس کے باندھ دیے جاتے ہین۔ اور جلوس مین یہ چیزین اس ترتیب سے ہوتی ہین کہ باجے والون اور جلوس کے بعد سب کے آگے چوکی ہوتی ہے۔ اُسکے بعد خوانون مین دولھا کی مخصوص چیزین ہوتی ہین جو عموماً کچے طباقون مین رکھی ہوتی ہین۔ اور اُن کے بعد بہت سے خوانون مین عام قسم کی پنڈیان ہوتی ہین۔ دولھن کی چھوٹی بہنین اور ڈومنیان فینس اور ڈولیون پر

سوار ہوکے جاتی ہین - جو دولہا کے گھر پہونچ کر ایک پینڈی اور مصری کے سات سات ٹکڑے کرکے وہ سب ٹکڑے دولہا کو ڈھکا ڈھکا کے کھلاتی ہین - اس رسم کی نسبت قیاس کیا جاتا ہے کہ خالص ہندی رسم ہے جس کو نہ عرب سے تعلق ہے نہ عجم سے - اس لیے کہ مانجھے اور اُسکے ساتھ کنگنے کی ابتدا ہندوستان کے سوا اور کسی جگہ نہین ثابت ہوتی -

مانجھے کے دس بارہ روز سے زیادہ زمانہ گذرنے کے بعد اُسی شان و شوکت اور جلوس کے ساتھ دولہا کے گھر سے دولھن کے یہان سانچق جاتی ہے - سانچق ترکی لفظ اور ترکی رسم ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ ترک و مغل اس رسم کو اپنے ساتھ ہندوستان مین لائے - اس مین دولہا کے یہان سے دولھن کے لیے چڑھاوے کا جوڑا جاتا ہے جو عموماً بہت بھاری اور کارچوبی ہوتا ہے اسکے ساتھ دولھن کے لیے سنہری منقش کا سہرا - چاندی کا چھلا - سونے کی انگوٹھی دو ایک اور چیزین ہوا کرتی ہین - اور وہ زیور ہوتا ہے جس کو پہنا کر وہ رخصت کی جائے گی - اور پھولون کا گہنا ہوتا ہے - جوڑے کے ساتھ شکر کے نقل شکر کے قرص - اور میوہ جاتا ہے - سانچق کے لیے خاص اہتمام سے منقش اور رنگین گھڑے تیار کرائے جاتے ہین - پھر بانس اور کاغذ کے رنگا رنگ تختون مین چار چار گھڑے لگا کے چوگھڑے بنا دیے جاتے ہین - اور دولتمندی و امارت کی شان کے مناسب ان چوگھڑون کی تعداد بڑھتی جاتی ہے - اور اکثر سو سو دو دو سو کے شمار کو پہونچ جاتے ہین - مگر اُن کے اندر چند گنتی کے نقلون یا پاؤ آدھ سیر شکر کے سوا کچھ نہین ہوتا - اُنکے منھ گھڑون پر عموماً سوہے کا کپڑا ناڑے سے بندھا ہوتا ہے - اور جلوس مین اُن سب گھڑون کے آگے چاندی کی ایک دہی کی مٹکی رہتی ہے جس مین دہی بھرا ہوتا ہے - اور اُسکے منہ پر بھی سوہا ناڑے سے باندھ دیا جاتا ہے - اور اُسکے گلے مین مبارک فالی کے لیے دو ایک مچھلیان بھی بندھی ہوتی ہین - یہ چیزین جب دولھن کے گھر پہونچتی ہین تو اعزا و اقارب مین تقسیم ہوتی ہین -

ساچق کے دوسرے ہی روز شب کو دولھن کے گھر سے بڑے جلوس اور روشنی کے ساتھ مہندی جاتی ہے - خیال کیا جاتا ہے کہ غالباً یہ عربی الاصل رسم ہے - اس میں دراصل دولھن والوں کی طرف سے دولھا کے لیے وہ جوڑا جاتا ہے جسے پہن کر وہ بیاہنے کو آئے گا - اس جوڑے میں علی العموم قدیم عہدِ مغلیہ کے درباری وضع کا خلعت - شملہ - جیغہ - سرپیچ اور مرصع کلغی ہوتی ہے - نصیب ہوا تو اس کے ساتھ موتیوں کا ہار بھی بھیجا جاتا ہے - مذکورہ چیزوں کے علاوہ ریشمی پائجامہ اور جوتا وغیرہ معمولی چیزیں بھی ہوتی ہیں - اکثر ایک طلائی انگوٹھی بھی جاتی ہے - اس جوڑے کے ساتھ دولھا کے لگانے کے لیے پسی ہوئی تیار مہندی بھی بھیجی جاتی ہے - جس کو بہت سے طباقوں میں پھیلا کے رکھتے ہیں - اور اس میں سبز و سرخ شمعوں کو نصب کر کے روشن کر دیتے ہیں - اس طرح کے مہندی کے بہت سے طباق روشن ہوتے ہیں جو مہندی کے جلوس میں ایک خاص شان اور آن بان پیدا کر دیتے ہیں - مہندی کے ان روشن طباقوں کے ساتھ سوپچاس طباقوں میں ملیدہ ہوتا ہے جو خرموں کو کوٹ کے بنایا جاتا ہے - اور جیسی حیثیت ہوتی ہے اسی کے متناسب کثرت سے بھیجا جاتا ہے - اس موقع پر جوڑے کے ساتھ دولھا کے لیے سونے کا سہرا بھی بھیجدیا جاتا ہے -

مہندی کے دوسرے دن دولھا کی طرف سے برات جاتی ہے - برات جانے کا اگلا ضروری وقت پہر رات رہے یعنی تین بجے شب کا تھا - لیکن اب یہ وقت اکثر چھوٹتا جاتا ہے - اور بجائے پہر رات رہے کے پہر دن چڑھے یعنی نو دس بجے صبح کو براتیں جانے لگی ہیں - اس تاخیر کی ابتدا واجد علی شاہ آخری بادشاہ اودھ کے زمانے سے ہوئی - ان کی برات جانے میں اتفاقاً دیر ہو گئی اور دن نکل آیا تھا - لوگوں نے آسانی اور روشنی کے سامان کی تخفیف کے خیال سے اسی وقت کو اختیار کرنا شروع کر دیا - چنانچہ اب عموماً ابتدائے روز میں برات جاتی ہے اور دوپہر کو عقد ہو جاتا ہے -

برات میں حتی الامکان پورا جلوس جمع کیا جاتا ہے - مروجہ تین باجے

یعنی پرانا ڈھول تاشے اور جھانجھین - روشن چوکی - اور ارگن باجا - ضرور ہوتے ہین - اس سے ترقی ہوئی تو گھوڑون پر نوبت - نقارہ - جھنڈیان - برچھے بردار ہاتھی - اونٹ - گھوڑے - اور اس سے بھی زیادہ حوصلہ ہوا تو انھین باجون کے متعدد گروہ بڑھا دیے جاتے ہین - دولھا وہی جوڑا پہن کے جو سہدی کے ساتھ آیا تھا - اور سہرا باندھ کے علی العموم گھوڑے پر اور اعلیٰ طبقے کے امرا کے یہان ہاتھی پر سوار ہو کے سارے جلوس اور باجون کے پیچھے آہستہ آہستہ زینت و وقار سے روانہ ہوتا ہے - دولھا کو "نوشہ" یعنی نیا بادشاہ کہتے ہین - او خیال بھی یہی ہے کہ دولھا ایک دن کے لیے بادشاہ بنا دیا جاتا ہے - مگر غور طلب یہ امر ہے کہ جب دولھا کو بادشاہ بناتے ہین تو اُس کے سر پر شملہ کیون ہوتا ہے؟ تاج کیون نہین پہناتے؟ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان مین مسلمان سر پر آدھا تاج نہین پہنتے تھے بلکہ سب کے سرون پر کلغی دار شملے ہوتے تھے - انگریزون نے غازی الدین حیدر کے زمانے سے شاہان اودھ کو تاج پہنا دیا - مگر وطنی سوسائٹی نے اُس تاج کو قبول نہین کیا - اور اپنے بادشاہون کی وضع وہی رکھی جو پرانی تھی - اور اُسی نمونے کا بادشاہ اپنے نوشاہون کو بناتے ہین - دولھا کے پیچھے فینسون اور ڈولیون مین سوار دولھا کی ماں بہنین اور عزیز و قریب عورتین اور ڈومنیان ہوتی ہین - چلتے وقت گھر مین جو صدہا رسمین اور ٹوٹکے ہوتے ہین بہت ہین - مختلف ہین - اور لغو ہونے کی وجہ سے زیادہ قابل لحاظ بھی نہین -

اس شان سے جب برات دولھن کے گھر پہونچتی ہے تو عموماً اُسوقت دولھن نہلائی جا چکتی ہے - اور اُس کے غسل کا پانی باہر لا کے دولھا کی سواری کے گھوڑے یا ہاتھی کے پانوُن کے نیچے ڈال دیا جاتا ہے - دولھن کو یہ غسل سات دن کے باسی ٹھنڈے پانی سے دیا جاتا ہے - جو کلس کا پانی کہلاتا ہے - اور جاڑون کے موسم مین غریب دولھن کے لیے اس پانی مین نہانا قیامت سے کم نہین ہوتا - چوکی پر پان بچھا کے وہ نہلائی جاتی ہے - اور یہی پان اُس کھیں بانون والے بیڑے مین شامل ہوتے ہین جو سب سے پہلے سُسرال مین کھلایا جاتا ہے -

اب دولہا سواری سے اُتر کے زنانے مین جاتا ہے - وہان رسمی نگھائی جاتی ہے - اور طرح طرح کی بیسیون اور رسمین عمل مین آتی ہین جو ہر گروہ اور ہر خاندان مین جدا جدا اور عجیب وغریب ہوتی ہین - یہ وقت علی العموم وہ ہوتا ہے جب دولھن نہا تو چکتی ہے مگر ابھی کپڑے نہین پہنائے گئے ہوتے ہین - وہ ایک چادر مین لپٹی ہوتی ہے - اور اُس کے ہاتھ پر مصری رکھ کے دولہا کو کھلائی جاتی ہے - جس مین سالیان - زندہ دل عورتین - اور ڈومنیان قیدین بڑھا بڑھا کے دولہا کے لیے ہر کام مشکل کر دیتی ہین -

شادی کی یہ پہلی ہفتخوان طے کرکے دولہا باہر مردانے مین آتا ہے جہان بزم نشاط مرتب ہوتی ہے - اعزا و احباب پُرتکلف کپڑے پہنے قرینے سے صاف ستھری دری چاندنی اور قالینون کے فرش پر بیٹھے ہوتے ہین - اور سامنے مردانہ یا زنانہ طائفہ کھڑا مجرا کرتا ہوتا ہے - عین محفل کے درمیان مین اور صدر مقام پر دولہا کے لیے زرنگار مسند تکیہ ہوتا ہے جس پر دولہا کو اُس کے ہم عمر لڑکے لاکے بٹھا دیتے ہین - اور اُسکے دونون طرف خود بیٹھ جاتے ہین - تاکہ دولھا اُنکے ساتھ آزادی سے باتین کر سکے -

دولہا کے لیے لازم ہے کہ اپنی ہر وضع - ہر حرکت سے شرمیلا پن ظاہر کرے - وہ نہ تو بے تکلف باتین کر سکتا ہے - نہ کوئی اُس کی آواز سُن سکتا ہے - نہ کسی سے وہ بے تکلفی سے ہل جُل سکتا ہے - مُنھ پر سہرا ہوتا ہے - اور پھر سونے کے سہرے پر پھولون کا سہرا باندھ کے اس قابل نہین رکھا جاتا کہ کوئی بغیر کوشش اور دیر تک کی محنت کے اُس کی صورت دیکھ سکے - محفل نشاط مین بیٹھنے بلکہ اکثر عقد ہو جانے کے بعد سہرا اُٹھا کے شملے مین لپیٹ دیا جاتا ہے تاکہ چہرہ کھُل جائے - مگر اب بھی اُسکے لیے لازم ہے کہ ایک ہاتھ سے منھ پر رومال رکھے رہے جو اظہارِ شرم کی ایک علامت ہے - اور اب چہرہ کھُلنے کے بعد بھی اس رومال کی وجہ سے اسکی صورت دیکھنے کے شائقین کو بغیر دیر تک اس فکر مین لگے رہنے کے کامیابی نہین ہو سکتی -

دولہا کے باہر آکر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد عقد نکاح کا انتظام ہوتا ہے

جس کے لیے یہ سب کھیڑا کیا گیا ہے۔ اگر شیعہ خاندانون کی شادی ہے تو وہ مجتہد صاحب تشریف لاتے ہین ایک لڑکے کے نائب و وکیل بن کے اور دوسرے لڑکی کے نائب و وکیل بن کے۔ لڑکی والے خود پردے کے پاس جاکے یا عادل شاہدون سے تصدیق فرماکے لڑکی کی شرعی مختاری حاصل کرتے ہین اور اس کے بعد دونون دولھا کے سامنے بیٹھ کے دولھا دولھن کی جانب سے قرأت و صحت مخارج سے ایجاب و قبول کے صیغے ادا کرتے ہین۔ اور اگر خاندان سُنّی ہے تو کوئی محترم مولوی صاحب اور اگر کوئی گانون ہوا تو وہان کے مقررہ خاندانی قاضی صاحب آکے نکاح پڑھاتے ہین۔ جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کے عزیزون مین سے کوئی صاحب اُسکے وکیل و مختار بن کے آتے ہین اور وہ شاہدون کو پیش کرتے ہین کہ فلان لڑکی نے مجھے اپنا وکیل اِن دونون شاہدون کے سامنے مقرر کیا اور مجھے اپنے عقد کا اختیار دیا۔ قاضی صاحب اُن شاہدون پر اطمینان کرکے اور مقدار مہر کو اُن وکیل صاحب سے دریافت کرکے دولھا کو کلمۂ شہادت پڑھاتے مسلمان کے لیے جن جن چیزون پر ایمان لانا ضروری ہے اُن کا عربی مین اقرار کراتے۔ اور اسکے بعد تین بار اُس سے یہ کہہ کے کہ "فلان لڑکی کے ساتھ اتنے مہر پر ہم نے تمھارا عقد نکاح کردیا" دولھا سے اقرار کراتے ہین کہ مین نے قبول کیا۔ اسکے بعد ایک دعائیہ خطبہ پڑھ کے لوگون سے کہتے ہین "مبارک" ساتھ ہی مبارک سلامت کا غل ہوتا ہے۔ نُقل اور چھوہارے جو سینیون مین بھرے سامنے رکھے ہوتے ہین اُنکو حاضرین مین لُٹا دیتے ہین۔

مجتہد یا مولوی صاحب کے آنے کے وقت گانا بجانا موقوف ہو جاتا ہے اور بعد عقد مولوی صاحب چلے جاتے ہین تو پھر رقص و سرود کی محفل گرم ہو جاتی ہے۔ اور اُسکے بعد دولھا پھر اندر زنانے مین بُلایا جاتا ہے۔ عورتون کی دنیا مین رسوم اور شرائط عقد کے اصلی لوازم کے بجا لانے کا خاص یہی وقت ہے زنانے مین اس موقع پر رسوم نکاح کے ضمن مین دولھا کے ساتھ ہر قسم کا مسخر کیا جاتا ہے۔ اور اُس کے پریشان کرنے مین کوئی کسر اُٹھا نہین رکھی جاتی ان تمام رسوم کی بجا لانے والی سالیان اور ڈومنیان ہوتی ہین۔ درحقیقت ناگفتہ

نوجوانون کے لیے شادی ایک پُر اسرار لاج (فراموشخانہ) ہے جس مین بیسیون ایسے مراحل پیش آتے ہین جو اُسکے وہم و گمان مین بھی نہین ہوتے۔ دولھن اوڑھا لپیٹ کے ایک غیر متحرک گٹھڑی کی طرح اُسکے سامنے لاکے رکھ دیجاتی ہے۔ ابھی تک اُسے رخصتی کا جوڑا نہین پہنایا گیا ہوتا۔ لاتے وقت کوشش کیجاتی ہے کہ پہلی آمد مین دولھن کی ایک لات دولھا کے پڑ جائے۔ پھر ٹوٹکے گائے جاتے ہین۔ دولھا سے بیوی کی غلامی۔ ذلیل ترین غلامی۔ اور خدا جانے کیسی کیسی خدمتین بجا لانے کا اقرار کرایا اور وعدہ لیا جاتا ہے۔ اسکے بعد آرسی مصحف کی رسم ادا ہوتی ہے۔ جس کے لیے دولھا دولھن کے درمیان رحل پہ قرآن شریف اور اس پہ آئینہ رکھا جاتا ہے۔ اور اُس آئینے مین دولھا کو دولھن کا پہلا جلوہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر لازم ہے کہ چہرہ دیکھنے سے پہلے دولھا سورۂ اخلاص پڑھ لے۔ اس جلوے مین دولھن آنکھین بند کیے رہتی ہے۔ عورتین دولھا سے آنکھین کھولنے کے لیے طرح طرح کی التجائین کراتی ہین۔ اور اسی سلسلے مین ہر قسم کی اطاعت و غلامی کا اُس سے اقرار کر لیتی ہین۔ بڑی مشکلون اور خوشامدون کے بعد دولھن آنکھین کھول کے ایک نظر دیکھتی اور پھر آنکھین بند کر لیتی ہے۔ اور اسی پہ رسوم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب دولھا باہر رخصت کر دیا جاتا ہے کہ دولھن کو کپڑے پہنائے جائین زیور پہنایا جائے۔ بنائی سنواری اور سسرال جانے کے لیے تیار کی جائے۔ اسوقت ڈومنیان بابل یعنی رخصتی کا نغمۂ جان گداز گاتی ہین۔ اور خوشی کا گھر ماتم کدہ بنجاتا ہے۔ جب دولھن بنا چنا کے تیار کر دی جاتی ہے اُسوقت میکے کے تمام عزیز و دوست اور سب ملنے والے آتے۔ رو رو کے دولھن کو رخصت کرتے۔ اور جو کچھ توفیق ہو روپیہ یا زیور اُسے دیتے ہین۔

(۴۷)

اسی اثنا مین جہیز کا سامان نکالا جاتا ہے۔ اُس کی فرد لاکے دولھا والون کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے۔ جس مین وہ تمام زیور۔ جوڑے۔ ظروف۔ پلنگ [illegible] دی جائین درج ہوتی ہین۔ تمام چیزون

کا فہرست سے مقابلہ کر لیا جاتا ہے۔ اور اب دولھن رخصت ہونے کے لیے بالکل تیار ہوتی ہے۔ اُس کا لباس کوئی بھاری کامدار جوڑا نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک سوہے یعنی ڈول پڑی تنزیب کا کرتا اور سادہ ریشمی پائجامہ پہنے ہوتی ہے۔ اور اس میں بھی سادگی کا اس قدر لحاظ رہتا ہے کہ گوٹ تک نہیں لگائی جاتی۔ اور ناڑے کا ازار بند پڑا ہوتا ہے۔

اُس کے سنگار اور کپڑے پہنانے کے وقت ڈومنیاں "بابل" یعنی میکا چھوٹنے کا راگ گاتی رہتی ہیں جو نہایت ہی پُرحسرت اور جگر گداز ہوتا ہے۔ ایک عجیب رنج والم کا سماں بندھ جاتا ہے۔ ہر شخص ملول و حزین ہوتا ہے۔ تمام اعزا ملنے والے اور خاندان کے دوست احباب مل مل کے اور سوز و گداز کے الفاظ کے ساتھ لڑکی کو رخصت کرتے ہیں۔ وہ خود زار و قطار روتی ہوتی ہے۔ اور فینس ڈیوڑھی میں لگا دی جاتی ہے۔ اُس وقت دولھا پھر اندر بلایا جاتا ہے کہ آ کے اپنی دولھن کو لے جائے۔ وہ آتا اور دولھن کو اپنی گود میں اُٹھا کے فینس میں بٹھا دیتا ہے۔

رخصت سے پہلے زنانے میں دولھا کو سلام کرائی دی جاتی ہے۔ اور تمام اعزا و اقارب۔ دوست احباب بقدر حیثیت دیتے ہیں۔ اسی وقت باہر شربت پلائی ہوتی ہے۔ جس میں شربت کا کنٹر اور گلاس فقط رسم کے طور پر لایا جاتا ہے پیتا کوئی نہیں۔ مگر تمام حاضرین محفل شربت کی تھالی میں حسب حیثیت و توفیق روپیہ ڈالتے ہیں۔ اور اس طرح اندر باہر جو کچھ روپیہ سلام کرائی اور شربت پلائی میں جمع ہوتا ہے دولھا کو دے دیا جاتا ہے۔

اب برات اُسی دھوم دھام اور اُسی شان و شوکت سے دولھا کے گھر کی طرف واپس روانہ ہوتی ہے۔ واپسی کے اس جلوس میں جو اضافہ ہوتا ہے اُس میں سب سے پہلے تو دولھن کی فینس ہے جو دولھا کے گھوڑے کے آگے رہتی ہے۔ اور نہایت ہی ممتاز ہوتی ہے۔ پُر تکلف جھپکا پڑا ہوتا ہے۔ دونوں جانب کہاریاں جھپکے کو پکڑے ہوے ساتھ رہتی ہیں۔ اور گرد دولھا کے ملازموں یا مخصوص لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اور دولھا کے بعد پھرا اور سب ساتھ والی عورتوں کی نینسیں رہتی ہیں۔

سب سے زیادہ نمایان چیز اس جلوس مین جہیز کا سامان ہوتا ہے - یہ سب سامان سارے جلوس اور باجے والون کے پیچھے اور دولھن کی فنیس کے آگے اس ترتیب سے جاتا ہے کہ تانبے کا ایک ایک برتن ایک ایک چنگیر مین رکھا ہوتا ہے اور ایک مزدور کے ہاتھ مین ہوتا ہے - چینی اور شیشے کے ظروف کشتیون مین لگے ہوتے ہین .. ..
.. .. اُن کے بعد صندوق وغیرہ ہوتے ہین جن مین دولھن کے جوڑے ہوتے ہین - اُنکے بعد پلنگ ہوتا ہے جس مین ریشمی توشک - لحاف تکیے - چادر - سب سامان تیار موجود ہوتا ہے - اور بچھونا ریشمی ڈوریون سے پایون مین بندھا ہوتا ہے - اور ڈوریون کے دونون سرون پر خاص وضع کے نقرئی گپھے لٹکتے ہوتے ہین - لڑکی کو معاشرت کا تمام سامان دیا جاتا ہے - آئینہ کنگھی - سنگھار کی ضروری چیزین تیل عطر - اور اگر استطاعت ہو تو چاندی کا پاندان - خاصدان - لوٹا - کٹورا - اور بعض اور چیزین دی جاتی ہین - بہرحال یہ سب سامان باجون اور برات کے جلوس اور دولھا کے درمیان مین رہتا ہے اور سب کے پیچھے ڈولیون پر کھانے کی دیگین ہوتی ہین - یہ جوڑے کا کھانا کہلاتا ہے جس کو عموماً لڑکی والے دولھا کو دیتے ہین -

اس شان سے جب برات دولھا کے گھر پہونچتی ہے تو خوشی کے شادیانے بجتے ہین - ڈومنیان پہلے سے پہونچ کے بنڑے گانا شروع کرتی ہین - جو خاص شادی کے گیت ہین - اور اس مبارک سلامت کے زور وشور مین دولھن اُتاری جاتی ہے - بعض خاندانون مین یہان بھی اُسے دولھا ہی گود مین لے کے اُتارتا ہے اور بعض گھرانون مین دولھا کی ماں بہنین آ کے اُتارتی ہین - اندر اُسے لیجا کے بٹھاتے ہی دولھا سے اُسکے دامن پر نماز شکرانہ پڑھائی جاتی ہے - دولھن کے پاؤن دھلا کے پانی مکان کے چارون کونون مین ڈال دیا جاتا ہے - رُونمائی ہوتی ہے - جس مین تمام عورتین اور عزیز مرد بھی کھول کھول کے روپیہ یا زیور دیتے ہین - اور منہ کھول کھول کے اُسکی صورت دیکھتے ہین -

اس نئے گھر مین یہ پہلی رات دولھن کے لیے نہایت سخت پابندیون اور

شرمیلے پن سے بسر کرنے کی رات ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی سے بول سکتی ہے۔ باتیں کر سکتی ہے۔ نہ کسی کو آنکھ بھر کے دیکھ سکتی ہے۔ سوا میکے کی ساتھ والیوں کے اور کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اور اسی مصیبت سے بچانے کے لیے صبح ہوتے ہی اُس کا بھائی یا اور کوئی رشتہ دار چوتھی لینے کو آ پہونچتا ہے۔ اور جہاں تک بنتا ہے سویرے ہی سوار کرا لے جاتا ہے۔ اس مرتبہ بھی دولھن اگرچہ امتیاز اور شان سے جاتی ہے۔ مگر جلوس اور باجے کی ضرورت نہیں۔ دولھا بھی دولھن کے ساتھ جاتا ہے۔ اور اُس کے ساتھ سات طرح کی ترکاریاں اور سات قسم کی مٹھائیاں جاتی ہیں۔

دن گذر کے اُسی رات کو دولھن کے گھر میں چوتھی کھیلی جاتی ہے۔ دولھن کو وہ بر کا جوڑا اُتار کے چڑھاوے کا جوڑا پہنایا جاتا ہے جو سب جوڑوں سے زیادہ بھاری کامدار اور نہایت ہی پُر تکلف ہوتا ہے۔ یہ جوڑا پہنا کے اُس کا خوب بناؤ چناؤ کیا جاتا ہے۔ دولھا کی طرف سے اُسکی بہنیں اور رشتہ دار عورتیں بھی آ جاتی ہیں۔ اور اُس مجمع میں دولھا دولھن مٹھائی سے اور دولھا کی ساتھ والیاں اور دولھن والیاں ترکاری اور میووں کی چھڑیوں سے باہم لڑتی ہیں۔ یعنی مٹھائی اور ترکاریاں ایک دوسرے کے کھینچ کھینچ کے مارتی۔ اور چھڑیوں کے ہاتھ رسید کرتی ہیں۔ کبھی دل لگی دل لگی میں لڑائی تیز بھی ہو جاتی ہے۔ اور بعض عورتیں خفیف سی چوٹ بھی کھا جاتی ہیں۔

چوتھی کے دو چار روز بعد پھر دولھن دولھا کے گھر میں آتی ہے۔ اور اسکے بعد علی العموم چار چالے ہوا کرتے ہیں۔ چالے کا لفظ چال اور چلنے سے نکلا ہے مطلب یہ ہے کہ دولھن اپنی سسرال سے بُلائی جاتی ہے۔ مگر یہ بُلانا خود اُسکے میکے میں نہیں بلکہ میکے والیوں میں ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی خالائیں پھوپھیاں وغیرہ بیاں ہمت کر کے باری باری اُسے اپنے یہاں بلاتی ہیں۔ جہاں وہ مع دولھا کے جاتی ہے۔ اور اُس نئے جوڑے کے رکھ رکھاؤ کے لیے خاص اہتمام اور انتظام کیا جاتا ہے۔ فقط ایک رات دن دولھا دولھن وہاں رہتے ہیں۔ اور رخصت کرتے وقت اُنھیں جوڑا۔ سلام کرائی۔ اور زیور وغیرہ بقدر ہمت و

و استطاعت دبے جاتے ہین -

یہ نقشہ لکھنؤ والون کی شادی جس کی بہت سی رسمون کو چھوڑ کر اُس کا ایک اجمالی خاکہ ناظرین دلگداز کو دکھا دیا گیا - دیہات والون کی شادی کا طریقہ بجز عقد نکاح کے اور تمام باتون مین بدلا ہوا ہے - وہان بھی مانجھا ہوتا ہے مگر دولہا کے لیے مانجھے کا زرد جوڑا اسکی بہنین اور عزیز عورتین لاتی ہین - دولھن کے گھر سے دھوم دھام اور جلوس اور باجے کے ساتھ مانجھا نہین آتا - نہ دولہا کے یہان سے سانچق آتی ہے اور نہ دولھن کے گھر سے مہندی آتی ہے - بلکہ سانچق اور مہندی کا مقصد برات ہی کے دن ایک اور طریقے سے پورا ہو جاتا ہے - وہ یہ کہ برات جب دولھن کے وہان پہونچتی ہے تو اُسکے مکان سے ذرا فاصلے پر ٹھہر جاتی ہے - وہان سے پہلے سجاے سانچق کے بری کے نام سے دولھن کا جوڑا اور اُسکے ساتھ اور بہت سے جوڑے اور سہاگ کی چیزین جو ضروری سمجھی جاتی ہین - کچھ شکر کچھ کھیلین خوانون پر لگا کے باجے کے ساتھ دولھن کے دروازے پر بھیجی جاتی ہین - دولہا کے اعزا واحباب ساتھ جاتے ہین جو اُن سب چیزون کو دولھن والون کو علانیہ دکھاتے اور اُنکے سپرد کرتے شربت پینے کے بعد واپس آتے ہین -

اُسکے تھوڑی دیر بعد اسی طریقے سے دولھن کی طرف سے بری آتی ہے جس مین دولہا کا جوڑا ہوتا ہے - یہ بری دیہاتیون مین مہندی کی قائم مقام ہے - اسکے بعد وہ جوڑا پہن کے جس مین جامہ - نیمہ - پگڑی - مقنع - سہرا - پھولون کی بدھیان اور جوتا وغیرہ ہوتا ہے روانہ ہوتا ہے - اب برات دولھن کے دروازے پر جاتی اور اُس مقام مین ٹھہرتی ہے جو محفل نکاح کے لیے منتخب کیا گیا ہو - یہان رات بھر نغمہ وسرود اور ناچ گانے کی محفل گرم رہتی ہے - بجز اُس وقت کے جب قاضی صاحب آ کے نکاح پڑھا ئین - نکاح کا وہی طریقہ ہے جو شہر والون مین بیان کیا گیا - عقد کے بعد لڑکی والے برات کا کھانا دیتے ہین - شہر مین بجز تھوڑے کے کھانے کے برات کو کھانا دینا لازمی نہین ہے بلکہ دولہا خود کھلا پلا کے لے جاتا ہے - مگر دیہات مین لڑکی

والون کا اہم ترین فرض برات کو کھلانا ہے جس مین ذرا بھی کمی رہ جائے تو اُنکے خیال مین برادری مین ناک کٹ جاتی ہے۔

یہ کھانا پورا توڑا ہوتا ہے جس مین پلاؤ۔ زردہ۔ قورمہ۔ خمیری روٹیان شیرمال لازم ہین۔ اور ہرادنیٰ واعلیٰ کو بلا استثناء وامتیاز پورا توڑا دیا جاتا ہے۔ کھانا لیتے وقت لڑکے والے نہایت بے حمیتی اور بے شرمی سے چونٹی چونٹی کے لیے کھانا مانگتے ہین۔ گھوڑون اور بیلون کے لیے دانہ چارہ ضرورت سے بہت زیادہ طلب کرتے ہین۔ اور لڑکی والون پر فرض ہے کہ زبان سے نہین نہ نکلے۔ کسی چیز کے دینے سے انکار کیا اور آبرو خاک مین مل گئی۔ اور سب کیا دھرا برباد ہوگیا۔

اسکے بعد رخصتی اور واپسی کا قریب قریب وہی طریقہ ہے جو شہر والون مین ہے۔ ہان ایک رواج یہ بھی ہے کہ دیہات مین برات کے ساتھ عورتین نہین جاتین۔ اور نہ دولھن کے ساتھ کوئی معزز خاتون آتی ہے۔ دائی اور خادمہ کی حیثیت سے دو ایک ادنیٰ درجے کی عورتین البتہ چلی آتی ہین۔ ماسوا اسکے دیہات مین دولھن پر بھی بہت زیادہ سختیان ہوتی ہین۔ اُس کا فرض ہے کہ جو تھی مین واپس آنے کی گھڑی تک سسرال مین جس طرح رکھ دی جائے رکھی رہے۔ نہ کھائے نہ پیے۔ نہ پیشاب پاخانے کو جائے۔ نہ بولے نہ چالے۔ نہ چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے۔ اور نہ آنکھین کھولے۔ اس لیے کہ یہ سب باتین بیحیائی و بے شرمی مین داخل ہین۔ اور اس اندیشے سے کہ دولھن کو سسرال مین جاکے پاخانے پیشاب کی ضرورت نہ پیش آئے دو دو دن پہلے سے اُس کا کھانا پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ اور زیادہ مصیبت یہ ہے کہ دیہات کی دولھن اکثر دوسرے گانوٗن مین بیاہ جاتی ہے۔ اور آمد و رفت مین دو دو تین تین منزلین طے کرنا ہوتی ہین۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت مین دولھن بیچاری پر کیسی سخت مصیبتین گذرتی ہون گی۔

دیہات مین سانچق اور مہندی کے ترک ہو جانے اور برات کھلانے مین سختیان ہونے کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ زیادہ تر برات سفر کرکے ایک بستی سے دوسری بستی مین جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ممکن نہین ہوتا کہ ایک دن ایک جلوس یہان سے جائے اور دوسرے دن دوسرا جلوس وہان سے یہان آئے۔ اور پھر تیسرے

روز برات روانہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس براتیوں کو گوکہ دولھا اکثر اپنے گھر سے کھلا کے لیجاتا ہے۔ مگر لڑکی والے کے گھر پہونچتے پہونچتے سارے براتی بھوکے بنگالی ہوتے ہیں اور کنگلوں کی سی شان دکھانے لگتے ہیں۔

(۴۸)

خوشی کی تقریبوں کو ہم بقدر ضرورت بتا چکے اب غمی کی صحبتوں کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے۔ مگر یہ سارے ہندوستان میں عام ہیں۔ جہاں تک میں نے غور کیا ان میں لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی۔ غمی کا باعث کسی کا مرنا ہوتا ہے۔ لہذا مرنے کے دن اعزا و احباب کو خبر کر دی جاتی ہے۔ اور جن لوگوں کو مجبوری مانع نہیں ہوتی ضرور آتے ہیں۔ عورتیں جو آتی ہیں اپنی ڈولی یا سواری کا کرایہ آپ دیتی ہیں۔ شادی کی تقریبوں میں عام قسم کی آمد و رفت میں لازم ہے کہ مہمان آنے والیوں کا کرایہ دیا جائے مگر غمی کا گھر اس تکلیف سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد مُردے کو نہلاتے ہیں۔ شیعوں کے یہاں معمول ہے کہ غسل کے لیے جنازہ پہلے غسل خانے میں لے جایا جاتا ہے جہاں غسّال جو نہلانے میں نہایت مشاق مگر اس کے ساتھ قسی القلب مشہور ہیں مُردے کو غسل دے کے کفن پہناتے ہیں۔ مگر سُنیّوں کے یہاں مُردہ اپنے گھر ہی میں نہلایا جاتا ہے۔ اور خود اعزا و اقارب یا دوست احباب نہلاتے ہیں۔ اکثر مرد اور عورتیں جو زیادہ مشاق ہوں بُلا لیے جاتے ہیں۔ اور اکثر جگہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شرع دان مولوی صاحب یا اور کوئی پڑھے لکھے واقف کار بزرگ بتاتے جاتے ہیں کہ اس ترتیب سے نہلانا چاہیے۔ اور مسنون غسل میت کیا ہے۔

غسل کے بعد کفن پہنایا جاتا ہے جس میں ایک ازار ایک کفنی جو کرتے کے نام سے مشہور ہے پہنا کے اوپر سے دو چادریں لپیٹ دی جاتی ہیں۔ اور سر اور پاؤں کے پاس اور کمر میں کپڑے کی چٹیں پھاڑ کے باندھ دی جاتی ہیں تاکہ کھلنے نہ پائیں۔

اس کے بعد اگر شیعوں کا جنازہ ہے تو صندوق میں رکھ کے اُس پر کوئی دوشالہ

ڈال کے جنازے کو شامیانے کے سائے میں لے جاتے ہیں - اور ساتھ ساتھ کوئی شخص قرات و ادائے مخارج سے سورۂ رحمان کی بعض آیتیں پڑھتا جاتا ہے صندوق شامیانے کے اُٹھانے والے علی العموم شہدے ہوتے ہیں - جن کا مدت دراز سے مُردے اُٹھانا پیشہ ہوگیا ہے - مگر ان لوگوں کی بیہودگیوں اور بدتمیزیوں سے شیعوں میں خیال پیدا ہوا ہے کہ جنازوں کو خود اُٹھانا چاہیے - جسکے لیے متعدد کمیٹیاں شہر میں قائم ہوگئی ہیں - اور اُن کے پُرجوش اور دیندار ارکان تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی مرجائے تو اُس کے جنازے کو خود اپنے اہتمام میں لے کے مذہبی آداب اور احتیاطوں سے اُٹھائیں -

سُنّیوں میں میت کو کسی ہلکی چارپائی پر لِٹا کے اور اوپر سے چادر ڈال کے لیجاتے ہیں - اگر عورت کا جنازہ ہو تو چارپائی پر بانس کی کھپاچوں کو قوس کی صورت میں قائم کرکے اور اُن کے سِروں کو دونوں جانب چارپائی میں اٹکا کے اوپر سے چادر ڈالتے ہیں - اس کو گہوارہ بنانا کہتے ہیں - اور اس کی ضرورت محض پردے کے خیال سے پیدا ہوئی ہے - سُنّیوں میں جنازے کو خود اعزا و احباب اپنے کندھوں پر اُٹھا کے آہستہ آہستہ کلمہ پڑھتے ہوے لے جاتے ہیں اور نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی ہے -

قبریں عموماً صندوقی کھودی جاتی ہے - جس میں انسان کے سینے تک ایک چوڑا حوض کھودا جاتا ہے - پھر اُسکے اندر دونوں جانب کنارے چھوڑ کے ایک دوسرا پتلا حوض کھودا جاتا ہے - وہ بھی انسان کی کمر سے کم گہرا نہیں رہتا - جب قبر خوب صاف کرلی جاتی ہے تو مُردے کو اُس میں نہایت احتیاط سے اُتارتے ہیں تاکہ ہاتھ سے گرنے اور چوٹ کھانے نہ پائے - قبر میں عموماً سرہانا شمال کی طرف رکھا جاتا ہے - اور مُردے کا مُنھ ڈھیلوں وغیرہ کی آڑ لگا کے قبلے کی طرف کردیا جاتا ہے - اسکے بعد بند کھول دیتے ہیں - اور اکثر اعزا کو منہ کھول کے میت کی آخری صورت بھی دکھا دیا کرتے ہیں - اس موقع پر شیعوں کے وہاں تلقین پڑھی جاتی ہے - جس کی صورت یہ ہے کہ کوئی ثقہ اور متقی بزرگ قبر میں اُتر کے میت کا شانہ ہلاتے جاتے ہیں اور ایک عربی عبارت پڑھتے جاتے

ہین جس مین میت کی طرف خطاب کرکے بتایا جاتا ہے کہ وہان نکیرین آکے سوال کرین تو تم یہ جوابات دینا جس کے سلسلے مین تمام عقائد دینیہ کی تعلیم کردی جاتی ہے - اسکے بعد اندرونی حوض پر تختے جما دیے جاتے ہین - اور اگر اُن مین درز یا جھری ہو تو مٹی کے ڈھیلے رکھ رکھ کے اطمینان کرلیتے ہین کہ مٹی اندر نہ جانے گی - قبر مین کافور اور خوشبو تو کفن ہی مین موجود ہوتی ہے بعض لوگ کیوڑے کی بوتل بھی ڈال دیتے ہین - اور اُسکے بعد اوپر سے مٹی ڈال کے قبر کا اوپر والا حوض بھر دیا جاتا اور قبر کی صورت بنا دی جاتی ہے -

مٹی دینے کو لوگ بڑا اہم اور ضروری کام تصور کرتے ہین - اور جب قبر مین مٹی ڈالی جانے لگتی ہے تو حاضرین مین سے ہر شخص عام اس سے کہ کوئی ہو تین مرتبہ ہاتھ مین مٹی لے کے قبر مین ڈالتا ہے - اور قرآن کی تین آیتین پڑھتا ہے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے تم کو اس سے (مٹی سے) پیدا کیا - ہم نے تم کو پھر اُسی مین پہونچایا - اور ہم پھر آیندہ (روز قیامت) تم کو اس سے نکال کے کھڑا کرین گے"

بہر حال جب قبر بن کے تیار ہو جاتی ہے تو اُسپر وہی چادر جو جنازے پر پڑی تھی یا پھولون کی چادر ڈال دی جاتی ہے - اور فاتحہ پڑھ کے اور دعاے مغفرت کرکے لوگ واپس آتے ہین -

مرنے والے کے گھر مین اُس کی وفات کے دن چولھا نہین جلتا بلکہ جنازے کے گھر سے نکلنے کے بعد کسی عزیز و قریب کے گھر سے پکا پکایا کھانا آجاتا ہے - جس کو لوگ دفن سے واپس آکے کھاتے ہین - اور اُسی وقت تمام مہمان اُس کھانے سے پیٹ بھرتے ہین - تین دن تک معمولاً یہی ہوتا ہے کہ گھر مین کھانا نہین پکتا - یہ طریقہ اصل مین آغاز اسلام اور خود حضرت رسالت علیہ السلام سے شروع ہوا - جبکہ حضرت جعفر طیار کی شہادت کا حال سُن کر اور اُنکے گھر والون کو روتا پیٹتا دیکھکر آپ نے کھانا بھجوا دیا تھا - مگر لوگون نے اس شایستہ بنیاد پر جو عمارت یہان قائم کرلی ہے وہ نہایت لغو اور شرمناک ہے - کسی کے مرتے ہی گھر مین جتنا کھانا تیار ہو پھینکدیا جاتا ہے - گھڑون ٹھلیون کا پانی بہا دیا جاتا ہے - اور اس کا سبب

عورتیں بچوں سے یہ بیان کرتی ہیں کہ فرشتۂ موت جس چھری سے جان لیتا ہے اُسکو کھانے پینے کی چیزوں میں دھو ڈالتا ہے -

مرنے کے تیسرے دن اور کبھی مناسب دن دیکھ کے چوتھے روز سوم ہوتا ہے در اصل اس کا آغاز اس سے ہوا کہ یہ دن اس لیے مقرر تھا کہ لوگ آکر مراسم تعزیت ادا کریں اور پسماندوں کی تسلی و تشفی کریں - مگر یہ خیال کرکے کہ ایک مجمع کثیر کا خالی بیٹھا رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا - یہ طرز عمل اختیار کیا گیا کہ جو لوگ آئیں بیٹھکر قرآن مجید کی تلاوت کریں - اور دو ایک پارے پڑھ کے اُن کا ثواب مرحوم کی روح کو بخشیں - چند روز میں تعزیت کا خیال جاتا رہا - اور فقط یہ رکھا گیا کہ اُس دن کتنے لوگ آئے اور کتنے قرآن مرنیوالے کو بخشے گئے - ختم صحبت کے وقت پہلے مختلف لوگ قرآن کے چند رکوع اور آخر کی چھوٹی سورتیں پڑھکر فاتحے کے لیے ہاتھ اُٹھاتے ہیں - اس میں ایک نیا لغو طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ تھوڑا گھسا ہوا صندل - ایک پیالے میں تیل - اور تھوڑے پھول لا کے حاضرین میں سے ہر ایک کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں - ہر شخص ایک پھول اُٹھا کے تیل میں ڈالتا ہے - اور وہ صندل اور تیل اور پھول لے جا کے مرحوم کی تربت پر ڈال دیئے جاتے ہیں -

اسی روز شام کو سب سے بڑی فاتحہ خوانی ہوتی ہے - اور گھر میں پہلی بار کھانا پکتا ہے - اگرچہ اب غربت نے ہمدردوں کی اس قدر کمی کر دی کہ میت کے گھر کھانا بھیجنے والے بہت کم رہ گئے ہیں - اور اکثر غریب گھر والوں کو اس سے پہلے ہی کھانا پکانے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے - لیکن مروجہ طریقہ یہی ہے کہ تیجے یعنی سوم سے پہلے باہر ہی کے کھانے پر بسر ہو -

سوم اور چہلم کی فاتحوں نے عوام میں عجب شان پیدا کر لی ہے - اصلیت تو اسی قدر ہے کہ جہاں تک ہو سکے غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے اور اُسکا ثواب مرنے والے کو پہونچا دیا جائے - ہندوستان میں ہندوؤں میں مُردوں کی تیرھویں اور برسی ہوتے دیکھ کے مسلمانوں کا جی چاہا کہ ہم بھی اسی قسم کے کام ناموری اور دھوم دھام سے کریں - اس شوق کے تقاضے نے تیجے - دسویں

بیسوین - چہلم - اور دیسے کے نام سے غمی کی تقریبین پیدا کر دین - جن مین ہوتا وہی ایصال ثواب ہے مگر دکھانے - نام پیدا کرنے - اور برادری کو کھانا دینے کی شان سے - پھر اُس پر قیامت یہ ہوئی کہ عوام مین یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ ان ہمارے مروجہ فاتحون مین جو کچھ دیا جاتا ہے وہ خدا کے حکم سے بجنسہ مُردے کو پہونچا دیا جاتا ہے - اس عقیدے نے فاتحون مین یہ شان پیدا کر دی کہ گویا مُردے کی دعوت کی جاتی ہے - وہ کھانے زیادہ اہتمام سے دیے جاتے ہین جو مرحوم کو مرغوب تھے - حالانکہ خیرات کا اصول یہ چاہتا ہے کہ جس غریب کو کھلایا جائے اُس کی پسند کا لحاظ رکھا جائے تاکہ اُس کے خوش کرنے سے ثواب مین ترقی ہو -

اسی قدر نہین فاتحون مین تواب یہ ہوتا ہے کہ چار چار یا پانچ پانچ جوڑ کھانے کے نکال کے ایک پاک و صاف مقام پر ترتیب سے چُنے جاتے این - آبخورے مین پانی بھی لاکے رکھ دیا جاتا ہے - اس لیے کہ کھانے مین مُردے کو پانی پینے کی بھی ضرورت ہوگی - پھر اُس کے لیے کپڑون کے نئے اور حتی الامکان نفیس و قیمتی کپڑے اوڑھنا بچھونا - جانماز - نئی قلعی کیے ہوے تانبے کے برتن - لوٹا - کٹورا - پتیلی وغیرہ بھی کھانے کے برابر رکھ دیے جاتے ہین - اور جب یہ سب سامان تیار ہو جاتا ہے تو کوئی مُلا آکے فاتحہ کرتا - یعنی قرآن کی چند مخصوص آیتین اور چھوٹی سورتین پڑھ کر دعا کرتا ہے کہ خداوندا ان چیزون کا ثواب فلان شخص کو پہونچا - اس طریقے سے عوام کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ چیزین مردے کو پہونچ گئین - اور وہ سب کھانے اور چیزین کسی محتاج یا دیندار مسلمان کے گھر پہونچا دی جاتی ہین -

ان چیزون سے خود مرحوم کے متمتع ہونے کے خیال نے دلون مین یہان تک رسوخ پیدا کر لیا ہے کہ بعض ادنی طبقے کی جاہل عورتین فاتحے کی چیزون کے پاس بن سنور کے خود بھی بیٹھ جاتی ہین کہ مرحوم شوہر ان کھانون اور کپڑون سے لطف اُٹھائے گا تو خود اُنکے حسن و جمال کی لذت سے کیون محروم رہ جائے -

فاتحون مین کھانا فاتحے کی ضرورت سے بہت زیادہ پکوایا جاتا ہے حسب توفیق اعزا و احباب مین جن سے حصہ داری ہے تقسیم ہوتا ہے

گھر کے بزرگوں ۔ وضعی ۔ نائی ۔ حلال خور وغیرہ کو دیا جاتا ہے ۔ جنھوں نے فاتحوں کے شاندار تقریبیں بن جانے کی وجہ سے اپنے حقوق پیدا کر لیے ہیں ۔

گوکہ ہم نے یہ سب کارروائیاں فاتحۂ سوم کے ضمن میں بیان کر دی ہیں لیکن انکی تعمیل زیادہ اہمیت کے ساتھ چہلم میں ہوتی ہے جو کہنے کو تو مرنے کے چالیسویں دن مگر از روے عمل درآمد چالیس سے دو چار روز کم زمانے میں ہوا کرتا ہے ۔ اور فاتحے دسویں بیسویں کے بھی گو امتیاز سے ہوتے ہیں اور ہر جمعرات کا دن خاندان کے بزرگوں کے فاتحے کے لیے مقرر ہو گیا ہے ۔ مگر علی العموم سوم اور چہلم کے فاتحے غیر معمولی اہتمام سے ہوتے ہیں ۔ اور حضرات امامیہ کے وہاں ہر غمی کے فاتحے میں لزوم کے ساتھ مجلس عزاے آل عبا علیہم السلام بھی ہوتی ہے ۔

غمی کی تقریبوں کے خصوصیات ہم نے بیان کر دیئے ۔ اب رہی محفلوں کی نشست کا طریقہ وہ وہی ہے جو دوسری تقریبوں میں عرض کر دیا گیا ۔ یہ خوشی اور غمی کی وہ تقریبیں تھیں جو اخلاقی و معاشرتی طریقے سے مروج ہیں ۔ مذہب نے جن محفلوں کو رواج دیا ہے اُن کو ہم آیندہ بیان کریں گے ۔

(۴۹)

آداب صحبت میں دسویں چیز مذہبی صحبتیں یعنی عزاداری کی مجلسیں اور مولد شریف کی محفلیں ہیں ۔ مجلسوں کا عام رواج شیعوں میں ہے اور مولد شریف کا سنّیوں میں ۔ اگرچہ دونوں میں دونوں فریقوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں ۔ بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی بعض محب اہل بیت سُنّی مجلس عزا کرتے ہیں اور شیعہ حضرات کے یہاں مولد شریف کی محفل ہوتی ہے ۔ مگر لکھنؤ کی خاص چیز جس نے لکھنؤ کی سوسائٹی پر اثر ڈالا اور نیز سوسائٹی اُس سے متاثر ہوئی وہ مجلسیں ہیں ۔ مولد کی محفلوں میں کوئی خصوصیت نہیں ۔ جیسی سارے ہندوستان میں ہوا کرتی ہیں یہاں بھی ہوتی ہیں ۔ گو اس میں شک نہیں کہ بعض اُمرا کے یہاں مولد میں بھی قریب قریب وہی شائستگی و تہذیب نظر آتی ہے جو شیعوں کی شائستگی کی وجہ سے مجالس میں بھی اکثر رہتی ہے ۔

تا ہوں عزاداری کی مجلسیں بہت کثرت سے ہوتی ہیں ۔ اور اگر کوئی شخص چاہے

اور پتہ لگتا ہے تو سال بھر بغیر محنت مزدوری کے محض مجالس کی شرکت سے اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔ اور فقط فیاض وعقیدتمند شیعون کی فیاضی پر جی سکتا ہے۔ مجالس ہی کی برکت سے یہان مختلف قسم کے ذاکر پیدا ہو گئے جو جدا جدا عنوانون سے معائب سید الشہدا علیہ السلام کو بیان کرکے روتے رُلاتے ہین۔ اُن مین سب سے پہلے علما و مجتہدین کا بیان ہے۔ اُنکے بعد حدیث خوان ہین جو احادیث کو سنا کر ایسے پُر درد اور سوز و گداز کی آواز مین فضائل ائمۂ اطہار و مصائب آلِ رسول بیان کرتے ہین کہ سامعین بے اختیار رونے لگتے ہین۔ اور کیسا ہی سنگدل ہو ضبطِ گریہ نہین کر سکتا۔ اُنھین سے ملتے جُلتے واقعہ خوان ہین جو واقعات معائب اہل بیت کو ایسے الفاظ اور ایسی فصیح وبلیغ عبارت مین سناتے ہین کہ جی چاہتا ہے سنتے رہیے۔ اور روتے جائیے۔ واقعہ خوانی کی فصاحت نے دراصل داستان گوئی کو بے مزہ کر دیا ہے۔ اُنکے بعد مرثیہ خوان یا تحت اللفظ خوان ہین جو مرثیون کو شاعرانہ انداز سے سناتے ہین۔ مگر اس سادگی کے سنانے مین بھی چشم وابرو اور ہاتھ پاؤن کے حرکات وسکنات سے واقعات کی ایسی سچی اور مکمل تصویر کھینچ دیتے ہین کہ سامعین کو اگر رقت سے فرصت ملی تو داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہین۔ اسی مرثیہ خوانی کی ضرورت وقدر نے میر انیس اور مرزا دبیر پیدا اکیے جو کمال شاعری کے اعلیٰ ترین شہ نشین پر پہونچ گئے۔ یا تو یہ مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ یا لکھنؤ کے کمال مرثیہ گوئی نے سارے ہندوستان سے منوا لیا کہ عالم شعر وسخن مین مرثیہ گوئی کا رتبہ دیگر اصناف سخن سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ قدردانی نے بیسیون مرثیہ گو اور صدہا مرثیہ خوان پیدا کر دیے جو محرم اور دیگر ایام عزاداری مین لکھنؤ سے نکل کے ہندوستان کے بلاد دور دراز مین پھیل جاتے ہین۔ اور وہان کی صحبتون مین اپنے کمالات کا سکہ بٹھا کے واپس آتے ہین۔ مرثیہ خوانون کے بعد سوز خوان ہین۔ یہ لوگ نوحون اور مرثیون کو اصول موسیقی کی پابندی مین گا کے سُناتے ہین۔ اُن مین علی العموم تین آدمیون کا گروہ ہوتا ہے۔ دو سُر دیتے ہین جو "بازو" کہلاتے ہین اور تیسرا شخص جو بیچ مین بیٹھتا ہے سوز سُناتا ہے۔ ان لوگون نے بھی اصول موسیقی

کے برتنے۔ اور راگون اور دھنون کے ادا کرنے مین اس درجہ ترقی کی ہے کہ گویون کو پیچھے ڈال دیا۔ اور لکھنؤ مین بہت سے اس پایہ کے سوز خوان پیدا ہوے کہ بڑے بڑے اُستاد گوئیے اُنکے آگے کان پکڑنے لگے۔ بہر حال جو درجہ کمال مرثیہ گویون نے شاعری مین حاصل کیا وہی سوز خوانون نے موسیقی مین۔

یہ سب فن محض مجالس عزا کی برکت سے پیدا ہوے۔ اور خاص لکھنؤ مین پیدا ہوے۔ اور ان سب نے علاوہ ادب اُردو کو بے انتہا ترقی دینے کے نظم ونثر اُردو کی دنیا مین یہ خاص شان پیدا کردی کہ انسانی جذبات کو جس طرح چاہین حرکت مین لائین۔ اور جس قسم کے جذبات اور جیسے جوش کو چاہین پیدا کردین۔ اس فن کو باضابطہ طور پر یونانیون نے ترقی دی تھی۔ جنھون نے اپنی تقریرون کے موثر بنانے کے لیے پتہ لگایا تھا کہ کن الفاظ۔ کن حرکات۔ کیسے لہجے۔ اور کن آوازون سے انسان کے دل مین خوشی یا غم یا رحم یا قہر وغضب کا جوش پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اسکے بعد کبھی اس فن کی طرف کسی قوم نے توجہ نہین کی۔ یہان تک کہ اب یورپ کے آرٹیرون اور اسپیکرون نے اس فن کو زندہ کرنا شروع کیا۔ مگر لکھنؤ مین محض ذاکری کے طفیل مین اس فن کو خود بخود اس قدر ترقی ہوگئی کہ یورپ والے بھی شاید اس درجے سے آگے نہ بڑھ سکے ہون گے۔

مجلسون مین ختم کے وقت شربت پلانا یا مٹھائی یا کھانا تقسیم کرنا لازم ہے۔ مگر مہذب اور دولتمند لوگون نے اب یہ نہایت ہی شایستہ طریقہ اختیار کرلیا ہے کہ جن حضرات کو بُلانا ہوتا ہے اُن کے پاس دعوت کے رقعون کے ساتھ حصہ بھی بھیج دیا جاتا ہے۔ مجلس سے واپس آتے وقت ہاتھ مین حصہ لے کے چلنا بہت سے مہذب اور خوشحال لوگون کو تہذیب کے خلاف اور نہایت مبتذل معلوم ہوتا تھا۔ گو کہ عوام اور بازاری لوگ اس مین مضائقہ نہین سمجھتے مگر خوش حال اور وضعدار لوگون کو یہ گران گذرتا تھا۔ اور اگر خدمتگار موجود نہ ہوا تو بہت سے لوگون کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ مجلس ہی مین کسی دوست یا غریب آدمی کو اپنا حصہ دے دین۔

مجلس کی نشست کی شان یہ ہے کہ لکڑی کا ایک ممبر جس مین سات آٹھ زینے ہوتے ہین دالان یا کمرے کے ایک جانب رکھا ہوتا ہے - اور لوگ چارون طرف دیوار کے برابر پُر تکلف فرش پر بیٹھتے ہین - اور اگر مجمع زیادہ ہوا تو بیچ کی جگہ بھی بھر جاتی ہے - جب کافی آدمی جمع ہو جاتے ہین تو ذاکر صاحب ممبر پر رونق افروز ہو کر پہلے ہاتھ اُٹھا کر کہتے ہین " فاتحہ " - ساتھ ہی تمام حاضرین ہاتھ اُٹھا کے چپکے چپکے سورۂ فاتحہ پڑھ لیتے ہین - اسکے بعد وہ اگر حدیث خوان یا واقعہ خوان ہوے تو کتاب کھول کے بیان کرنا شروع کرتے ہین - اور اگر مرثیہ خوان ہوے تو مرثیے کے اوراق ہاتھ مین لے کے مرثیہ سنانے لگتے ہین مجتہدون اور حدیث خوانون کے بیان کو لوگ خاموشی و ادب سے سُنتے اور رقت کے موقعون پر زار و قطار روتے ہین - مگر مرثیون کے سننے وقت مجمع حاضرین سے بجز رقت کے بندون کے جبکہ رونے سے فرصت نہین ملتی برابر صداے آفرین و مرحبا بلند ہوتی رہتی ہے -

سوز خوان ممبر پر نہین بیٹھتے بلکہ لوگون کے بیچ مین ایک جانب بیٹھ کر نوحے اور مرثیے سُناتے ہین - اور اکثر داد بھی پاتے ہین -

اکثر مجلسون مین مختلف ذاکر یکے بعد دیگرے پڑھتے ہین - اور عموماً حدیث خوانی کے بعد مرثیہ خوانی اور اُسکے بعد سوز خوانی ہوتی ہے - سوز خوانی چونکہ دراصل گانا ہے اس لیے اس کا رواج اگرچہ لکھنؤ ہی مین نہین سارے ہندوستان مین کثرت سے ہو گیا ہے مگر مجتہدین اور ثقہ اور پابند شرع بزرگون کی مجلسون مین سوز خوانی نہین ہوتی - مجتہدین کے وہان کی مجلسون مین پابندی شرع کا بہت خیال رہتا ہے - خصوصاً جناب غفرانمآب کے امام باڑے مین نوین محرم کو جو مجلس ہوتی ہے وہ خاص شان اور امتیاز رکھتی ہے - اور اُس کی شرکت کے شوق مین لوگ دُور دُور سے آتے ہین - اُس مین اثناے بیان مین اونٹ حاضرین کے سامنے لائے جاتے ہین جن پر کجاوے یا محملین ہوتی ہین اور اُن پر سیاہ پوششین پڑی ہوتی ہین - اور مومنین کو یہ منظر نظر آ جاتا ہے کہ دشت کربلا مین اہل بیت کا لُٹا مارا اور تباہ شدہ قافلہ کس مظلومی و ستم زدگی

ں شان سے شام کی طرف چلا جاتا تھا ۔ حاضرین پر اس المناک منظر کا ایسا
ثر پڑتا ہے کہ ہزارہا حاضرین سے دس بیس کو غش ضرور آجاتا ہے جو بڑی مشکلوں
سے اُٹھا کر اپنے گھروں کو پہونچائے جاتے ہیں ۔
خاندان اجتہاد سے مجالس میں اس ڈرمیٹک شان کی ابتدا ہونے کا یہ
نجام ہوا کہ اکثر عقیدتمند اُمرا جدت طرازیاں کرنے لگے ۔ اور بعض بزرگوں نے تو
یہاں تک ترقی کی کہ مجلسوں کو بالکل ڈراما بنا دیا ۔ چنانچہ مولوی مہدی حسین صاحب
مرحوم کے یہاں مجلسوں میں وقتاً فوقتاً تھیئٹر کے ایسے پردے کھلتے جن کے
ذریعے سے واقعات کربلا کے پُرالم سین پیش نظر کر دیے جاتے ۔ اور حاضرین پر
عجیب رقّت کا عالم طاری ہوتا ۔ اس سے بھی زیادہ ترقی مرحوم کے یہاں کی
زنانی مجلسوں میں ہوتی ۔ جن میں شہر کی ہزاروں عورتیں جمع ہو جاتیں ۔ اور
بجاے اسکے کہ ذاکر حدیث خوانی کریں اسٹیج پر کربلا کے سین زندہ ایکٹروں
اور ایکٹرسوں کے ذریعے سے دکھلائے جاتے ۔
جہاں تک مجھے معلوم ہے علما و مجتہدین نے ان بدعات کو پسند نہیں کیا ۔ مگر
عوام الناس کی دلچسپی ان میں روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے ۔
اصل حقیقت یہ ہے کہ شیعوں کی مجلسوں نے لکھنؤ کی معاشرت پر بہت نمایاں
اثر ڈالا ہے ۔ اور اُن کے ذریعے سے آداب صحبت اور تہذیب و شایستگی کو بہت
زیادہ ترقی ہو گئی ہے ۔ اور مرثیوں کے ذوق نے شاعری و موسیقی کو زندہ ہی
نہیں کر دیا بلکہ اُن دونوں فنون کا سچا مذاق مَردوں سے تجاوز کر کے پردہ نشین شریف
خاتونوں تک میں پیدا کر دیا ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز یورپ کے سوا جہاں
رقص و سرود لڑکیوں کی تعلیم میں داخل ہے ایشیا کے کسی شہر میں نہ پیدا
ہو سکی ہو گی ۔
مجلسوں کے علاوہ ایک اور طرح کی محفلیں بھی شیعوں میں ہوتی ہیں ۔
جو "صحبت" کے نام سے یاد کی جاتی ہیں ۔ اُن کا زمانہ ۹ ۔ ربیع الاول یعنی عید شجاع
کے دن سے شروع ہو کر چند روز تک باقی رہتا ہے ۔ مجالس عزا جس طرح
اہل بیت کے مصائب پر رونے اور آنسو بہانے کے لیے ہیں ۔ اسی طرح یہ صحبتیں

اس غرض سے کی جاتی ہین کہ ڈرامیٹک طریقے سے دشمنان اہلبیت کی توہین وتذلیل کی جائے اور اُن کو بے تکان گالیان دی جائین۔ اور چونکہ شیعون کے خیال مین اہلبیت کے سب سے بڑے دشمن اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر فاروقؓ تھے اس لیے انھین دونون محترم نامون کی توہین کرنا اور اُن کے پتلے بنا کے ذلت ونفرت کے ساتھ جلانا ان صحبتون کا مقصود اصلی ہوگیا ہے۔ ان مین کسی سُنی کے جانے کی کوئی وجہ نہین ہے اس لیے کہ وہ اپنے مقتداؤن کی توہین کو گوارا نہین کرسکتے۔ مگر سُنا جاتا ہے کہ یہ نہایت ہی بدتہذیبی و فحاشی کی شرمناک محفلین ہوتی ہین۔ جن مین ابتذال اس درجے تک ترقی کر جاتا ہے کہ کوئی مہذب شیعہ بھی بغیر روحی تکلیف اُٹھائے واپس نہین آسکتا۔ ان صحبتون نے بھی شیعون کے مذاق پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ اور اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ ذرا ذرا سی باتون پر سُنی شیعون مین لڑائیان ہوجاتی ہین۔

شیعون کی ان مجلسون اور صحبتون کے بر سُنیون کی مجالس مولد شریف ہین۔ اُن کی نشست اور شان وہی ہوتی ہے جو مجلسون کی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ سُنیون کے یہان ممبر نہین ہوتا بلکہ ایک ممتاز جگہ پر کوئی چوکی بچھا دی جاتی ہے اُس پر تکلف کا فرش کردیا جاتا ہے اور اُسپر بیٹھ کے واعظ یا مولدخوان صاحب مولد سناتے ہین۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ کوئی مولوی صاحب حالاتِ ولادت سرور عالمؐ بیان کردیتے۔ اور ذکر ولادت کے وقت سب لوگ کھڑے ہوجاتے۔ مولدخوان صاحب مسرتِ ولادت مین کوئی نظم پڑھتے اور لوگون پر گلاب پاش سے کیوڑہ چھڑکا جاتا۔ یا کوئی واعظ نہ ملتا تو کوئی پڑھا لکھا آدمی مولوی غلام امام شہید کا مولد شریف پڑھ کے سُنا دیتا۔ مگر عوام کے لیے مولدخوانی کا یہ طریقہ اطمینان بخش نہ ثابت ہوا۔ اور سوزخوانون کی دیکھا دیکھی ایسے مولدخوان پیدا ہوگئے جن کے ساتھ دو سُر ملانے والے ہوتے ہین۔ اور اُنکے بیچ مین وہ بیٹھ کر ترنم کے خاص لہجے مین واقعات ولادت بیان کرتے ہین۔ اور درمیان درمیان مین برابر اشعار و قصائد گائے جاتے ہین

جن مین دونون باذو اُن کا ساتھ دیتے ہین - گر سوزخوانون نے تو موسیقی کو زندہ کر دیا اور مولدخوان گانے والون نے سچ یہ ہے کہ موسیقی کا گلا گھونٹنے مین کوئی کسر اُٹھا نہین رکھی -

لیکن مولدخوانی کے اعتبار سے لکھنؤ کو کوئی خصوصیت نہین حاصل ہے اس لیے کہ اُسی طرز سے اور اُسی شان کی مولدخوانی سارے ہندوستان کے سُنیون مین جاری ہے - اور یہی حال سُنی صوفیون کی صحبت حال وقال کا ہے - جو ہر جگہ یکسان ہے - مسلمانون کے ہندوستان مین آنے کے زمانے ہی سے مجلس سماع کی بنیاد پڑ گئی مگر اُس سے سوا اسکے کہ قوالون کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو رتبے اور موسیقی دانی مین ڈھاڑیون اور گویون سے گرا ہوا سمجھا جاتا ہے فن موسیقی کو کوئی نمایان نفع نہین حاصل ہو سکا - حالانکہ سوزخوانی نے ایک صدی کے اندر ہی موسیقی کو اپنی لونڈی بنا لیا - اور حاکمانہ شان سے اُس پر تصرف کرنے لگی -

(۵۰)

مجلسون اور محفلون کا حال ہم بیان کر چکے - اب ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم لوازم صحبت کو بھی شرح وبسط سے بتا دین - اس لیے کہ یہ وہ چیزین ہین جن سے معاشرت اور وضع صحبت کا حال آئینے کی طرح روشن ہو جاتا ہے - لوازم صحبت بہت زیادہ بلکہ بے شمار ہین - جن کو ہم وقتاً فوقتاً بتائین گے - مگر فی الحال سب سے مقدم چیزین حقہ - خاصدان - لوٹیا - اور اُگالدان ہین - یہ اس قدر ضروری اشیا ہین کہ رؤسا کے ہمراہی خدمتگارون کے پاس لازمی طور پر موجود رہا کرتی ہین - چند روز پیشتر اعلیٰ طبقے کے دولتمندون کے ہمراہ ایک خدمتگار کے ہاتھ مین حُقہ بھی رہا کرتا تھا - مگر اب یہ طریقہ چھوٹ گیا - حُقہ دراصل دہلی کی ایجاد ہے - اور وہین شاہی بھنڈی خانون مین مختلف وضعون کے حقے تیار ہوئے تھے - لکھنؤ نے جو کچھ ترقی کی وہ سب سے پہلے نیچون - چلمون - اور چنبرون کی شکل اور قطع کی اصلاح سے متعلق ہے - دہلی کے حقے بھدّے اور بدصورت تھے لکھنؤ مین نہایت موزون وخوشنما بنا دیے گئے پھر تانبے پیتل - پھول اور جست کے کے حقون کے علاوہ مٹی کے چُھٹے ایسے خوشنما بن گئے جو لوگون کو اپنی نفاست و

نزاکت کے لحاظ سے نہایت ہی پسند آئے۔ اور اکثر لوگون کو مٹی کے نازک سبک خوشنما اور سوندھے حقے پُر تکلف قیمتی حقون سے زیادہ اچھے معلوم ہوئے۔

حقون کی شکل مین اصلاح و ترقی ہونے کے بعد خود تنباکو مین عجیب عجیب لطافتین اور خوبیان پیدا کی گئین۔ تنباکو کو گڑ یا شیرے مین ملا کے کوٹ لینا غالباً دہلی ہی کی ایجاد ہے۔ جس کی وجہ سے پینے کی تنباکو کی اصلاح مین ہندوستان کو دنیا کے سارے ملکون اور صفحۂ زمین کی تمام قومون پر فوقیت حاصل ہے۔ تنباکو ساری دنیا مین پیا جاتا ہے۔ چُرٹ۔ سگریٹ۔ اور پائپ کے لیے تنباکو کی اصلاح مین اگرچہ یورپ نے بے انتہا کوششین کین اور طرح طرح کی نفاستین پیدا کردین مگر یہ تدبیر کسی کو نہ سوجھ سکی کہ شیرہ یا گڑ ملا کے تمباکو کی تلخی اور گلوگیری مٹائی جائے اور دھوئین مین لطف اور قیام پیدا کیا جائے۔ اسکے بعد لکھنؤ نے یہ ترقی کی کہ خمیرہ بنا کے اور خوشبوئین شریک کر کے تنباکو سی بدبودار ناگوار چیز کو اس قدر خوش آیندہ اور لطیف بنا لیا کہ چلم بھر کے رکھتے ہی سارا کمرہ خوشبو سے مہک اُٹھتا ہے۔ اور جو حقہ نہ پیتے ہون اُن کا بھی جی چاہنے لگتا ہے کہ دو ایک کش کھینچ لین۔ ہندوستان کے بعض خطّون کا تنباکو بہت اچھا ہوتا ہے اور اُن شہرون کے نام سے تنباکو مشہور بھی ہو گیا ہے۔ مگر وہ شہرت کسی انسانی کوشش کا نتیجہ نہین۔ کوشش اور تدبیر سے جو نفاست تنباکو مین لکھنؤ نے پیدا کی ہے اور کسی شہر کو نہین نصیب ہوئی۔ اکثر شہرون کے لوگ خمیرے کو نہین پسند کرتے۔ یا شاکی ہین کہ اس سے نزلہ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ محض اُن کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور ویسا ہی ہے جیسے انگریزون کو قورمہ ناپسند ہے یا اُسے ہضم نہین کر سکتے۔ تنباکو کے ساتھ حقے کے تمام لوازم مین ترقی ہوئی۔ چلمین بھی پہلے سے زیادہ نازک و نفیس اور خوشنما ہو گئین۔ پیچون مین بھی ترقی ہوتی رہی پیچوان مین خوبصورت تہری نقرئی زنجیرین لگائی گئین۔ طرح طرح کی نہالین ایجاد ہوئین۔ پھر پھولون کے نفیس اور دلفریب حقے ایجاد ہوے۔ غرض یہان کی سوسائٹی نے حقے کو سنوار کے اور آراستہ کر کے دولھن بنا دیا۔

حقے کے بعد نہین بلکہ اُس سے بھی زیادہ اہم چیز لوازم صحبت مین خاصدان

ہے جس کی بار بار ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ اور باہر آنے جانے مین خدمتگارون کے پاس رہتا ہے۔ خاصدان وہ چیز ہے جس مین پانون کی گلوریان بناکے رکھی جاتی ہین۔ پان ہندوستان کی قدیم چیز ہے۔ ہندوؤن کے زمانے سے اُس کی اہمیت چلی آتی ہے۔ اگلے دنون راجاؤن اور بادشاہون کو جب کوئی بڑی مہم پیش آتی یا کوئی ذمہ داری کا کام لینا ہوتا تو پان کا بیڑا (گلوری) بناکے سامنے رکھتے اور کہتے کہ کون اسے اُٹھائے گا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا کہ "اس مہم پر کون جائے گا؟" یا اُس ذمہ داری کے کام کو کون انجام دے گا؟ ارکان دولت۔ سردارون۔ یا عام حاضرین دربار مین سے جو کوئی اُس بیڑے کو اُٹھا لیتا وہ گویا وعدہ کرتا کہ اس کام کو مین انجام دون گا۔ یا اس مہم کو مین سر کرون گا۔ یہ رسم تو مٹ گئی۔ مگر یہ کہاوت آج تک زبانون پر موجود ہے کہ "فلان شخص نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے"۔ یعنی اُسکو اپنے ذمے لیا ہے۔

پُرانے دربارون مین حاضرین کو انعام واکرام کے ساتھ پان بھی مرحمت ہوا کرتے۔ جس کا ذکر ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامے مین کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پان ہندوستان کی تاریخی چیز ہے۔ لہذا چاہیے تھا کہ مرور زمانہ سے پانون اور پان کے سامان کو یوماً فیوماً ترقی ہوتی رہتی۔ مگر ہمین بالکل نہین نظر آتا کہ پان جب تک دہلی مین تھا اُس کو کیا ترقی ہوئی۔ اُسکے مسالے کے جو اجزا قدیم الایام سے چلے آتے ہین آخر تک وہی قائم رہے۔ اور اُن کی بھی کسی قسم کی اصلاح نہین ہوئی۔ اُسکے مسالون مین کتھا۔ چونا۔ ڈلیان۔ اور الائچیان قدیم زمانے ہی مین منتخب ہو چکی تھین۔ تنباکو بھی لکھنؤ مین آنے سے پہلے ہی اُسکے اجزا مین شامل ہو چکا تھا۔ مگر اس کا بالکل پتہ نہین لگتا کہ اگلی بیسیون صدیون اور سیکڑون گذشتہ دربارون اور سلطنتون نے اُس کو کون سی خاص ترقی دی۔ لکھنؤ مین پان کا رواج دہلی کی بہ نسبت بہت زیادہ ہو گیا۔ اِس کے لیے خاص قسم کے ظروف ایجاد ہوے۔ اور اُس کی تمام چیزون کو جدا جدا ترقی حاصل ہوئی۔ پہلے تو خود پانون یعنی اُسکے پتون کی اصلاح ہوئی۔ ہندوستان کے بعض شہرون مثلاً مہوبے وغیرہ کے پان قدرتی طور پر بہت اچھے اور اعلیٰ درجے کے ہوتے ہین۔

اطراف لکھنؤ مین اگرچہ پان کثرت سے پیدا ہوتے ہین مگر اُن مین بالذات کوئی خاص خوبی و فوقیت نہین ہوتی۔ مگر یہان کے ترقی پسند اُمرا کی توجہ سے تنبولیون (پان والون) نے صنعتی اصول پر پانون کو ترقی دینا شروع کی۔ اور اس درجے پر پہونچا دیا کہ یہان کے پان سب جگہ سے بڑھ گئے۔ وہ پانون کو مہینون زمین مین دفن کرکے رکھتے ہین۔ یہان تک کہ اُن کا کچا پن دُور ہو جاتا ہے۔ ہرائند بالکل نہین باقی رہتی ہے۔ رگین نازک اور نرم ہو جاتی ہین۔ رنگ مین سفیدی اور پختگی آجاتی ہے۔ کچے پان مین جو ایک طرح کی تیزی ہوتی ہے وہ بھی جاتی رہتی ہے۔ اور ایسا نرم اور نازک اور لطیف ہو جاتا ہے کہ کسی جگہ کا پان مزے اور لطف مین اُس کا مقابلہ نہین کرسکتا۔ یہی بیٹھے ہوے پان بنگلی پان کہلاتے ہین جو دُور دُور کے شہرون مین جاتے اور نہایت ہی شوق اور بڑی قدر سے لیے جاتے ہین۔

پان کے پتّے کے بعد چُونا ہے۔ ہر جگہ اور ہر شہر مین معمولی چُونا استعمال ہوتا ہے جو اکثر چھنا ہوا صاف بھی نہین ہوتا۔ ماسوا اس کے چونا نہایت ہی تیز اور اکّال چیز ہے۔ نیا تازہ چونا ہوا یا زیادہ ہوگیا تو منہ کٹ جاتا ہے۔ ان مضرتون سے بچنے کے لیے یہان یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ اُسے خوب چھان کے اور صاف کرکے اُس مین تھوڑی سی بالائی یا تازے دہی کا توڑ چھان کر ملا دیتے ہین۔ اس طریقے سے لکھنؤ کے نفیس مزاج لوگون کے پاندانون مین ایسا اچھا خوشگوار۔ لطیف اور بے ضرر چونا ہوتا ہے کہ اور جگہ نہین نصیب ہو سکتا۔

دوسری چیز پان کے لوازم مین سے کتھّہ ہے۔ کتھّہ بجائے خود نہایت ہی کسیلی۔ کڑوی۔ اور بدمزہ چیز ہے۔ پان مین وہ فقط چونے کی اصلاح اور اچھا رنگ پیدا کرنے کی غرض سے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اُس کا کسیلاپن بہت ناگوار گذرتا ہے جو عادت ہو جانے سے چاہے گوارا ہو جائے۔ مگر اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ ایک بدمزہ چیز ہے۔ کتھّے کے بنانے کی یہ تدبیر تو سب جگہ عام ہے کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے اُسے پانی مین پکاتے ہین اور جب جوش کھا کر وہ سرخ شربت سا ہو جاتا ہے تو کپڑے مین چھان کر پانی مین رکھ کے

جما لیتے ہین۔ عام طور پر سب جگہ اتنا ہی ہوتا ہے۔ مگر یہان ایک طباق یا توے مین راکھ بھر کے اُسپر ایک کپڑا ڈالتے ہین۔ اور اُس کپڑے پر اُس جمے ہوے کتھے کو روٹی کی طرح پھیلا دیتے ہین اور اُس پر بار بار پانی چھڑکتے جاتے ہین پانی اُس کی سرخی کو لے کر جس مین کلھٹا پن ہوتا ہے راکھ مین جذب ہو جاتا ہے اس طرح صاف کرتے کرتے کتھے کا فقط وہ لطیف ترین حصہ باقی رہ جاتا ہے جو دھوئے کپڑے کا سا سفید اور نہایت ہی نفیس ہوتا ہے۔ پھر اُس مین کیوڑے کی خوشبو دے کر یا کیوڑے کے پھولون مین رکھ کر خشک کر لیتے ہین۔ اس تدبیر پر بعض اور مقامات مین بھی اب عمل ہونے لگا ہے۔ مگر یہ ایجاد لکھنؤ ہی کی ہے۔ اور جس تکمیل کے ساتھ یہان اُس پر عمل ہوتا ہے اور کہین ہو بھی نہین سکتا۔ اب اس قسم کا کتھا اکثر تاجر لکھنؤ مین تیار کر کے فروخت بھی کرنے لگے ہین۔ جن مین سے ہمارے مکرم مہربان قاضی محمد یونس صاحب مقیم محمود نگر لکھنؤ نے بہت شہرت حاصل کی ہے۔ مگر نفاست پسند اُمرا کے گھرون مین جو سفید۔ اچھا اور صاف کتھا خود ہی بنا لیا جاتا ہے۔ وہ اس قدر نفیس ہوتا ہے کہ اُس کی نفاست کو بازار والون کا تیار کیا ہوا کتھا چاہے کیسا ہی اچھا ہو نہین پہونچ سکتا۔ دکن کے شہرون پونا وغیرہ مین ایک نئی طرح کا بنا ہوا خشک کتھا بازار مین ملتا ہے۔ جو سوکھا ہی پان مین ڈالا جاتا ہے۔ وہان کے لوگون کو وہ کتھا پسند بھی ہے مگر ہم باوجود کوشش کے اُس کی خوبیون کو نہ محسوس کر سکے اور نہ سمجھ سکے۔ اس لیے کہ بظاہر وہ کِرکِرا بھی ہوا کرتا ہے اور کسیلا پن اُس مین اصلی بے بنے کتھے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

پان کے مسالون مین تیسری چیز ڈلیان ہین جو سروتے سے کاٹ کے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے پان مین ڈالی جاتی ہین۔ اُن کا کاٹنا ایک معمولی چیز تھا مگر لکھنؤ مین ڈلیون کا کاٹنا بھی ایک صنعت بن گیا۔ اس لیے کہ اب اکثر خاتونین باجرے کے دانون کے برابر باریک کاٹتی ہین جس مین سب دانے برابر اور یکسان ہوتے ہین۔ اور پھر اس شرط کے ساتھ کہ چورا زیادہ نہ نکلے اور ڈلی کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے۔

الائچیون مین کسی اصلاح کی گنجایش ابھی تک محسوس نہین ہوئی اس لیے کہ جیسی آتی ہین ویسی ہی استعمال ہوتی ہین - مگر تکلفات نے اتنا ضرور کیا ہے کہ خاص تقریبون مین اور خاص موقعون پر اُن پر چاندی کا ورق لگا دیا جاتا ہے - اور جب خاصدان یا تھالی مین رکھی جاتی ہین تو معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کے چمکتے ہوے ٹکڑے رکھے ہین -

اس کے بعد تنباکو ہے - تنباکو کا استعمال دھوئین کی صورت مین جس طرح عالمگیر ہے اُسی طرح کھانے مین بھی اُس کا رواج بڑھتا جاتا ہے - انگلستان مین مین نے بہت سے انگریزون کو دیکھا جو تنباکو کی خشک پتی مل کر پھانک لیا کرتے ہین - ہندوستان مین بھی مدت سے خشک تنباکو کے کھانے کا رواج چلا آتا ہے - جس کو دہلی مین اس کی سنہری رنگت کے لحاظ سے زردہ کہتے ہین - پہلے فقط غیر مدبر اور غیر اصلاح شدہ پتی کو پان مین ڈالکر کھایا کرتے تھے - مگر اگلے ہی دنون یہ بھی رواج تھا کہ بہت سے گھرون مین تنباکو کی پتی مین اُس کے ڈنٹھلون کو اُبال کر اور اُس کے عرق مین چند اعتدال پر لانے والے خوشبودار مسالے ملا کر تنباکو کی کڑواہٹ اپنے مذاق کے مطابق گھٹا یا بڑھا دی جاتی - اور لطافت و خوشگواری کے ساتھ اُس مین ایک جانفزا خوشبو بھی پیدا کر دی جاتی - مگر یہ تدبیر مخصوص گھرون اور خاندانون تک محدود تھی - عام لوگ تنباکو کی پتی ہی بغیر بنائے کھاتے - جو ہر پاندان مین موجود رہا کرتی - لیکن اب تقریباً بیس برس ہوے منشی سید احمد حسین صاحب نے اپنی ایجاد سے ایک خاص قسم کا بنا ہوا تنباکو جس کی صورت ٹُرتے دار بارود کی سی ہوتی ہے ملک کے سامنے پیش کیا - اور وہ ایسا مقبول ہوا کہ چند ہی سال کے اندر بے بنی پتی کے کھانے کا رواج قریب قریب اُٹھ گیا -

(۵۱)

تنباکو مین پتی کی اصلاح سے پہلے جس کا سہرا ہمارے مکرم دوست منشی سید احمد حسین صاحب کے سر ہے - اصلاح کی ایک اور کامیاب کوشش کی گئی - وہ یہ

کہ تمباکو کی پتی اور ڈنٹھلوں کو خوب اچھی طرح اُبال کر اُس کا عرق نکال لیا جاتا ہے اور پکاتے پکاتے وہ اس قدر گاڑھا کر دیا جاتا ہے کہ لیئی یا تازی افیون کی سی شکل ہو جاتی ہے - پھر اُس میں مشک - کیوڑا - اور بہت سی مناسب خوشبوئیں ملا کے اس درجہ لطیف و معطر بنا دیا جاتا ہے کہ پان کے ساتھ رتی برابر قوام کھا لیجیے تو تمباکو کا مزہ آنے کے ساتھ مُنہ میں دن بھر خوشبو آتی رہتی ہے - پھر نفاست مزاجی نے اس پر اور زیادہ ترقی کی یعنی اُس قوام کی ننھی ننھی گولیاں بنائی جاتی ہیں - اور ہر گولی ایک خوراک کی مقدار میں ہوتی ہے - پھر گولیوں پر چاندی یا سونے کے ورق لپیٹ کر اُن کو ایسا خوشنما اور دلفریب بنا دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے موتی رکھے ہوئے ہیں - قوام اور گولیوں کو مفتی گنج کی ایک بیگم صاحب بے مثل بناتی تھیں - خاص لکھنؤ والوں کو اُنکے ہاتھ کی بنی ہوئی گولیوں کے سوا کسی کارخانے کی گولیاں نہیں پسند تھیں - مگر اُنھیں کے زمانے میں اصغر علی محمد علی کے کارخانے نے ان دونوں [illegible]ن کو تیار کر کے سارے ہندوستان کے سامنے پیش کر دیا - چند روز بعد ان بیگم صاحب کا انتقال ہو گیا - اور ہر جگہ اصغر علی کے کارخانے ہی کے قوام اور گولیوں کا رواج ہو گیا - بعد ازاں اور بہت سے لوگوں اور متعدد کارخانوں نے ان چیزوں کو اپنے اہتمام سے تیار کیا - مگر ابھی تک کوئی بھی اصغر علی مرحوم کے کارخانے سے سبقت نہیں لے جا سکا - لیکن قوام اور گولی میں ایک عیب تھا - وہ یہ کہ چاہے خوشبو دیر تک ٹھہر جائے مگر تمباکو کا مزہ اور اُس کا کڑوا پن پہلی ہی پیک میں جاتا رہتا - اسی عیب کو مٹانے کے لیے منشی سید احمد حسین صاحب نے یہ جدید مدبر و معطر پتی ایجاد کی جس کی تلخی اور عطریت آخر تک پان کا ساتھ دیے جاتی ہے - اور اسی خوبی کا نتیجہ ہے کہ یکایک دنیا کا رُخ اس طرف پھر گیا - اور قوام اور گولیاں گو اب بھی تیار کی جاتی ہیں مگر تقویم پارینہ ہو گئیں - اور اُن کا مذاق گھٹنے کی یہی رفتار رہی تو اُمید ہے کہ تھوڑے زمانے میں بالکل مٹ جائیں گی -

پان ہی کے متعلق یا اُسکی مناسبت سے لکھنؤ میں چند اور ایجادیں ہوئیں یعنی ایسی الائچیاں ایجاد کی گئیں کہ ایک الائچی کھا لیجیے تو مُنہ پان سے زیادہ سرخ ہو جاتا ہے ان کی تیاری میں اگرچہ پان ہی کے اجزا سے کام لیا جاتا ہے جو رنگ ملا کر الائچی کے

چھلکوں میں بھر دیے جاتے ہیں مگر بجز اس کے کہ رنگ چوکھا آتا ہے وہ پان کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ اور کسی سکے پان کھانے کی غرض اُن مصنوعی الائچیوں سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ اسی طرح ایک اور قسم کی الائچیاں تیار کی گئیں جن میں مسی بھر دی جاتی ہے۔ اور عورتیں بجائے اس کے کہ دیر تک بیٹھ کر مسّی ملیں اس قسم کی ایک الائچی پان میں ڈال کر کھا لیں تو مسّی خود بخود لگ جاتی ہے۔ اور گہری نیلگوں خوب اچھی طرح ریخوں میں جم کر بیٹھ جاتی ہے۔ مگر ان دونوں قسم کی الائچیوں سے وہ مقصد بخوبی نہ حاصل ہو سکا جس کے لیے ایجاد کی گئی ہیں۔ مثلاً سرخ الائچیاں پان کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ اور سیاہ الائچیوں میں عمدہ معطر مسی کی خوشبو نہیں ہوتی اس لیے عام پسند اور مقبول نہ ہو سکیں۔ اور آج تک اُن سے بجز مذاق اور دل لگی کے کوئی ضروری کام نہیں لیا جا سکتا جو لازمۂ معاشرت ہو۔

اسی سلسلے میں ہمیں چکنی ڈلی کو بھی بیان کر دینا چاہیے جو اگر پان کا جزو لاینفک نہیں تو اُسکے لواحق میں ضرور ہے۔ بعض لوگ معمولی ڈلیوں کے عوض اُسے پان میں کھاتے ہیں۔ اور پان میں نہ کھائیں تو بہت سے لوگ اسے تنہا مُنہ میں رکھتے ہی جو الائچی کے ساتھ مل کر بہت لطف دیتی ہے۔ خصوصاً ہندو جناب چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ کی گلوری نہیں کھا سکتے اس لیے اُن کی خاطر و تواضع محض چکنی ڈلی اور الائچی ہی سے ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ بھی معاشرت کا ایک ضروری سامان بن گئی ہے۔

چکنی ڈلی دراصل وہی ڈلی ہے جو پانوں میں ڈالی جاتی ہے۔ مگر مدبر اور اصلاح شدہ۔ یہ لکھنؤ یا دہلی یا حیدرآباد یا دیگر متمدن شہروں میں نہیں بنتی بلکہ جہاں پیدا ہوتی ہے وہیں سے بنی بنائی آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اصلی ڈلی کو دودھ میں ڈال کے اُبالتے اور پکاتے ہیں۔ خیر جس طرح بنتی ہو۔ اُس میں ایک لعاب پیدا ہو جاتا ہے خشکی دفع ہو کے دُہنیت آ جاتی ہے۔ اور بعض اوقات زیادہ ڈلی کھا جانے سے گلے میں جو پھندا پڑ جاتا ہے وہ عیب چکنی ڈلی میں بالکل نہیں باقی رہتا۔ اور سچ یہ ہے کہ معمولی ڈلی سے بدرجہا زیادہ بامزہ۔ لطیف و نفیس ہو جاتی ہے۔

جہان تک مجھے معلوم ہے چکنی ڈلی کا رواج حیدرآباد - دہلی اور دیگر شہرون مین لکھنؤ کے مقابل بہت زیادہ ہے - اور اُنھین مقامات کے شوقینون کا کام تھا کہ اُس مین کسی قسم کی اصلاح کرتے یا اُس کو اپنے مذاق مین ترقی دیتے - مگر تعجب ہے کہ کسی شہر مین اس جانب توجہ نہ کی گئی - اور چکنی ڈلی کی بھی اصلاح کی تو لکھنؤ والون نے - چکنی ڈلی کا اصلی مغز نہایت لطیف - خوش مزہ و نازک ہوتا ہے اور جو حصہ قشر سے ملا رہتا ہے کسی قدر کھٹا رہ جاتا ہے - خصوصاً پیندی کی طرف کا حصہ بہت زیادہ ناقص ہوتا ہے - انھین عیوب کے مٹانے اور ناقص حصے کے نکال ڈالنے کے خیال سے لکھنؤ مین کاٹ چھانٹ کر معمولی چکنی ڈلیان کئی قسم کی تیار ہونے لگین - سب سے اول تو دورخی کہلاتی ہین - اُنکے بننے کی شان یہ ہے کہ نیچے اوپر سے زیادہ تر حصے کو اور تھوڑے تھوڑے کنارون کو گرد سے کاٹ کر خوشنما اور خوش رنگ کٹوریان سی بنا دی جاتی ہین جن مین فقط وہی نرم و لطیف مغز رہ جاتا ہے جو چکنی ڈلی کا بہترین حصہ ہے - دوسرے درجے کی چکنی ڈلیان یک رخی کہلاتی ہین - اُن مین بھی اگرچہ چارون طرف سے تھوڑی بہت کاٹ چھانٹ ہوتی ہے - مگر نیچے اوپر کے دونون ناقص حصون مین سے ایک طرف کا زیادہ تر حصہ چھوڑ دیا جاتا ہے - تیسری قسم یہ ہے کہ چکنی ڈلی کے مغز کے خوشنما ہشت پہل ٹکڑے بنا دیے جاتے ہین - اس کاٹ چھانٹ مین جو چورا نکلتا ہے وہ جداگانہ فروخت ہوتا ہے - اور دراصل لکھنؤ مین وہ بجائے چکنی ڈلی کی پانچوین قسم بن گیا ہے - پھر اُس کی بھی دو تین قسمین ہو گئی ہین - اس لیے کہ دورخی اور یک رخی ڈلیون مین سے جو چورا نکلتا ہے وہ الگ رہتا ہے - اور دونون کی لطافت - نرمی - اور مزے مین نہایت فرق ہوتا ہے - اور اسی وجہ سے اُن کی قیمتون مین بھی زمین و آسمان کا فرق رہا کرتا ہے - الغرض چکنی ڈلی اگرچہ اس قدر زیادہ لکھنؤ والون کے شوق کی چیز نہین ہے - مگر اسکی اصلاح بھی اُنھون نے اس قدر کی جو کسی جگہ نہین ہو سکی تھی -

اب چونکہ پان کے اجزا ختم ہو گئے لہذا ہم اُسکے ظروف و آلات کی طرف توجہ کرتے ہین - پانون کا سامان رکھنے کی سب سے اہم چیز یا یون کہیے کہ پانون

کی گلوریوں میں جو قوت برقی کی سی اخلاقی اور معشوقانہ کشش ہوتی ہے اُسی بیٹری
پاندان ہے۔ اگلے زمانے میں خصوصاً دہلی میں پٹاری ہوا کرتی تھی جو گول اور مربع
یا ہشت پہل سب قطعوں کی ہوتی ہیں۔ اور غالباً دہلی ہی سے حیدرآباد میں پٹاری نما
پاندان گئے۔ جن کی نقل وہ ٹین اور شیشے کے مربع پاندان ہوتے ہیں جو حیدرآباد
کی شادیوں میں کمال فیاضی سے چونا۔ کتھا۔ ڈلیاں۔ چکنی ڈلیاں۔ الائچیاں۔
لونگیں اور پان وغیرہ رکھ کر عہدوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ہر حال پرانے پاندان
یہی پٹاریاں تھیں۔ اور انھیں پٹاریوں کو ساتھ لیے ہوے دو ڈیڑھ صدیوں پیشتر کی
محترم خاتونیں دہلی سے لکھنؤ میں آئی تھیں۔ یہاں جب تک دہلی کی تقلید رہی وہی
پٹاریاں رہیں۔ مگر جس دن سے لکھنؤ والوں نے اپنی وضع۔ معاشرت اور زبان
میں اپنی تراش خراش شروع کی اُس روز سے پاندانوں کا نقشہ بھی بدلنا شروع
ہو گیا۔ پہلے تو پان رکھنے کے لیے فقط تانبے کی قلعی دار گول پٹاریاں اختیار کی گئیں۔
پھر اُنکے ڈھکنے میں بلندی اور گولائی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ چند روز میں اُن کی
قطع ایک چوڑے نقرئی قبّے کی سی ہو گئی۔ جس پر چوٹی کی جگہ گرفت کے لیے ایک
لمبوترا کڑا لگا دیا جاتا ہے۔ کڑے کے دونوں سرے کنڈھوں میں پھنسا دیے جاتے
ہیں۔ چنانچہ بجاے اوپر کی طرف قائم رہنے کے وہ ادھر اُدھر پڑا رہتا ہے۔
اس پاندان کے اندر دو کتھے چونے کی کلھیاں ہوتی ہیں جن کی قطع بعینہٖ چھوٹی پتیلیوں
کی سی ہوتی ہے۔ انھیں کلھیوں کے سلسلے میں تین برابر کی بڑی ڈبیاں ہوتی ہیں۔
جن میں سے بعض میں مسلّم اور بعض میں کٹی ہوئی ڈلیاں اور چکنی ڈلیاں رکھی جاتی
ہیں۔ یہ تینوں ڈبیاں اور دونوں کلھیاں برابر ایک حلقے میں جمی رہتی ہیں اور
اُنکے بیچ میں یعنی مرکز کے مقام پر جو جگہ چھوٹتی ہے اُس میں ایک اور چھوٹی ڈبیا
رکھ دی جاتی ہے۔ جس میں علی العموم الائچیاں یا لونگیں رکھی جاتی ہیں۔ ڈبیوں
کے ڈھکنے کسے ہوے ہوتے ہیں۔ خود بخود نہیں کھل سکتے بلکہ کھلنے میں تھوڑا بہت
زور مانگتے ہیں۔ مگر کلھیوں کے ڈھکنے تھالی نما ہوتے ہیں جو اُن کے منہ پر رکھ دیے
جاتے ہیں۔ کتھے چونے کی کلھیوں میں کتھا چونا لگانے کی چمچیاں ہوتی ہیں جن کے
سروں پر کبھی تو مور بنا دیا جاتا ہے اور کبھی سادی رہتی ہیں۔ ان کلھیوں کے اوپر

ایک بڑی پورے پاندان بھر کی تھالی ہوتی ہے جس مین پان کپڑے مین لپیٹ کر رکھ دیے جاتے ہین۔ اگلے دنون ایک اور پان کی قطع کا بد اگاند ڈھکنے دار ظرف ہوتا تھا۔ جس مین پان رکھے جاتے۔ وہ ناگردان کہلاتا تھا۔ مگر تجربے نے اُسکو غیر ضروری اور ناقص ثابت کیا۔ اس لیے کہ اُس مین بند کر دینے سے ہوا نہ لگتی اور پان خراب ہو جاتے۔ اسی وجہ سے ناگردان اگرچہ بعض بعض پُرانے پاندانون مین اب بھی نظر آ جاتا ہے مگر دراصل اُس کا رواج بالکل چھوٹ گیا۔ اور عنقریب عنقا ہو جائے گا۔

چند روز مین پاندان عورتون کو صندوق۔ خزانے۔ اور کشتی کبس کا کام دینے لگا اور عورتون کے لیے سچ یہ ہے کہ وہ ہندستان مین عمرو عیار کی زنبیل تھا۔ اس ضرورت سے وہ وسعت اور جسم مین بڑھنا شروع ہوا۔ یہان تک کہ دس دس سیر اور بیس بیس سیر کے پاندان بننے لگے۔ اور پھر سخت ضروری تھا کہ جہان جانے مین ہر جگہ وہ ساتھ رہے۔ اس لیے کہ بمصداق "شملہ بمقدار علم" جتنا بڑا پاندان ہوتا تھا اُتنی ہی بڑی بیگم صاحب کی حیثیت و وجاہت سمجھی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈولی مین ساری جگہ پاندان لے لیا کرتا۔ اور بیگم صاحب کو بڑی مشکلون سے دبنے اور سمٹنے کے بعد بیٹھنے کو جگہ ملتی۔ بہرتقدیر پاندان وزن اور قامت مین روزافزون ترقی کرتے جاتے تھے کہ یکایک اختصار پسندی نے نئی طرح کے چھوٹے۔ ملبند۔ گنبدنما۔ اور کلس دار پاندان ایجاد کیے جو پہلے تو آرام دان کہلاتے تھے مگر اب عموماً حسن دان کے نام سے یاد کیے جاتے ہین۔ اُن مین اندر تو وہی چیزین ہوتی ہین جو پاندان مین ہین۔ مگر بیرونی قطع ایک کلس دار خوشنما گنبد کی سی ہوتی ہے۔ اور بجاے کڑے کے اُسی کلس یا چوٹی کو پکڑ کے اُٹھایا جاتا ہے۔ یہ حسن دان عموماً پسند کیے گئے۔ لکھنؤ مین بھی اور دیگر بلاد مین بھی اُن کی مانگ بڑھی۔ لکھنؤ مین پہلے پہل اُن کو مردون نے اختیار کیا۔ یا اُن لوگون نے جو نمایش اور دکھاوے کو پسند نہین کرتے ہین۔ مگر چند روز مین عام ہو گیا۔ اور گو کہ اگلی وضع کے پاندان نہین مٹے مگر اب زیادہ رواج حسن دانون ہی کا ہے۔ اور جن گھرون مین پاندان باقی بھی ہین تو اتنے بڑے نہین بلکہ چھوٹے۔ اب مُرادآباد مین بھی ایسے ہی لکھنؤ کی وضع کے

حسن دان بننے لگے ہین - گر وہ زیادہ پھیلے ہوتے ہین اور اُس قدر خوبصورت نہین ہوتے جیسے کہ لکھنؤ مین بنائے جاتے ہین - لکھنؤ کے حسن دانون کا تناسب ہی ایک چیز ہے جو یہان کے ساتھ مخصوص ہے - اور کسی جگہ کے کاریگرون سے اُس تناسب کا قائم رہنا قریب قریب غیر ممکن ہے -

پاندان کے بعد "خاصدان" ہے - یہ وہ ظرف ہے جس مین رکھ کے گلوریان محفل یا صحبتِ احباب مین لائی جاتی ہین - دلّی مین یہ کام ایک کھلی ہوئی تھالی دیتی ہے جس مین ایک طرف کتری ہوئی ڈلیان رکھ دی جاتی ہین - اور دوسری طرف آدھے آدھے پان چونا کتھا لگا کر اور دوہرا کے یعنی موڑ کر رکھ دیے جاتے ہین - اور چونکہ اب بھی وہان یہی تھالی مروج ہے اس لیے امید ہے کہ اگلے زمانے مین بھی پانون کے صحبت مین لانے کا یہی طریقہ ہوگا - گر لکھنؤ مین کم از کم دو پانون کی گلوریان بنائی جاتی ہین - جو پہلے تو سنگھاڑے کی وضع کی خوب گھٹی ہوئی ہوتی تھین - اب عموماً بیڑے ہوتے ہین - اور ان کی قطع ایسی ہوتی ہے جیسی کہ بوتلون مین لگانے کے لیے کاغذ کی ڈاٹ بنائی جاتی ہے - پھر اُنکے قائم رکھنے کے لیے کیلین لگا دی جاتی ہین - پہلے لونگین لگا دی جاتی تھین - بعد ازان زنجیرون کا ایک لچھا ایجاد ہوا - لچھے کی صورت یہ ہے کہ چاندی کی ایک چھوٹی ڈبیا یا کیری نما عطر دان مین چارون طرف بہت سی زنجیرین لگا دی جاتی ہین جن مین کیلین لگی ہوتی ہین - یہ پورا لچھا مع پانون کے خاصدان مین رکھ دیا جاتا ہے - گر اس کو تطویل خیال کر کے یہ رواج ہوگیا کہ گلوریون مین لوہے کی کیلین لگا دی جایا کرین - گر اب سب سے اچھا طریقہ یہ ایجاد ہوا ہے کہ گلوری کے اوپر پان ہی کا ایک غلاف چڑھا دیا جاتا ہے جو اُسکو کھلنے نہین دیتا -

بہر حال ان گلوریون کے لیے صرف تھالی مناسب نہ تھی - اسی لیے اُس تھالی پر ایک گنبد نما کلس دار ڈھکنا ایجاد کیا گیا جسکو تھالی پکڑ لیا کرتی - ڈھکنے نے خاصدان کی صورت بھی چھوٹے حسن دان کی سی کر دی -

پانون کی گلوریان رکھنے کے لیے اگرچہ خاصدان مین بہت ترقی کی گئی۔ اُسکی خوشنائی ولنظر فریبی مین کوئی دقیقہ نہین اُٹھا رکھا گیا۔ مگر جب یہ نظر آیا کہ گرمیون کے موسم مین تانبے کے قلعی کیے ہوے خاصدان جل اُٹھتے ہین۔ اور اُن مین رکھنے سے پُرتکلف گلوریون کے خشک ہونے کے علاوہ وہ ایسی گرم ہو جاتی ہین کہ کھانے مین بجاے تفریح کے تکلیف ہوتی ہے۔ اور بعوض تسکین کے منہ خشک ہو جاتا ہے تو اُس موسم مین اُنکے رکھنے کے لیے مٹی کی کوری ہانڈیان اختیار کی گئین جن مین پان ٹھنڈے رہتے ہین۔ اُن کی تازگی و فرحت بخشی مین اور ترقی ہو جاتی ہے۔ اور اُن مین نہایت ہی سوندھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کاغذی ہانڈیان لکھنؤ مین ایسی سبک۔ خوشنما اور ورق کی سی باریک بنتی ہین کہ اور کسی جگہ نہین بن سکتین جب اُن کو پانی مین بھگو کے اور اُن مین گلوریان رکھ کے سامنے لائی جاتی ہین تو پان تو بعد کھایا جائے گا اُن کی صورت دیکھتے ہی آنکھون مین تازگی آجاتی ہے۔

پھر اُمرا کے تکلف نے اس خیال سے کہ انکو بار بار بھگونا دشوار ہے اور جب تک پانی مین تر نہ ہون اُن مین لطف نہین آ سکتا۔ اُن پر کپڑا منڈھا تاکہ کپڑا اُنکو تر رکھے۔ اور معمولی سفید کپڑا چونکہ جلدی میلا ہو جاتا ہے اور گلوریان رکھنے کی وجہ سے اُس مین جا بجا سرخ دھبے پڑ جاتے ہین اس لیے بجاے سفید کے اُن پر سرخ ٹول منڈھا گیا جو نہ جلدی مَیلا ہوتا ہے اور نہ پان کے دھبے اُسکو بدنما کر سکتے ہین۔ زیادہ آرایشگی کے لیے ان ہانڈیون مین ٹول پر باریک روپہلی دھنک سے بہانکین سی بنا دی جاتی ہین۔ جن چیزون نے پان کی ہانڈیون کو بنا سنوار کے دولھن بنا دیا۔

تانبے کے خاصدان بھی عموماً غلاف مین بند رہتے ہین۔ اور اسی طرح کے غلافون کا رواج پاندانون اور حسن دانون کے متعلق بھی ہے۔ جو بڑے اہتمام سے حسب درجہ و حالت پُرتکلف بنائے جاتے ہین۔ جن مین فقط حفاظت ہی نہین آرایش بھی ملحوظ خاطر ہوتی ہے۔

ایسا ہی ٹول دھنک کے ساتھ صراحیون پر بھی منڈھا جاتا ہے۔ جسکی وجہ سے

صراحیون مین پانی خوب ٹھنڈا رہتا ہے - اور اُنکی صورت دیکھتے ہی بے پیاس کے پانی پی لینے کو جی چاہتا ہے -

پان کھانے والون کو اکثر پیک تھوکنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے - جس کے لیے بار بار اُٹھنا زحمت سے خالی نہین - اور پھر جن کمرون مین پُر تکلف فرش بچھا ہو تھوکنے کو جگہ مشکل سے اور دُور جا کے ملتی ہے - اور جگہ ملے بھی تو پیک کے دھبون سے مکان خراب ہوتا ہے - اس لیے پان ہی کے سلسلے مین ایک اور ظرف کی ضرورت پیش آئی جو تھوکنے کے لیے ہو - یہ ظرف اُگالدان کہلاتا ہے - اگالدان کوئی نئی چیز نہین جس کو لکھنؤ کے ساتھ خصوصیت ہو - پہلے اُگالدان غالباً دہلی مین ایجاد ہوے اور وہ بعینہ لکھنؤ مین منتقل ہو آئے - اُن کی قطع یہ تھی کہ نیچے گول پیندا اُسکے اوپر ایک گول لٹو پھر اُسکے اوپر کنول نما دہانہ - یہ اُگالدان تانبے پیتل اور جست کے ہر جگہ بننے لگے - بعد مین اُن پر دہان کا بے نظیر بدری کا کام یا لکھنؤ مین تانبے پر نقاشی کا کام بنایا گیا - پھر مرادآباد مین بنے اور اُن پر وہان کی نفیس نقاشی ہوئی - لکھنؤ مین پھر مٹی کے اُگالدان اُسی قطع کے بننے لگے -

مگر اُن مین خرابی یہ تھی کہ اُن کے نیچے کا حصہ ہلکا اور اوپر کا زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے وزنی ہوتا تھا - نتیجہ یہ تھا کہ اکثر بے احتیاطی یا غفلت مین گر جاتے - اور فرش خراب ہوتا - اس عیب کے دور کرنے کے لیے بجے پور - حیدرآباد - اور اُسکے بعد مرادآباد مین ایک دوسری قطع کے اُگالدان بننے لگے جو شاید دہلی ہی کے ایجاد ہون - اُنکی قطع کہارون کی مٹرک یا مداری کی ڈگڈگی کی سی ہوتی ہے - اور لکھنؤ مین بھی بہت سے لوگون کو اس قسم کے اُگالدان اختیار کر لینا پڑے - اگرچہ یہان ابھی تک پرانی وضع چھوٹی نہین اور اُسی وضع کے بہت بڑے بڑے اُگالدان اب بھی بنتے ہین مگر اب بہت سے گھرون مین اس نئی وضع کے بھی موجود ہین - مگر سچ یہ ہے کہ اُگالدان کی ایجاد و ترقی مین لکھنؤ کو کوئی خصوصیت نہین ہے - اگرچہ اُنکا رواج لکھنؤ مین ہندوستان کے تمام شہرون سے زیادہ ہے -

اب ایک نئی قطع کے بیٹھے اور پھیلے ہوے انگریزی اگالدان بھی آتے ہین جو چینی اور تامچینی کے ہوتے ہین - مگر وہ غالباً چُرٹ پیتے وقت تھوکنے کے لیے ہین - پان

کی پیک تھوکنے کے لیے بالکل موزون نہین ہین -

خاصدان کے بعد اُمرا اور خوش باش لوگون کے ہمراہی سامان مین پانی کی لوٹیا بھی ہے جو خدمتگارون کے پاس رہا کرتی ہے - علی العموم یہ تانبے کی اوسط درجے کی سادی یا نقشی لوٹیان ہوا کرتی ہین جن لوگون کو خدا نے استطاعت دی ہے اور اسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ امارت و دولتمندی نے اُن کو پابندی شرع سے آزاد کر دیا ہے وہ چاندی کی لوٹیان ساتھ رکھتے ہین -

لوٹیا پُرانی ہندوون کے عہد کی چیز ہے جو ایک بے ٹونٹی کا گول ظرف ہوتا تھا جس کا مُنہ پیٹ سے چھوٹا ہوتا - اور چونکہ کنوئین سے پانی بھرنے کی اکثر ضرورت پیش آیا کرتی اس لیے ہر مسافر کے ساتھ سفر مین لوٹیا ڈوری ضرور رہا کرتی - اور دیہات کے ہندوون اور نیز وہان کے ادنے طبقے کے مسلمانون مین آج تک اُسی اگلی شان مین اس کا رواج ہے - مسلمانون نے اپنے زمانے مین اُس لوٹیا مین ٹونٹی لگا دی تاکہ پانی کے استعمال مین آسانی ہو -

مین نہین جانتا کہ دہلی کے امرا مین بھی یہ رواج تھا - اور جن لوگون کے ساتھ خدمتگار رہا کرتے تو اُن کے پاس لوٹیا بھی ضرور ہوتی جو پانی پینے - کُلّی کرنے اور دیگر ضرورتون مین کام آیا کرتی - مگر لوٹیا کی موجودہ قطع اور اُسکی خوشنائی مین لکھنؤ کو بڑا دخل ہے - جس کا حال ہم تانبے کے برتنون کے سلسلے مین بیان کرین گے -

گرمیون مین رنگین کپڑے کا منڈھا ہوا جھالردار پنکھا بھی خدمتگارون کے پاس رہتا - اور بعد کے زمانے مین چھتری بھی لازم ہو گئی - جن کو دھوپ مین نوکر آقا کے سر پر لگائے رہتا -

گھرون کی اندرونی ضرورتون مین ہاتھ دھونے کے لیے سلفچی - آفتابہ - اور چونکہ صابون کا رواج نہ تھا اس لیے بیسن دانی بڑی ضروری چیزین تھین - سلفچی - آفتابہ ہندوستان کے دولتمند گھرانون کی پُرانی چیزین ہین جو دہلی مین خدا جانے کب سے مروج تھین - اور اپنی قدیم وضع و شان سے لکھنؤ مین آگئین - یہان سلفچی تو وہی رہی اور گو اب اُس کی جگہ تسلے کا زیادہ رواج ہو گیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ وہ سلفچی کا بدل نہین ہو سکتا - سلفچی ایک گول پیٹ کا ظرف ہے جس کا منہ ذرا چھوٹا کرکے کگرین ایک

اُگالدان طشت کی وضع مین بہت زیادہ پھیلی ہوتی ہین - اور مُنہ پر ایک پردے کی
جالی رکھ دی جاتی ہے جس مین سے ہاتھ دھونے مین سب پانی گر جاتا ہے - اُس
پردے کو جب چاہین اُٹھا کر اُسکو خوب اچھی طرح صاف کر سکتے ہین - اِس جالی
کے اوپر تھوڑی گنجائش ڈال دی جاتی ہے کہ پانی کے گرنے مین چھینٹین نہ اُڑین -
اِس مین بہت بڑی خوبی اور نفاست یہ ہے کہ میلا پانی جس کی صورت کریہ ہوتی ہے
نظر کے سامنے نہین رہتا - اور جن کے مزاج مین نفاست ہے اُن کو تکلیف ہوتی
ہے - مگر آفتابے کی جگہ لکھنؤ مین لوٹا رائج ہو گیا - دراصل آفتابہ ہی پُرانے زمانے
کا لوٹا تھا - جس پر لکھنؤ کے مذاق نے تصرف کر کے موجودہ لوٹے کی سڈول شکل پیدا
کی - پُرانا لوٹا جو آفتابہ کہلاتا اُس کی شکل یہ تھی کہ تانبے کا ایک مخروطی شکل کا ظرف
ہوتا جس مین پیٹ اور گلے کا کچھ امتیاز نہ تھا - پیندے کے پاس جتنا دَور ہوتا وہ
اوپر کی طرف تدریجاً گھٹتا چلا جاتا - آخر مین وہی گلا ہو جاتا - یہان تک کہ کنارے
موڑ کے مُنہ بنا دیا جاتا اور ایک جانب اُس مین خمدار ٹونٹی لگا دی جاتی - اس
شکل کے لوٹے حیدرآباد مین آج بھی مل جاتے ہین جو اپنی قدامت اور ہمارے
لوٹون کے نقشِ اولین کا ثبوت دیتے ہین - اُن کی شکل مصر و شام کے گلی ظروف
آب یا انگریزون کے یہان منہ دھونے کی میز پر جو چینی کا جگ رہتا ہے اُس کی سی
ہوتی - اور اسی سے خیال ہوتا ہے کہ مسلمان اس کو عرب و ایران سے اپنے ساتھ
لائے ہون گے - چند روز بعد ہندی تمدن کے اثر نے اُس مین پہلا تصرف یہ کیا کہ پیٹ
گول بن کر گردن سے جدا اور متمائز ہو گیا - مگر اصلیت کی قربت کے باعث ملتوی ترین
باقی تھا - یعنی عرض اور پھیلاؤ بلندی کی مناسبت سے نہ تھا - اُس وقت تک
پیٹ کی گولائی بھی کُرے کی مثل نہین بلکہ بیضاوی تھی - یہی شکل اُس آفتابے کی
ہے جس کا ذکر اُردو کی اگلی مثنویون اور قصے کہانیون مین ہے - لکھنؤ مین یہ ہوا کہ
پیٹ بیضاوی سے کُروی ہو گیا - اور جتنی بلندی ہوتی اُسی کی مناسبت سے
اُس کا دور اور پھیلاؤ بھی بڑھ گیا - گلون مین ایک موزون ڈھلاؤ ہو گیا اور
ٹونٹی بھی ابتداءً وسیع اور نوک کے پاس تنگ خمدار اور بہت ہی خوشنما ہو گئی - یہ
لکھنؤ کا موجودہ لوٹا ہے - جس سے زیادہ خوشنما اور سڈول لوٹے ہندوستان

کے کسی شہر مین نہین بنتے - اور ہر جگہ کے شوقین فرمائشین کر کرکے لکھنؤ سے منگوایا
کرتے ہین - جو تناسب لوٹون مین یہان پیدا ہوگیا ہے چھوٹی لٹیا سے لیکر بڑے
سے بڑے لوٹے تک سب مین نظر آتا ہے -

اسی قسم کا مناسب تصرف تانبے کے تمام برتنون مین ہوا ہے جس کو ہم آیندہ
بیان کرین گے - اس لیے کہ اس محل پر اُسکے بتانے کا موقع نہین ہے -

بیسن دانی در اصل تانبے کی ایک بے ٹونٹی کی لوٹیا ہوتی ہے جس مین بیسن
بھرا رہتا ہے - عموماً کھانے کے بعد ذہلیت چھڑانے کے لیے اُس مین سے بیسن
لیکر ملا جاتا ہے اور پھر پانی سے دھو ڈالا جاتا ہے - بعض گر بہت ہی کم لوگ
ایسے ہین جو بیسن کی جگہ بیسن دانی مین اُبٹنا یا کھلی رکھتے ہین - اس لیے کہ بیسن
کھانے کی چیز ہے جس کو ہاتھ دھونے مین ضائع کرنا اُنکے خیال مین ناجائز یا نامناسب
ہے - مگر اب اس کا رواج بہت کم ہوگیا ہے - اس لیے کہ اُبٹنا شادیون کے سوا
اور کسی موقع پر نہین بنتا - اور کھلی سے ہاتھ مین اُسکی تیز بو آنے لگتی ہے -

(۵۳)

معاشرت کے بہت سے سامان ضروری اور آداب نشست و برخاست کو
ہم اس سے پیشتر بیان کر چکے ہین مگر ابھی ہم کو یہان کے شرفا کی باہر کی آمد و رفت
کی وضع و شان بتانے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے - ہندوستان کے تمام شہرون کی
طرح یہان بھی انگریزیت اس قدر غالب آگئی ہے کہ ایشیا کے آخری تمدن مین جو
وضع پیدا ہوئی تھی بالکل مٹ گئی - مگر ہم کو اس موقع پر وہی چیز بیان کرنا ہے جو
مٹ چکی ہے یا مٹنے کے قریب ہے - لہذا ہم آج سے ساٹھ ستر برس پیشتر سے بھی پہلے
زمانے مین نکلے چلتے ہین - اور اُس زمانے کی تصویرین ناظرین کے پیش نظر کرتے ہین
جو اب کہین نہین نظر آسکتین -

آج کل کی سی عمدہ موٹرون اور لمبی چوڑی فٹنون اور لینڈو گاڑیون کے نہ
ہونے سے اور نیز حال کے اصول حفظ صحت کے پیش نظر نہ ہونے کے باعث اُن
دنون آج کل کی سی لمبی چوڑی اور وسیع و کشادہ سڑکین نہ تھین - بلکہ تنگ گذرگاہیں
تھین جن مین ہاتھی - گھوڑے - اونٹ - ہوادار - بوچے - فینسین - میانے -

سکھپالین۔ڈولیان۔رتھین۔بہلین آدمیون کی بھیڑ مین سے ہٹو بچو کرتی ہوئی ہروقت گذرا کرتی تھین۔کیسا ہی مرجع عام بازار اورکیسی ہی پسندیدہ سیرگاہ ہو سب کی حالت بلا استثنا یہی تھی۔

ایک اونٹ تو نہین جو فوجی ضرورتون۔نامہ برقاصدون یا بار برداری کے لیے مخصوص تھے۔باقی اور تمام سواریان شرفا ورؤسا مین حسب حالت و حیثیت مروج تھین۔اعلی طبقے کے شاہزادے اور نواب یا اغنیا کے درجے کے اورامرا ہوادارون اور بوچون پر سوار ہو کے نکلتے۔ہوادار۔تمٹم کی وضع کی ایک کھلی ڈولی تھی جس کے پیچھے چمڑے کا ٹپ ہوتا۔اور لوہے کی کمانیون کے ذریعے سے کھولا یا بند کیا جا سکتا۔ٹھنڈے اوقات مین جب ٹپ گرا دیا جاتا تو ہر طرف کی فضا کھلی رہتی۔آگے پیچھے اُس مین فنس کے سے ڈنڈے لگے ہوتے۔چار کہار اُس کو کاندھون پر اُٹھا کے لیجاتے۔اور جو شخص سوار ہوتا وہ نہایت وقار و تمکنت سے بازار کی سیر کرتا۔ہر چیز کو دیکھتا بھالتا۔اور شناساؤن سے صاحب سلامت کرتا ہوا جاتا۔ہوادار کی قطع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاص انگریزون کی ایجاد کی ہوئی چیز تھی۔ہندوستان مین آکر اُنھون نے اپنے مذاق کے مطابق اور اپنی جدت طرازی سے اُس کو ایجاد کیا۔اور اپنی نفاست۔خوشنمائی۔اور صفائی کی بدولت رؤسائے ہند کو بہت پسند آیا۔اب اُس کا رواج بالکل اُٹھ گیا۔اگرچہ بعض پُرانے رؤسا کے یہان چند ہوادار اب بھی پڑے ہوے ہین جو رؤسا کی معمولی آمد و رفت مین تو نہین مگر دولتمند ہندوؤن کی براتون مین وہ کبھی کبھی نظر آجایا کرتے ہین۔

بوچہ اُس سے زیادہ باوقار اورمتین سواری تھی۔اُسکی قطع آج کل کی بروہم یا ردھا گاڑیون کی سی ہوتی۔جس مین پہیون کے بجاے پائے ہوتے۔اور آگے پیچھے فنس کے ایسے دو دو ڈنڈے ہوتے۔اور کم از کم آٹھ اور اکثر سولہ سولہ کہار اُس کو اُٹھا کے لے چلتے۔اس لیے کہ وہ کہارون کے اُٹھانے کی تمام سواریون سے زیادہ بھاری ہوتا۔اس سواری پر شاید کبھی اورامرا بھی سوار ہوے ہون مگر مین نے فقط واجد علی شاہ کو کلکتے مین اس پر سوار ہوتے دیکھا۔

اور اُن کے سوا یہ سواری مین نے کہین اور کسی کے پاس نہین دیکھی - بادشاہ اپنے باغون - محلون - اور کوٹھیون مین اُسی پہ سوار ہو کے پھرا کرتے - اور گرد جلو کی خدام کے علاوہ معزز ارکان دولت اور حضور رس مصاحبین پاپیادہ ساتھ چلتے مگر یہ بھی یقیناً انگریزون کی ایجاد تھا - جو اُس عہد کی انگریزی گاڑیون سے اخذ کر کے کہارون کے اُٹھانے کے قابل بنا لیا گیا -

سُکھپال اُن دنون عورتون کی نہایت معزز سواری تھی جو خاص ہندوستانی چیز اور ہندی مذاق کے تکلفات کا مکمل نمونہ تھی - یہ ایک سرخ گنبد نما ڈولی تھی ایک لمبے چوڑے کھٹولے پر ایک شاندار لال بُرج سا بنا دیا جاتا - جس مین سونے چاندی کے کلس لگے ہوتے - چارون طرف پردے لٹکتے ہوتے - اس مین بھی آگے پیچھے دو دو یا ایک ایک ڈنڈے ہوتے اور بہت سے کہار اُنکو اُٹھا کے لے چلتے - یہ سواری عالی مرتبہ بیگمات اور محل شاہی کی خاتونون کے لیے خاص تھی -

رتھ اسی وضع کی پہیون دار گاڑی تھی جس مین بیل جوت دیے جاتے - رتھین دیہات کے تعلقدارون اور معزز زمینداروں کے یہان اور دیسی ریاستون مین اب بھی موجود ہین - مگر روز بروز بیکار ہوتی جاتی ہین - اور اُن کا رواج اُٹھتا جاتا ہے - لکھنؤ مین خاص شاہی محلات کی ضرورت کے لیے اُن دنون ہزارون رتھین تھین - شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم صاحبہ نواب آصف الدولہ کے عہد مین جب اپنی بیوگی کی زندگی ایک حکمران ملکہ کی شان سے فیض آباد مین بسر کرتی تھین تو اکیلی اُن کی سرکار مین آٹھ نو سو رتھین تھین - اور قدیم الایام مین جب شاہان دہلی اپنی مملکت مین دور و دراز کے سفر کیا کرتے تھے تو اُن کے محلات عالیات انھین رتھون پر سوار ہو کے ساتھ جاتے -

بہل بیلون کی عام گاڑی تھی جس مین ایک کھٹولے کو دو پہیون پہ قائم کرتے - پھر اُس پہ چار ڈنڈے کھڑے کر کے ایک چھتری لگا دیتے - اور اُس پہ پردے کے لیے غلاف ڈال دیا جاتا - اُس مین اکثر مرد اور عورتین سفر کرتی تھین - اُن دنون متوسط طبقے کے دیہاتیون اور شہریون دونون کے لیے سفر کا ذریعہ یہی

سواری تھی۔ بہلین دیہاتون مین اب بھی بکثرت موجود ہین۔ مگر اُن کی ضرورت روز بروز گھٹتی جاتی ہے اور عنقریب ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ یہ سواری عنقا ہو جائے گی۔

ان کے سوا تمام سواریون کو لوگ خود ہی جانتے ہین۔ ہمین ان کی شکل و صورت بتانے کی ضرورت نہین ہے۔

بہرحال یہ سب سواریان شہر کے تمام راستون اور گلی کوچون مین گذرتی نظر آتی ہین۔ زیادہ تر لوگ فنسون پر سوار ہوتے۔ علما۔ اطبا۔ امرا۔ اور خوش باش جن کو خدا استطاعت دیتا چار کہار نوکر رکھ لیتے جو خدمتگاری بھی کرتے اور سواری کا بھی کام دیتے۔ جن لوگون مین ذرا بھی بانکپن ہوتا یا سپہگرانہ شان دکھانا چاہتے جو اُن دنون تمام اہل شہر مین عام تھی وہ گھوڑے پر سوار ہو کے نکلتے۔ جو چاندی کے زیور اور کارچوبی ساز و یراق سے دولھن بنا دیئے جاتے۔ اعلی درجے کے معززین ہاتھیون پر بیٹھ کے آمد و رفت کرتے۔ جو باوجود اس قد و قامت کے تمام گلی کوچون مین بلا تکلف گذر جاتے۔ ہاتھیون پر سادی بانات یا کارچوبی جھولین ہوتین اور اُن پر کھلے ہودے یا سایہ دار بُرج نما عماریان کسی جاتین۔

زنانی سواریان جو سکھپالون اور فنسون پر ہوتین وہ بڑے تکلف اور شان سے نکلتین۔ فنس پر سرخ چھٹکے پڑے ہوتے۔ جن پر کبھی گوٹا۔ لچکا بھی ٹانکدیا جاتا۔ کہار سرخ بانات کے چغے پہنے ہوتے۔ سرون پر سرخ گلگر دار پگڑیان ہوتین جن کی گلگرون پر چاندی کی مچھلیان ٹکی رہتین۔ مچھلی ہندوستان مین بہترین شگون مانی گئی ہے۔ رخصت کرتے وقت یا کسی کو کسی اہم کام کے لیے جاتے وقت آج بھی عورتون کی زبان سے نکل جاتا ہے "دہی مچھلی" غالباً اسکو نجوم سے تعلق ہو۔ اور یہ بھی نجومیون ہی کا ٹٹکا معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کی مچھلیان بنوا کر کہارون کی پگڑی مین ٹانک دی جائین جو آگے رہتے ہین تا کہ کہین جاتے وقت مچھلیان ہر وقت پیش نظر رہین۔

زنانی فنس کے ساتھ ساتھ ایک کہاری چھٹکے کا کونا پکڑے دوڑتی جاتی۔ ان کہاریون کی وضع بھی خاص قسم کی تھی۔ سب سے بڑی پہچان یہ تھی کہ لہنگے مین

اتنی چوڑی گوٹ ہوتی ہے کہ اُس کا آدھے سے زیادہ حصہ فقط گوٹ کا ہوا کرتا۔

ان سواریوں میں سے شہر میں اب فقط فنس باقی رہ گئی ہے۔ یا کبھی کبھی کوئی رئیس گھوڑے یا ہاتھی پر دکھائی دے جاتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ باہر نکلنے میں شرفا کی کیا وضع ہوتی تھی۔ لباس کو ہم بیان کر چکے ہیں۔ مگر اُن کی تصویر دکھانے کے لیے ہمیں پھر ایک حد تک اُن کی وضع قطع بتانے کی ضرورت ہے۔ سواری کی شان کے متعلق میں نے جو کچھ بیان کیا اُس میں بجز نوچے اور ہوادار کے اور تمام چیزیں وہی ہیں جو دہلی سے آئیں۔ لکھنؤ کو اُن سے کوئی خصوصیت نہیں۔ دراصل یہ دہلی ہی کی شان تھی جو اپنی آخری جھلک بڑے کر و فر کے ساتھ لکھنؤ میں دکھا کے غائب ہو گئی۔

لیکن لباس میں لکھنؤ دہلی سے جدا ہو گیا۔ اب گھر میں کرتا یا قمیص اُتار کے بیٹھنا معیوب ہو گیا ہے مگر اُن دنوں یہاں گھر کا لباس پچ پوچھیے تو ایک غرقی تھی۔ یہاں کا دربار شیعہ تھا۔ اور ہر چیز یہاں تشیع ہی کے سانچے میں ڈھلتی تھی۔ فقہ امامیہ کی رو سے رانوں کے کھلے رہنے میں مضائقہ نہیں۔ بخلاف حنفیوں کے کہ اُن کے مذہب میں ناف سے لے کر گھٹنوں تک جس قدر حصہ جسم ہے ستر میں داخل ہے اُس کا چھپانا ضروری ہے۔ اور اسی بنا پر دہلی میں علی العموم تہمت کی وضع کی لنگی باندھی جاتی جس میں گھٹنوں کے نیچے تک جسم ڈھکا رہتا ہے۔ یہاں کے تمدن میں اُس کی ضرورت نہیں باقی رہی۔ اور یہاں کی لنگی فقط ایک پتلی سی غرقی یا جانگھیا رہ گئی جس میں ناف سے کنج ران تک تو جسم ڈھک جاتا ہے باقی سب جسم کھلا رہتا ہے۔ لوگوں میں مہذب اور مرد آدمی بن کے نکلنے کا خیال تو بڑھا ہوا تھا مگر گھر میں بجز ایک غرقی کے جسم پر ایک دھاگا بھی نہ رہتا۔ اور یہ بات اس قدر عام ہو گئی تھی کہ اسی برہنگی کی وضع سے اپنے گھر پر کسی سے ملنے میں بھی مضائقہ نہ سمجھا جاتا۔ مگر یہی حضرات جب باہر نکلتے تو شان ہی اور ہوتی۔ قالب پر چڑھی چوگوشیہ ٹوپی۔ اُجلا صاف اور براق انگرکھا جو معلوم ہوتا کہ ابھی ابھی دھوبی کے گھر سے آیا ہے۔ اور اسی وقت گوٹ اور آستینیں چُنی گئی ہیں۔ گلبدن یا تین بکھ کا عرض کا پائجامہ۔ کاندھے پر مثلث رومال۔ ہاتھ میں دستی رومال اور چھڑی۔

اور پاؤن مین لکھنؤ کا بنا ہوا اُسکے مخملی خُرد نو کا جوتا - باہر نکلنے مین ہر وضیع و شریف کی یہی وضع تھی -

بہت سے لوگون کو باہر نکلنے مین اس وضع و لباس کا اس قدر لحاظ تھا کہ کبھی اُن کے کپڑے میلے نہ نظر آتے - معلوم ہوتا کہ اسی وقت دھوبی کے یہان سے آئے ہین - حالانکہ مہینون اُنکے دُھلنے کی نوبت نہ آتی - اور ہوتا یہ کہ دو گھڑی دن رہے گھر سے نکلے - خرامان خرامان ہر چیز سے بچتے اور اپنے سائے تک سے بھڑکتے ہوے چوک کی سیر کی - دو گھڑی رات گئے واپس آگئے - اور آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ٹوپی قالب پر رکھ کے ایک کپڑے سے اُڑھا دی - انگرکھے - پائجامے - اوڑھنے کے رومال کو احتیاط سے تہ کرکے دستی رومال مین گٹھری کی طرح باندھ کے کھونٹی پر رکھ دیا - اور غرقی باندھ کے اور کوئی پُرانا جوتا یا زیرپائی پہن کر بیٹھ رہے - اسی داشت کی برکت تھی کہ قیمتی اور شالی کپڑے چار چار پانچ پانچ پشتون تک اس احتیاط سے رہتے کہ نہ میلے ہوتے - نہ پھٹتے - نہ کیڑا لگاتا - ہمیشہ نئے بنے رہتے - اور شادی کی تقریبون یا شان و شکوہ کی محفلون مین ایسا شاہانہ لباس پہن کر جاتے کہ لوگون کو جو اُن کی حالت و حیثیت سے واقف ہوتے تعجب ہوتا -

گو کہ اعلیٰ طبقے کے امرا خصوصًا شاہزادے - علما - اور اطبا لزوم کے ساتھ سواریون پر نکلتے مگر شرفا کے لیے پیدل پھرنا آج کل کے زمانے کی طرح معیوب نہ تھا - ہر طبقے اور درجے کے لوگ یکسان حالت سے پاپیادہ باہر کی سیر کرتے - اور پیدل چلنے والے بڑے سے بڑے رئیسون اور معزز لوگون کے برابر بیٹھنے اور مضائقہ نہ ہوتا -

(۵۴)

اب ہم مختصراً یہ بھی بتا دینا چاہتے ہین کہ لکھنؤ کی معاشرت نے اپنی ضرورت و قدردانی سے کن کن چیزون کو ترقی دی - اور کن کن فنون کو یہان نشو و نما ہوا - اس سلسلے مین بہت سی چیزون کا ذکر آئے گا - مگر ہم پہلے مٹی کے برتنون سے شروع کرتے ہین -

مٹی کے برتن دنیا کی پہلی ایجاد ہین - ہر ملک اور ہر سرزمین سے کھود کے قدیم الایام کے خزف پارسے برآمد کیے گئے ہین - جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مٹی کو بھٹی مین پکا کے خزف بنا لینا انسان کو اپنی ترقیون کے بہت ابتدائی دور مین معلوم ہو گیا تھا - اور غالباً دنیا کے عہد حجریت ہی مین معدنی فلزات کے برآمد ہونے سے پہلے انسان کو برتن بنا کے اُن کو پکانا آ گیا تھا - مصر مین عہد فراعنہ کے گلی ظروف اور بابل و نینوا مین غذا اور پانی کے ظروف کے ساتھ نہایت پختہ اینٹین برآمد ہوئی ہین - فراعنہ کے دَور مین امرائے مصر جن تابوتون مین لاشون کو ممی بنا کے رکھا کرتے وہ مٹی ہی کے ہوتے تھے - یہی نہین - اگلی دنیا خزف پارون اور ٹھیکرون سے بہت دنون تک کاغذ کا کام لیتی رہی ہے -

ہندوستان والون کو بھی قدیم الایام ہی مین یہ فن آ گیا تھا - اور عہد قدیم کے نکلے ہوئے ظروف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہان بھی اس فن نے دیگر مقامات سے کم ترقی نہین کی تھی - خصوصاً بُت پرستی نے ہندوؤن مین بھی مٹی کی مورتون کی بنیاد ڈالی جس مین روز بروز ترقی ہوتی رہی - اور یہان کمہارون کی ایک ذات پیدا ہو گئی - جس کا خاندانی اور آبائی پیشہ یہی ہے کہ مٹی کے ظروف اور کھلونے بنا کے پکاتے ہین -

دہلی مین اسلامی دَور نے عام کمہارون کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ کسگرون (کاسہ گرون) کا ایک نیا گروہ پیدا کر دیا جو مسلمان ہین اور ظروف کے ساتھ کھلونے بھی بناتے ہین - اور اگرچہ شرعِ اسلام مورتون کے بنانے کو مطلقاً ناجائز بتاتی ہے - مگر کسگرون کا چونکہ ذریعۂ معیشت یہی کام ہے اس لیے وہ ایک حد تک کھلونے بنانے اور بیچنے پر مجبور ہین - مسلمان کسگر عام معاشرت و شائستگی اور نیز اپنے فن مین کمہارون سے زیادہ ترقی یافتہ ہین -

دہلی سے مسلمان اُمرا ان کسگرون کو بھی اپنے ساتھ لکھنؤ مین لائے اور امرا کی شوقینی کی بدولت اُن کی صنعت کو یہان زیادہ اور نمایان ترقی ہونے لگی - چنانچہ کمہار اور کسگر دونون نے اپنے کام مین وہی ذہانت و طباعی اور جدت طرازیان دکھانا شروع کین جو ایک مصور تصویرون مین اور ایک شاعر اشعار مین دکھایا کرتا ہے -

حسنِ اتفاق سے لکھنؤ کی مٹی اس فن کے لیے مناسب ثابت ہوئی جس نے کاریگری
کو اظہارِ کمالات کا موقع دینا شروع کیا۔ اور برتن اور کھلونے دونوں ایسے
بننے لگے جیسے کہیں نہ بن سکے تھے۔ ظروف میں تو یہ ترقی ہوئی کہ ایسے سُبک،
باریک، اور صاف اور اس کے ساتھ خوش قطع برتن یہاں بنتے ہیں کہ کہیں نہیں
بن سکتے۔ امروہے کی مٹی بھی اس کام کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ وہاں
بھی اس فن کو بڑی ترقی ہو رہی ہے۔ اور وہاں کے کاریگروں کے ظروف گلدستوں
اور لکھنؤ کے ظروف کی وضع میں فرق ہے۔ اور اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ لکھنؤ کے کاریگروں
کا کام نفاست پسند لوگوں کی نظر میں بڑھا ہوا ہے۔

عام چیزوں میں لکھنؤ کے گھڑے۔ بدھنیاں سارے ہندوستان کے گھڑوں
اور بدھنیوں سے سُبک اور خوشنما ہوتے ہیں۔ گھڑوں کی گولائی نہایت ہی مکمل اور
اپنے حدود میں پوری ہوتی ہے۔ بدھنیاں تانبے کے لوٹوں کی قطع سے بہت زیادہ
قریب ہوتی ہیں۔ ظروف میں سفالی کے برتن یہاں سے اچھے شاید کہیں کم ملیں گے۔
مگر چونکہ مٹی کے برتنوں میں کھانے کا رواج بالکل اُٹھ گیا ہے۔ اس لیے کھانوں
کی توجہ اب اُنکی طرف سے ہٹ گئی اور وہ روز بروز مٹتی جاتی ہے۔ مگر جن ظروف میں
یہاں کے کسگروں نے اپنے کمالات کا اعلیٰ ترین ثبوت دیا وہ آبخورے۔ صراحیاں
جھجریاں۔ اور حُقّے ہیں۔ اور اُن کے بعد کھیر کی ہانڈیاں۔

آبخورے پانی پینے کے ظروف ہیں۔ اگرچہ شیشے اور تام چینی کے سُبک خوشنما
اور نفیس گلاس اور نیز مرادآباد وغیرہ کے گلاس اور کٹورے کثرت سے رواج
پا گئے ہیں۔ مگر ہندوستان میں گرمیوں کا ایک ایسا موسم آتا ہے جبکہ بجز مٹی کے
آبخوروں کے کسی ظرف میں پانی مزہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ پانی اُن
میں ٹھنڈا رہتا ہے اور خود اُنکی ٹھنڈک ہاتھ اور ہونٹوں کو خنکی کی ایسی لذت
دیتی ہے جو اور کسی چیز سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ علاوہ بریں مٹی کے کورے آبخورے
میں ایک ایسی روح کو تازہ کرنے والی خوشبو ہوتی ہے جس کے شوق نے یہاں
مٹی کا عطر ایجاد کرادیا۔ غرض اس ضرورت نے آبخوروں کو باقی رکھا جن میں
طرح طرح کی نفاستیں پیدا کی گئیں۔ ایسے نازک۔ ہلکے۔ اور سُبک آبخورے

جوہر قدامت آج سے پچاس برس پہلے عورتوں کی کیا حالت تھی اور اب کیا ہے نہایت مفید قصہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ...... عہ/

طوفان حیات ۔ مسلمانوں کو تباہ کرنے والی رسوم قبیحہ کی اصلاح ایک پُرسوز دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں قیمت صرف ..... عہ/

موودہ ۔ لڑکیوں کو ترکہ سے محروم کرنے کی مخالفت ایک پرسوز وعبرت انگیز قصہ کے پیرایہ میں ۸/

تائید غیبی اندلس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کے مناظرہ واسباب پچھلے مسلمانوں کے قابل رشک کارنامے قیمت ۸/

لڑکیوں کی انشا بچوں کو خط وکتابت کی تعلیم دینے والی اور کاروبار آداب سکھانے والی کتاب پیاری زبان میں قیمت بارہ آنے ۱۲/

ماہِ عجم فاروق اعظم کے عہد میں مسلمانوں کے جنگی کارنامے فرزندان ایران کا سرگذشت مذہبی جوش حسن وعشق کے جذبات مجلد قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے عہ/

منازل سائرہ مولانا راشد کی ابتدائی تصنیف سائرہ کی نہایت دردناک ودلچسپ سرگذشت لڑکیوں کے لئے مفید کتاب قیمت صرف ایک روپیہ ... عہ

سنجوگ محض دولت کی طمع سے بے سوچے سمجھے لڑکیوں کا نکاح کر دینے کے خوفناک نتائج پُردرد وپُرسوز داستان قیمت صرف ۱۰/

گوہر مقصود دو چھوٹے چھوٹے دلچسپ قصوں کا مجموعہ قیمت صرف ۶/

سوکن کا جلاپا نکاح ثانی کے مضر نتائج ایک بے گناہ اور مصیبت زدہ لڑکی کی دردناک سرگذشت قیمت ۶/

درشہوار ۔ مازندران اور ایران وسیستان کی ہولناک جنگوں کا نقشہ عشق ومحبت کی چاشنی لئے ہوئے قیمت صرف ۱۰/

جوہر عصمت خاوندوں کو وفاداری اور بیویوں کو سلیقہ سکھانے والی پُردرد دلچسپ کتاب قیمت صرف ... ۶/

فسانۂ سعید معصوم اولاد پر بے رحم باپ کا ظلم قیمت ۱۰/

روئیداد قفس قیمت صرف چھ آنے ۶/

شب زندگی حصہ دوم قیمت صرف عہ

تبرکات آزاد

عربستان کے امراء القیس انگلستان کے شکسپیئر اور ملٹن۔ یونان کے ہومر۔ فارس کے فردوسی اور ہندوستان کے علامہ ابوالفضل کے جواب شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی کی بیش بہا تصانیف طبع جدید

نگارستان فارس یعنی فارسی زبان کے مشاہیر شعراء کا تذکرہ فارسی زبان کی عہد بعہد ترقیوں کو ان کے کلام کے ساتھ ساتھ مؤرخانہ طرز لئے ہوئے آب حیات کے لفظوں میں ادا کیا ہے۔ خدائے سخن استاد رودکی سے لیکر خان آرزو تک کے حالات سے نگارستان کو سجایا ہے۔ نہایت خوشخط کاغذ اعلےٰ درجہ کا ولایتی قیمت مجلد صرف ۳ روپے

دربار اکبری شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر اور اسکے نورتن کا تاریخی افسانہ دلچسپ حالات۔ رزم بزم شادی وغم۔ ہندو ومسلمانوں کا ملاپ ۲۲×۲۹ کی بڑی تقطیع (۸۰۰) صفحوں کی ضخامت کاغذ نہایت قیمتی لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد عہ

آب حیات مشاہیر شعرائے اردو کی سوانح عمری اور اردو زبان کی عہد بعہد ترقیوں کا حال ہے مشرقی شاعری کی آخری جھلک اور آخری بہار کا دلفریب اور دلسوز افسانہ ہے حجم ۵۲۰ صفحات لکھائی چھپائی کاغذ بہت عمدہ قیمت صرف ۳ روپے

سیر ایران مشرقی زبانوں کے محقق نے ہندوستان اور پنجاب سے نکل کر افغانستان اور ایران تک تحقیق کا دامن پھیلا دیا تھا وہاں سے واپس آنے کے بعد اپنے سفر کے حالات مولانا نے خود بیان فرمائے ہیں اس میں ایرانی سے لیکر پربت تک روشنی ڈالی ہے قیمت مجلد دو روپے ... عہ

سخندان فارس فارسی زبان کی ایک مکمل تاریخ جس میں مختلف زبانوں کے مقابلہ سے قوموں کے باہمی رشتوں کے سلسلے بھی شروع نکالے گئے ہیں۔ ژند۔ پہلوی۔ دری سنسکرت کے الفاظ کا مقابلہ کرکے تاریخی نتائج نکالے ہیں نگارستان فارس کے ساتھ اسکا ہونا ضروری ہے حجم ۳۲۰ صفحات قیمت صرف ... ۱۲/

مولینا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر کے مشہور زمانہ و مقبول عام تصانیف
ملنے کا پتہ - ایس عبدالرشید اینڈ برادرس تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

فہرست مطبوعات خاص متعلقہ دوکان شیخ عبدالرشید

اینڈ برادرز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

سیرۃ احمدی یعنی حضور سرور عالم رحمۃ للعالمین کی سوانح عمری۔ اس کتاب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری کے علاوہ ازواج و اولاد کا تذکرہ بھی ہے حضور کے طبعی عادات اور حالات۔ حضور کی تعلیم اور اس کی فلاسفی۔ نبوۃ اور معجزات اور ان کی فلاسفی۔ تکثیر ازدواج۔ طلاق غلامی اسلام بذریعہ سیف۔ جہاد وغیرہ ان عنوانات پر تفصیلاً علیحدہ علیحدہ باب قائم کر کے بحث کی ہے۔ جو اس کتاب کی خصوصیت ہے نہایت دیدہ زیب لکھائی اور طباعت اعلیٰ کاغذ تین طرح کا لگا کر قیمت درجہ اول تین روپے (لعہ) درجہ دوم (عہ) درجہ سوم (عہ) رکھی گئی ہے۔ عاشقان حضور کے قابل مطالعہ ہے جلدی طلب فرمائیے تاکہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

مختصر تاریخ اسلامی حصہ چہار آجتک بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں مگر افسوس ان تاریخوں سے ہمارے بچے مستفید اس لئے نہ ہو سکے کہ ان کی عبارتیں دقیق اور الفاظ مشکل ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسی آسان عام فہم تاریخ لکھی جائے جس کو بچے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ لہٰذا ہم نے یہ سلسلہ مختصر تاریخ اسلامی کا شائع کیا ہے جس سے مسلمان لڑکوں اور خاص کر لڑکیوں کو ایک مختصر ذکر اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ کا معلوم ہو جائے اگر ان کو شوق ہوا تو ان کے لئے یہی کتابیں تاریخ اسلامی کا بنیادی پتھر بن سکینگی۔ مولانا سید سلیمان صاحب نے اس کتاب کے مفید ہونے کی نسبت معارف میں بہت زور دیا ہے قیمت حصہ اول دو روپیہ چار آنہ ۲؍۴

حصہ دوم ۔ حصہ سوم ۔ حصہ چہارم

سیرۃ النعمان مصنفہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم جیسی یہ کتاب علامہ مرحوم نے اعلیٰ درجہ کی تصنیف فرمائی ہے۔ اور کروڑوں حنفی مذہب مسلمانوں کو امام اعظم اور ان کے نامور اور ممتاز شاگردوں کے حالات اور مسائل سے آگاہ کیا۔ ویسے ہی یہ کتاب مختلف مطابع چھاپ کر ایسی ردی کر دی تھی کہ دیکھ کر دماغ پریشان ہوتا تھا۔ ہم نے اس کی نہایت خوشخطی سے صحت کی اور اس پر حاشیے بھی تحریر کئے اور دو قسم کے کاغذ پر چھپوائی قسم اول دو روپے (عہ) قسم دوم (عہ) اب آپ اس کتاب کو منگوائیں اور ملاحظہ فرمائیں یہیں ہی محنت اور خرچ کی داد بھی اسی طرح ہی مل سکتی ہے

مستقبل اسلام پروفیسر وامبری۔ جو مدت عرصہ تک اسلامی دنیا میں رہا۔ اور سیاسی و مذہبی معلومات سے مستفید ہو کر ایک معرکۃ الآرا تصنیف مغربی تمدن اور مشرقی ممالک شائع کی۔ اس کا مسٹر ظفر عمر صاحب بی۔ اے (مالک) مؤلف نیلی چھتری و بہرام کی گرفتاری نے نہایت مقبول ترجمہ فرمایا اور حاشیے بھی لکھے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسلام کی آئندہ حالت مغربی نقطہ نظر سے دیکھنا ہو تو اس کو ملاحظہ فرمائیے آج کل اس کا مطالعہ نہایت فائدہ بخش ہے۔
قیمت صرف ایک روپیہ پانچ آنے ...... (۵؍۱)

ذکر فتح اندلس کتاب نایاب تھی حالات قابل مطالعہ تھے۔ مسٹر محمد جمیل الرحمٰن صاحب پروفیسر حیدرآباد دکن نے ترجمہ کر دیا اور اصل متن عربی کو بھی منسلک کر دیا قابل دید مختصر تاریخ قیمت بارہ آنے ...... ۱۲؍

خشینیہ عربی صرف و نحو میں۔ اردو کتاب اہل کی تشریح اور توضیح جو مصنف نے اس کتاب میں فرمائی۔ بڑی بڑی کتابوں میں بھی یکجا نہ پائی جائے گی۔ نادر الوجود اور قابل قدر کتاب ہے قیمت صرف چھ آنے ...... ۶؍

مضامین شرر علامہ شرر لکھنوی نے ناول اتنے لکھے کہ اردو زبان کے خزانے کو بھر دیا (اللھم متع المسلمین بفیوضہم) اور دنیا میں کوس لمن الملک الیوم درست طور پر بجا دیا۔ لیکن افسوس جو قدر کرنے والی چیز تھی۔ جس سے فائدہ اٹھا کر مشہور ادیب اور نامور مصنف بن جائیں اس کی طرف اردو دنیا نے توجہ نہ کی۔ علامہ کی اصل جوہر ریز تصنیف مضامین تھے جو دلگداز کے ذریعہ وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے شائع ہوتے رہینگے یہ ایسی چیز تھی کہ قابل نگاہیں متمنی تھیں کہ اگر

اُن کو یہ مرتب اور مضمون ہو کر مل جائیں تو ہمارا کمو
پر رکھیں۔ ایسی قابل ہستیوں کی خواہش کو پورا
کرنے کے لئے علامہ موصوف کو تکلیف دی تو
انھوں نے مہربانی فرمائی اور میری التماس کو شرف
قبولیت بخش کر علیحدہ علیحدہ عنوانوں سے مضامین
کو مرتب فرما دیا۔ جنکے حصص کر کے ہمنے طبع کرانا
شروع کر دیا ہے جن میں سے عاشقانہ و شاعرانہ
مضامین کے تین حصہ چھپ کر تیار ہو گئے ہیں۔
اور تاریخی وجغرافی مضامین کے دو حصہ ان میں سے
ہی ہندوستان میں مشرقی تمدن بصورت حصہ
سوئم (قیمت عـہ) عاشقانہ و شاعرانہ مضامین حصہ
اول قیمت دو روپے آٹھ آنے (عـہ) ایضاً حصہ
دوم قیمت (عـہ) حصہ سوم آغاز و اختتام سال
قیمت (عـہ) تاریخی وجغرافی مضامین حصہ اول۔
قیمت (عـہ) حصہ دوم دو روپے آٹھ آنے (عـہ)

جلد دلگداز ۱۸۸۸ء

یہ باوجود دو تین بار شائع ہونے کے علامہ شرر مدظلہ کے کتب خانہ میں
بھی مکمل نہ تھی ہمنے اسکو طبع کرا دیا ہے تھوڑی
جلدیں طبع کرائی ہیں اسلئے جلد طلب فرمالیں
قیمت ایکروپیہ چار آنے . . . (عـہ)

جلد دلگداز ۱۸۸۹ء

اب پھر چھپ کر تیار ہے
اس کو بھی ہمنے اس لئے طبع کرایا ہے کہ یہ
سخت نایاب ہو گئی تھی قیمت صرف عـہ

بیاض آزاد

کیا ہے؟ مشاہیر شعرائے ہند کے کلام کا انتخاب لاجواب ہے
اور وہ بھی مسلم اُستاد آزاد مرحوم کا کیا ہوا نہایت
خوشخط شعر ترچھے لکھے ہوئے۔ جلی قلم معلوم ہوتا
ہے کہ شکرت سے لکھی ہوئی قلمی کتاب سامنے
رکھی ہے۔ مولانا کا فوٹو بھی شامل ہے علامہ شرر
لکھنوی نے جو اس کتاب کی نسبت تحریر فرمایا
ہے وہ ابتداء میں منسلک کر دیا ہے باوجود ان
تمام خوبیوں کے قیمت صرف . . . عـہ

سمرنا کا چاند

مصنفہ مصور غم مولانا راشد الخیری دہلوی اس
کتاب کی مقبولیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے
کہ پہلی بار چھپتے ہی اتنی جلد ختم ہوئی کہ چھ ماہ کے
اندر اندر دوسری دفعہ طبع کرانے کی دقت اُٹھانی
پڑی اب پھر تھوڑی سی جلدیں ہیں جلد طلب
فرمالیجئے۔ یہ کتاب تربیت نسواں کے لئے ایک
سبق آموز اضافہ ہے قیمت ایکروپیہ چار آنہ عـہ

آفتاب دمشق

عہد صدیقی کا اسلام۔ مسلمانوں کے عظیم الشان
جنگی کارنامے مسلمانوں نے دمشق اور بصرہ وغیرہ
شہروں پر قبضہ کرنے اور اسلام کی اشاعت کے
لئے جو عظیم الشان قربانیاں کی ہیں ان کا ذکر اور
ایسے دردناک پیرائے میں جو مصور غم علامہ راشد
الخیری کا مخصوص اعجاز ہے ایک مسلمان جاہ
اور مسلمان خاتون کی موت ان کے مصائب
دیکھئے اور سبق حاصل کیجئے۔ ایک حسینہ کا اسلام
پر شیدا ہو کر مسلمان ہونا۔ قید کیا جانا۔ اور
فصیل کے کنگوروں پر سے گرائے جانے پر بھی
اسلام سے سرتابی نہ کرنا۔ اس کتاب میں مرقوم
ہے۔ جوش اسلامی حمیت اسلامی۔ عدل اسلامی
کا نمونہ آپکو اس کتاب کے مطالعہ سے ملیگا۔
دوبارہ چھپی ہے اور قریب الاختتام۔ چھپائی۔
لکھائی سرورق نہایت دیدہ زیب قیمت عـہ

رہنمائے قانون المعروف وکیل کا منشی

وکلا کے لئے نت نئی کتب طبع ہوتی رہتی ہیں لیکن
منشی صاحبان جن کو کم دماغ سوزی نہیں کرنی
پڑتی اُن کے لئے ایک کتاب بھی نہ ہو کتنی افسوس
کی بات ہے۔ یہ کتاب منشی صاحبان کے لئے خصوصاً
اور عرائض نویسوں۔ ثالثوں۔ ساہوکاروں وغیرہ
وغیرہ کے لئے عموماً مفید ہے اس کتاب میں
قانون مروجہ ہند کو نہایت آسان عام فہم زبان
میں بیان کیا ہے تاکہ ناظرین منگوائیں اور قانونی
الجھاؤں سے مخلصی حاصل کریں قیمت ۱۲ روپے

تصنیفات مسٹر ظفر عمر صاحب بی۔ اے (علیگ)

نیلی چھتری مسٹر غوسانی کا نہایت دلچسپ اور پسندیدہ ناول قیمت (عـہ)

بہرام کی گرفتاری نیلی چھتری کے ہیرو بہرام کے حیرت انگیز کارنامے
حصہ دوم قیمت ایکروپیہ چار آنے . . (عـہ)

چوروں کا کلب۔ دل بہلانے اور چوری کے
خطرات سے بچنے اور لطف اٹھانیکا نادر خزانہ عـہ

لیس یوپین اہلکاران پولیس کے لئے ہر زبان پر جیسا ہے قیمت صرف آٹھ آنے ۸ر

مستقبل اسلام پروفیسر واحیری کی کتاب کا ترجمہ قیمت صرف (عـہ)

ملنے کا پتہ۔ ایس عبد الرشید اینڈ برادرس تاجران کتب لوہاری دروازہ ۔ لاہور